مسلمانوں کا عروج و زوال

یعنی

مسلمانوں کے حیرت انگیز عروج اور عبرت خیز زوال کی داستان تاریخی حقائق کی روشنی میں

تالیف

مولانا سعید احمد ایم، اے

ندوة المصنفین، اردو بازار دهلی

مسلمانوں
کا
عروج اور زوال

جس میں اولاً خلافتِ راشدہ پھر مسلمانوں کی مختلف حکومتوں، ان کی
سیاسی حکمت عملیوں اور مختلف دوروں میں مسلمانوں کی عام اجتماعی
اور معاشرتی احوال و واقعات پر تبصرہ کرکے ان اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے
جو مسلمانوں کے غیر معمولی عروج اور اس کے بعد ان کے حیرت انگیز انحطاط
و زوال میں موثر ہوئے ہیں

تالیف

مولانا سعید احمد ایم۔ اے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی کی نگرانی میں
سنہ ۱۳۶۱ھ جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی سنہ ۱۹۴۲ء

فہرست مضامین

دیباچہ

پیشِ نظر تالیف کی تقریب یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۱ء میں "مسلم یونیورسٹی علی گڈھ" کی "انجمن تاریخ وتمدن اسلامی" کے زیرِ اہتمام فاضل مؤلف نے "اسبابِ عروج وزوالِ امت" پر زبانی تقریر کی تھی، بعد میں ضروری اضافے کرکے اسے "برہان" میں شائع کیا گیا۔

مضمون میں اُجڑے اور لٹے ہوئے مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستانِ حسرت انجام کو ایک سادہ اور موثر اسلوب میں چھیڑا گیا تھا اس لئے پڑھنے والوں پر اس کا اثر پڑا اور انھوں نے تاریخی حقایق کے اِس بے لاگ اندازِ بیان کو بہت پسند کیا اور بعض مخصوص اربابِ علم نے اسے بصورتِ کتاب شائع کرنے کی ضرورت جتائی۔

چنانچہ چند مہینوں کے وقفے سے بہت سے اضافوں اور تعبیر وبیان کے غیر معمولی تغیر وتبدل کے بعد اس کو کتاب کی صورت میں شائع کردیا گیا۔ کتاب سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ اس قدر اضافوں اور حک وفک کے باوجود اس میں دو نہایت ہی اہم اور ضروری بابوں کی کمی رہ گئی ہے۔

موجودہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کردیا گیا ہے اور اندلس اور ہندوستان کے متعلق دو مفصل باب بڑھادئے گئے ہیں' ان ابواب کے اضافے سے کتاب کا حجم کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ پہلے ۱۹ سطری مسطر کے صرف ۱۶۸ صفحات تھے اب ۲۱ سطری مسطر کے ۳۴۸ صفحات

جہاں تک کتاب کی معنوی حیثیت کا تعلق ہے اب بغیر کسی جھجک کے یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ اس موضوع پر ایک محققانہ کتاب وجود میں آگئی تیسرے ایڈیشن میں غالباً شروع کے بابوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت پیش آئے گی اور اس طرح تمام باب متوازن ہوجائیں گے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

۱۰ شوال المکرم ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مسلمانوں کا عروج اور زوال

تاریخِ عالم کا یہ واقعہ کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں نے نہایت محیرالعقول طریقہ پر ترقی کی اور اپنے کارناموں کا نقش صفحۂ تاریخ پر اس طرح ثبت کیا کہ دنیا کی دوسری قومیں ان کی عظمت و برتری کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دینے پر مجبور ہو گئیں، اب وہی مسلمان ہیں جن پر فلاکت و ادبار مسلط ہے، ان کا شیرازۂ ملی پراگندہ ہے۔ اب ان کی محفلوں میں علم و فن کے مذاکرے بہت کم ہوتے ہیں، دماغ قوتِ ابداع و اختراع سے محروم، اور ہاتھ سیاسی طاقت و قوت کی عنان سے ناآشنائے محض ہیں، مردم شماری کے لحاظ سے اتنے مسلمان پہلے کبھی نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں مگر ساتھ ہی علم و عمل، ایمان و الیقان اور روحانیت و اخلاق کے لحاظ سے جتنے پست اور زبوں حال اب ہیں اتنے بھی کبھی نہیں تھے۔

تاریخِ اسلام کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند سالوں بعد ہی مسلمانوں نے جزیرۃ العرب سے نکل کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنا شروع کیا تو سخت ترین عداوتوں اور حوصلہ فرسا مقاومتوں کے باوجود اس انداز سے آگے بڑھتے رہے کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پہلے انھوں نے مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لئے اور ان ملکوں میں

صرف سیاسی طاقت وقوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ اسلام کی حقانی تعلیمات اور اسلامی تمدن و تہذیب کی ناقابلِ ردو دلکشی نے اپنا ایسا رنگ جمایا کہ چند ملکوں کو چھوڑ کر تمام مفتوحہ ممالک خالص اسلامی ملک بن گئے۔ پھر علوم و فنون میں، ایجادات و اختراعات میں، تہذیبِ نفس اور نظامِ اخلاق کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے اپنی ذہنی و دماغی عظمت و برتری اور مافوق العادۃ عملی جدوجہد کا ایسا عمدہ ثبوت دیا کہ بڑے سے بڑا معاند مورخ بھی ان کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ لیکن اب حالت بالکل دگرگوں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان پر ادبار و انحطاط کا تسلط ہے اور علم و عمل کے ہر میدان میں وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ کہیں جہالت و نادانی کا دور دورہ ہے اور کسی جگہ دوسری اقوامِ عالم کی تقلید کا سودا ہے، اسلامی انفرادیت بہرحال اسقدر مضمحل ہوچکی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو بحیثیتِ مجموعی پہلے زمانہ کے مسلمانوں کا جانشین یا ان کے منصبِ عظمت کا وارث کہنا اپنی ہنسی خود آپ اڑانے کے مترادف ہے۔

اس انقلابِ عظیم کو دیکھکر فلسفۂ تاریخ کے طالبِ علم کو قدرتی طور پر ان اسباب کا کھوج لگانے کی جستجو ہوتی ہے جن کی بناء پر مسلمانوں کی ماہیت یکسر منقلب ہوکر رہ گئی ہے، لیکن ان اسباب کو بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے اجمالاً ان بنیادی عوامل و دواعی کو معلوم کرلیا جائے جو مسلمانوں کی عظیم الشان ترقی کا باعث بنے اور جنھوں نے یکجا ہوکر ان کو دنیا کی سب سے بڑی اور صالح ترین قوم بنایا۔ ان عوامل و دواعی کو معلوم کرنے کے بعد آپ تاریخی اعتبار سے دیکھیں گے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف اندرونی اور بیرونی اثرات کے ماتحت ان عوامل میں کس طرح اضمحلال پیدا ہوتا رہا۔ اور آخرکار کئی صدیاں گذرنے کے بعد جب یہ تدریجی اضمحلال اپنے آخری نقطہ تک پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ بدوہ ہوا جو آج ہم سب کے سامنے ہے اور جس کا دردانگیز نظارہ ہر حساس مسلمان کی آنکھ کو ایک پیہم دعوتِ خونابہ فشانی اور ہر دردمند دل کو مسلسل اذنِ فغاں سنجی و ماتم سرائی دے رہا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس مختصر صحبت میں ایک ہزار برس سے زیادہ کی روئدادِ غم تفصیل کے ساتھ بیان

نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے میں اصولی طور پر صرف چند اہم امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

حکمت

ارباب علم جانتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک سوچنے اور غور کرنے کی قوت، جس کو قوتِ نظری کہتے ہیں۔ یہ قوت اشیاءِ عالم کی حقیقتیں دریافت کرتی اور ان کی کُنہ و ماہیت کا کھوج لگاتی ہے۔ پھر مختلف اعمال و افعال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا عمل اچھا ہے اور اس لئے لائقِ اخذ ہے اور کونسا عمل بُرا ہے اور اس بنا پر قابلِ ترک ہے۔

قوتِ نظری کے اس فیصلہ کے بعد دوسری قوت یعنی قوتِ عملیہ کو تحریک ہوتی ہے اور وہ قوتِ نظری کے فیصلہ کے مطابق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک کرتی ہے، ان دونوں قوتوں کا تعلق انسان کے نفس سے ہے۔ ایک مبدأ ادراک ہے اور دوسری مبدأ تحریک پھر ان دونوں قوتوں کے ماتحت مختلف قوتیں ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ اثر و عمل میں کام کرتی ہیں تمام فلسفۂ اخلاق کی بنیاد انھیں دونوں قوتوں کے محرکات و مہیجات اور ان کے مقتضیات و مظاہر سے بحث کرنے پر قائم ہے۔ انھیں دونوں قوتوں کی بے اعتدالی سے جب یہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ رذائل اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جب ان میں اعتدال پایا جاتا ہے تو ان سے فضائلِ اخلاق کا ظہور ہوتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کہتے ہیں وہ انھیں دونوں قوتوں کے استکمال کا نام ہے اور یہی حکمت ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی اساس و بنیاد ہے اس بنا پر زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی بہر حال اس کی کامیابی اور ترقی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ شخصی و انفرادی یا قومی و اجتماعی قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں تندرست ہوں، افراط و تفریط سے الگ ہوں اور اعتدال پر قائم رہ کر کسی چیز کو حسن یا قبیح سمجھنے یا کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کے بارہ میں وہی رویہ اختیار کریں جو صحیح معنیٰ میں ایک تندرست اور معتدل قوت کو اختیار کرنا چاہئے جس طرح ہر انسان میں ایک قوتِ نظری اور ایک قوتِ عملی ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس اعتبار سے پوری قوم کی ایک قوتِ نظری ہوتی ہے جس کے

آئینہ میں وہ اشیاءِ عالم کے حسن و قبح کو دیکھتی اور جانچتی ہے اور پھر اسی طرح ایک ہی اس پوری قوم کی قوتِ عملی ہوتی ہے جس کے باعث قوم کے تمام افراد متحد و متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں اس وقت ان افراد کے عقائد و اعمال میں ایک ہم آہنگی، یکسانیت اور استواری پائی جاتی ہے، ان سب کا مرکزِ نگاہ ایک ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ کے ماتحت ان کی تمام حرکات ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس قوم کے مزاج میں فتور نہیں آیا ہے اور اس کا دماغ اور اس کے اعضاء وجوارح تندرست ہیں تو اس قوم کا ہر اقدام مستحسن اور اس کا ہر عمل نیک ہوگا اور یہ قوم دنیا کے تمام انسانوں کے لئے رحمت و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ وہ جس کسی سمت کا رخ کرے گی باطل اور شر و فساد کی تمام ظلمتیں خود بخود چھٹتی چلی جائیں گی، اور حق و صداقت کے آفتاب کی شعاعیں لمحہ بلمحہ وسعت پذیر ہوتی رہیں گی۔

اس مختصر ترین تمہید کے بعد اب اسلام کی تعلیمات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا، تمام اسلامی تعلیمات اصولی اور اساسی طور پر صرف دو چیزوں سے متعلق ہیں ایک انسانی عقیدہ اور دوسری انسانی عمل و کردار، عقیدہ کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اور عمل و کردار کا تعلق قوتِ عملیہ سے۔ بالفاظِ صحیح تر یوں سمجھئے کہ اسلام نے ان دونوں قوتوں کے حدودِ عمل اور ان کے فرائض و واجبات کی تعیین کر کے انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا دستور محکم دیدیا ہے جس کی روشنی میں بالکل صاف طریقہ پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوتِ نظری کو کس چیز کے متعلق حسن ہونے اور کس شے کی نسبت قبیح ہونے کا حکم لگانا چاہئے اور اسی نسبت سے قوتِ عملی کو مرغوبات و مکروہات کی دنیا میں کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے، اسلام کا دستورِ اساسی یعنی قرآن مجید اول سے آخر تک انھیں امور کی تشریح و توضیح اور انھیں حدود و قیود کے بیان و تفسیر پر مشتمل ہے اور اس بناء پر یہ کہنا قطعاً بے مبالغہ ہے کہ اسلام کا منشاء انسان کی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل و مکمل کر کے اُسے حکمتِ بالغہ کا درس دینا اور اس طرح اس کو حقیقی طور پر اشرف المخلوقات بنانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنین کے حق میں اپنا ایک

بہت بڑا احسان جتاتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

بیشک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے انھیں کے درمیان میں سے ایک رسول بھیجا، وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ یہ پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہی وہ حکمت ہے جس کو قرآن مجید کی آیت " وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا " میں خیر کثیر فرمایا گیا ہے۔ حکمت کو خیر کثیر فرمانے کی وجہ سے ہی علماء اخلاق نے کہا ہے کہ حکمت صرف علم کا نام نہیں بلکہ عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے، کیونکہ جو علم بغیر عمل کے ہو اس کا خیر کثیر ہونا تو کجا وہ تو سراسر وبال اور مصیبت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے " جو علم بغیر عمل کے ہو وہ وبال ہے اور جو عمل بغیر علم کے ہو وہ ضلال ہے "۔

غرض یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا دستور العمل اور نظامنامہ اخلاق و عقائد ہے کہ اگر قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں کی حرکت اس دستور کی روشنی میں ہوگی تو ان قوتوں کے مالک میں حکمت پیدا ہو جائے گی۔ جس طرح کوئی شخصِ واحد اپنے تمام عقائد و اعمال کی بنیاد اس پر رکھیگا تو اس کی زندگی بہمہ وجوہ کامیاب ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح جو قوم اس قرآن کو عقیدہ اور عمل دونوں میں اپنا اسوہ بنائے گی وہ بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ صالح اور کامیاب ترین قوم ہوگی اور اسے حق ہوگا کہ سب سے بلند اور ارفع ہو کر رہے، آپ یہ نہ خیال کریں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ دعویٰ محض کسی خوش اعتقادی پر مبنی ہے۔ اب میں اس کے دلائل بیان کرتا ہوں،

حکمت کے تمام اقسام کو بیان کرنا اور پھر اسلامی عقائد و اعمال کی ان پر تطبیق کرنا ایک طویل فرصت کا طالب ہے، اس لئے میں یہاں مختصراً اسلامی عقائد و اعمال میں سے بعض بنیادی امور کا ذکر کرتا ہوں جن کو مسلمانوں کے عروج و ترقی میں نمایاں دخل ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا

کہ اسلام نے انسانی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل بنانے کے سلسلہ میں کس خاص نقطۂ نظر کو مرعی رکھا ہے اور مسلمانوں کے قومی کیرکٹر پر ان کا کیا اثر ہوا ہے۔

توحید | توحید کا تعلق قوتِ نظری سے ہے، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلامی عقائد کی اساس و بنیاد اسی عقیدہ پر قائم ہے اس عقیدہ کا مفاد یہ ہے کہ انسان ذات و صفات میں کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے وہ دل سے اس بات کا یقین رکھے کہ دنیا کے تمام نفع وضرر کا مالک صرف خدا ہے، وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کے مخلوق، ہم سب صرف اسی کی اطاعت اور عبادت کریں گے کسی اور چیز کے سامنے اپنی پیشانی نہیں جھکائیں گے۔ ہمارا رزق، موت، زندگی، عزت و ذلت، کامرانی و ناکامی دولت و غربت، ان سب کا ملنا ملانا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خواہ اپنے زمانہ کا کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو، ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ذرا بھی مالک و مختار نہیں ہے۔ اس بنا پر ہمیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیے۔ اسی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے اس کو طلب کرنا چاہیے۔ اس یقین و اذعان کے ساتھ دل سے اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیے کہ انسان انسان سب برابر ہیں کوئی کسی کا حاکم اور کوئی کسی کا محکوم نہیں۔ کسی شخص کو کسی دوسرے پر آمرانہ چیرہ دستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قانون کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی قانون بنا کر اس کو بندگانِ خدا پر لازم کر دے البتہ نظامِ زندگی کو چلانے کے لئے صلاحیت و استعداد کے مطابق تقسیمِ عمل کی ضرورت ہوگی، اس بنا پر کوئی امیر ہوگا اور کوئی وزیر، کوئی قاضی اور مفتی ہوگا، اور کوئی صناع و تاجر لیکن ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی ذاتی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہوگی، مرتبۂ انسانیت میں یہ سب برابر ہیں۔ ان کی مثال ایک بڑے انجن کے پرزوں کی سی ہے کہ یہ تمام پرزے اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں تو انجن چلتا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی ٹرین کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔

پس تمام بھلائیاں اور حقیقی فلاح و بہبود انھیں خوش نصیب انسانوں کے لئے ہے جو اپنی ہستی کو خدا کے وجودِ ابدی و سرمدی میں فنا کر کے اپنی کوئی ذاتی خواہش اور جذبہ رکھتے ہی

نہیں۔ ان کی محبت، عداوت، فقیری و درویشی، امارت و ثروت اور اہلِ عالم سے مختلف باہمی تعلقات اور ان کی رعایت یہ سب صرف خدا کے لئے اور اسی کے حکم کے ماتحت اور اسی کا فرضِ بندگی بجالانے کے لئے ہوتا ہے اور یہ انجن کے پرزوں کی طرح اپنے ذاتی نفع وضرر سے بے خبر ہو کر محض خدا کی رضاجوئی کے لئے کام کرتے رہتے ہیں، ان کے علاوہ جو لوگ اللہ کے قانون سے سرکش و باغی ہیں اور دنیا میں شر و فساد پھیلاتے ہیں ان کی مثال اس پتھر کی سی ہے جو گاڑی کو روکنے کے لئے ریلوے لائن پر ڈال دیا گیا ہو، ظاہر ہے اگر پتھر چھوٹا سا ہی ہے تو اس کو انجن کی تیز رفتاری خود بخود راستہ سے دور کر دیگی اور لائن صاف ہو جائے گی اور اگر پتھر کی کوئی چٹان حائل ہو گئی ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے زیادہ کدو کاوش کرنی پڑے گی۔ بہر حال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کی شاہراہ پر حیاتِ اجتماعی کا انجن چلانے کے لئے جس طرح ضرورت ہے کہ انجن کے تمام پرزے ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ لائن کو صاف رکھا جائے اور اس پر اگر کوئی پتھر وغیرہ گر پڑے تو اسے دور کر دیا جائے۔

عقیدۂ توحید کی اس مختصر تشریح کے بعد آپ خود معلوم کر سکتے ہیں کہ جو قوم اس عقیدہ کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں رکھے اور صرف زبان سے اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اس عقیدہ کی ایسی اذعانی اور یقینی کیفیت اس کے دلوں میں مرتسم ہو کہ لاکھ منطقی دلائل کے باوصف اس میں ذرہ برابر تذبذب پیدا نہ ہو سکے، کیا ایسی قوم کبھی کسی جماعت کی محکوم ہو کر زندگی بسر کر سکتی ہے؟ اسی عقیدہ کا اثر تھا کہ دورِ اول کے مسلمان اپنے وجود کی انفرادیت کو یک قلم بھلا کر اپنے آپ کو خدا کے وجود کا ایک پرتو سمجھتے تھے اور گویا ان کے ہر بُنِ مو سے یہ صدا آتی تھی ؎

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس یقین کے باعث ان کی نگاہ بلند تھی حوصلے عالی اور ہمتیں ناقابلِ شکست و زوال ان کا ایمان تھا کہ ہمارا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب خدا کے لئے ہے، ہمارا مقصدِ زندگی خدا کے احکام کی بجا آوری اور اس کے اوامر و نواہی کی دنیا میں تبلیغ و اشاعت ہے اور بس۔

اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مصرف ہی نہیں ہے۔ اس قوی تصور اور ایمانِ محکم کی وجہ سے ایک طرف وہ دنیا کی بڑی سے بڑی شہنشاہیت اور دنیوی جاہ وحشم سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتے تھے اور دوسری جانب چونکہ ان کے عزائم مستحکم اور ایک مرکزِ لاہوتی سے وابستہ ہو جانے کی بنا پر ان کے ارادے پہاڑ کی طرح مضبوط اور اٹل تھے اس لئے ان کے واسطے کوئی مانع مانع نہیں تھا۔ فلسفۂ خودی کا یہی وہ راز ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھا اور جس نے مختلف ملکاتِ اخلاق کی شکل میں ظاہر ہو کر ان سے حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر کرائے۔ جو لوگ قوتِ ارادی کی عجوبہ زائیوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے کہ ایک قوم عالم کے مبدأ فیاض سے اپنا رشتہ استوار کر کے دنیا میں کیسے کیسے عجیب عریب کارنامے کر سکتی ہے۔

اتقار اس تقریر سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام نے عقیدۂ توحید کی تلقین و تعلیم دیکر انسان کی قوتِ نظری کو کس درجہ معتدل، صالح اور درست بنا دیا اور کس طرح اس کو اشیاء کے حسن و قبح معلوم کرنے کا ایک معیار بتا دیا ہے کہ جو چیز بھی اس معیار پر پرکھی جائے گی اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔

اب توحید کا قائل ہو جانے کے بعد طبعًا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے خدا خوش ہوتا ہے اور جن کو کرنے سے اس کی رضامندی حاصل ہوتی ہے اور وہ اعمال کیا ہیں جو اس کے قہر و غضب کا موجب بنتے ہیں۔ عقائد کے علاوہ اسلام کی تمام تعلیمات انھیں اعمال کے بیان اور ان کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ ان تمام اسلامی اعمال و افعال میں اِفراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔

بالفاظِ مختصر تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام اسلامی اعمال کی بنیاد اتقار پر قائم ہے یعنی وہ معاملات جن کا تعلق اللہ اور بندہ کے تعلق سے ہے اور وہ معاملات جو ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے معاملات میں بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے

کہ تمام انسانی اعمال و افعال کا مقصد حکمِ خداوندی کی بجا آوری ہے. یہاں تک کہ اگر باپ بیٹے پر خرچ کرتا ہے، یا بیٹا باپ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہئے کہ چونکہ خدا نے اس تعلقِ اُبوت و بنوت کی بنا پر مجھکو یہ حکم دیا ہے اس لئے میں یہ کام کر رہا ہوں اگرچہ اس فعل سے حظِ نفس بھی ضرور حاصل ہوگا. لیکن ذاتی حظِ نفس کا حصول مقصدِ کار نہ ہونا چاہئے. اس ایک مثال پر ہی دوسرے شخصی اور بین الاقوامی تعلقات کو قیاس کر لیجئے۔

غرض یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں روحِ اتقاء کے کارفرما ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قبائل و افراد کو قبائلی عصبیت اور دوسرے اور تعصباتِ جاہلیت مثلاً وطنیت، رنگ و نسل کی برتری، دولت و ثروت کا غرور، جسمانی طاقت و قوت کا گھمنڈ، خود غرضی، نفس پرستی اور تن پروری باہمی تباغض و تحاسد، خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، ان میں سے ہر ایک لعنت سے نجات مل جاتی ہے اور ان لعنتوں میں گرفتار ہو کر انسانیت کو جس درد و کرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، انسانی سوسائٹیاں ان سے محفوظ ہو کر امن و عافیت کی زندگی بسر کرنے لگتی ہیں۔

اسلامی اوامر و نواہی کا مطالعہ آپ علم النفس کی روشنی میں کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے قوائے عملیہ میں سے کسی قوت کو نہ تو بالکل جامد و خامد کرنا چاہا ہے اور نہ اس کو بالکل مطلق العنان چھوڑا ہے کہ جو چاہے کرے بلکہ بشری تقاضوں کو ملحوظ رکھکر ہر ایک قوت کے حدودِ عمل کی تعیین و تحدید کر دی ہے مثلاً قوتِ شہوی کا کام ہے جلبِ ملائم! اور قوتِ غضبی کا دفعِ مضار، تو اسلام نے یہ بتایا کہ درحقیقت ملائم یا مرغوب کونسی چیز ہے اور کونسی نہیں، پھر یہ بتایا کہ اگر یہ چیز ملائم و مرغوب ہے تو اس کی جلب و تحصیل کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اس کی تشریح کر دی کہ یہ جلب و تحصیل کتنا ہونا چاہئے؟ اس کی کتنی مقدار نافع ہے اور کتنی مضر! اسی طرح قوتِ غضبی کا کام ہے دفعِ مضار، تو اسلام نے اس قوت کی تہذیب کے لئے بتایا ہے کہ واقعی مضار کون کون سی چیزیں ہیں، پھر یہ کہ جو چیزیں مضر یا مؤلم ہیں ان کو کس طرح دفع کرنا چاہئے. اسلامی تعلیمات کی یہی وہ جامعیت اور موزونیت ہے جس کی وجہ سے ان میں اتنی لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ میں

اور ہر مقام پر اور ہر شخص کے لئے لائق عمل ہیں۔

عقیدۂ توحید وافکار کا مجموعی اثر

اسلامی عقائد واعمال کی اس روح کو معلوم کر لینے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو سوسائٹی ان پر کاربند اور عمل پیرا ہوگی اسے بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب، شائستہ اور مدنیتِ صالحہ کا مالک ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہی وہ سوسائٹی ہوگی جس کے دلوں میں کسی شخص یا کسی قوم کے خلاف ذاتی نفرت وعناد کے جذبات نہیں ہوں گے یہ جماعت حق کی علمبردار اور باطل کے لئے آہنی دیوار یا ایک تیز تلوار ہوگی، اس کی نظر میں امیر وغریب، شاہ وگدا، گورے اور کالے، عربی عجمی سب برابر اور یکساں ہوں گے۔ ذاتی خصوصیت اور شخصی بغض وعناد کے باعث اس جماعت کا کسی شخص یا کسی قوم سے کوئی بگاڑ نہ ہوگا۔ ملک گیری یا ملوکیت پرستی کا اس جماعت کے وہم وگمان میں بھی گذر نہیں ہوسکتا۔ عام بندگانِ خدا کی رفاہیت اور ان میں انس وعافیت کی فضا قائم کرنا ان کا اولین مطمحِ نظر ہوگا۔

دوسری طرف اس جماعت کو خدا پر بھروسہ ہوگا۔ اور اس لئے یہ جس کام کا عزم کرکے اٹھے گی اُسے مخالفت ومقاومت شدیدہ کے باوجود پورا کرکے رہیگی۔ اس جماعت کا امیر ذی شان صاحبِ علم ونشان ایک گدائے گوشہ نشین کی طرح متواضع، منکسر اور فروتن ہوگا۔ اور وہ اپنی دولت وامارت کو عطیۂ خداوندی سمجھکر اُسے خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کردے گا اور پھر جو ان میں فقیر ومفلس ہوں گے ان کے ہاتھ اگرچہ خالی ہوں گے اور ان کے گھروں میں شاید بوریئے بھی نہ ہوں لیکن ان کی آنکھوں میں استغنار کا نور چمکتا ہوا ان کی پیشانیوں سے قناعت وصبر کا اطمینان برستا ہوا نظر آئے گا۔ قلتِ مال بلکہ فقدانِ مال کے باوجود دبدبۂ سکندری ان کے چہرہ بشرہ سے عیاں اور جاہ وجلالِ فریدونی ان کی صورت وشکل سے آشکارا ہوگا، یہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا۔ جدھر یہ رُخ کریں گے اقبال وظفرمندی ان کے قدم لے گی، ان کو ہتھیاروں اور توپ وتفنگ کی بھی ایسی چنداں ضرورت نہیں ہے، یہ جس طرف نگاہ اٹھائیں گے قوموں اور جماعتوں کی تقدیروں کو پلٹ کر رکھدیں گے۔ یہ جس زمین پر اپنے گھوڑے دوڑائیں گے

زمین اپنے خزانے اگل کر ان کی کنجیاں اُن کے ہاتھوں میں دیدے گی صرف خشکی میں اور زمین کے اوپر نہیں بلکہ سمندروں کی طوفانی موجوں میں بھی حق کا علم سرفراز و سربلند کرنے کے لئے یہ کود پڑیں گے تو یہ متلاطم موجیں بھی ان کے عزائم کو روک نہ سکیں گی، عہدِ صحابہؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے اور بتائیے کہ ان اوصاف کی حامل کیا ان صحابہؓ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور جماعت بھی ہوئی ہے؟

یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں ذرا بھی شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے جس کی شہادت تاریخ کے صفحات اب بھی دے رہے ہیں، دنیا میں بڑے بڑے بہادر اور شیر افگن رستم و سہراب پیدا ہوئے مگر بتاؤ کسی قوم میں کوئی بہادر علیؓ جیسا بھی پیدا ہوا جس نے اپنے سخت ترین دشمن جان کافر کو اس پر قابو پالینے کے بعد محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس نے اُن کے منہ پر تھوک دیا تھا کہ اب اگر وہ اس کو قتل کرتے تو اس میں ذاتی انتقام کا شائبہ بھی پیدا ہوا جاتا تھا۔

دنیا میں بڑے بڑے عادل، انصاف پسند اور رحمدل بادشاہ گذرے ہیں مگر کوئی قوم عمرؓ جیسا بھی کوئی حکمراں پیش کر سکتی ہے جو پیوند لگے ہوئے کپڑے پہن کر اور فرشِ خاک پر بیٹھکر عرب و ایران کی قسمتوں کے فیصلے کرتا تھا اور جسے بیوہ اور غریب عورتوں کے چولھوں میں آگ جلانے اور کھانا پکانے میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا۔

قوم و وطن کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنے والوں کی کمی نہیں، لیکن انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ بھی خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے کہ فتنہ پردازوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا ہے، یہانتک کہ ایک شخص آپ کے مکان میں داخل ہو کر آپ کو قتل بھی کر دینا چاہتا ہے مگر صاحبِ خلافت و امارت ہونے کے باوصف آپ ان لوگوں کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کو بھی تلوار اٹھانے کی اجازت محض اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں فتنہ کے دروازہ کا کھلنا آپ کی ہی طرف منسوب نہ کیا جائے۔

غور کرو، انتہائی شجاعت و دلیری کے ساتھ یہ تواضع و فروتنی اور خدا ترسی، سیاسی طاقت و قوت کے باوجود معمولی درجہ کے انسانوں کے ساتھ بالکل مساویانہ بلکہ خادمانہ برتاؤ

شدت وصولت کے ساتھ رحمدلی اور رقت، فقیری اور مفلسی کے ساتھ کامل استغنار اور اطمینانِ نفس، کمالِ دولت وایالت کے ہوتے ہوئے یہ حیرت انگیز بے نفسی اور بے غرضی قبائلی عصبیت کی مسموم آب وہوا میں پرورش پانے کے باوجود اسلام قبول کرتے ہی ان میں ایسا انقلاب پیدا ہوجانا کہ اسلام قبول کرکے جوان کا بھائی بن جاتاہے اس کے لئے یہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے دل وجان سے آمادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ عہدِ جاہلیت میں قبائلی رقابت کی بناپر ان میں کیسی ہی صف آرائیاں ہوچکی ہوں اور اس کے برعکس خاص اپنے عزیزوں قریبوں اور چہیتوں کو اللہ کے راستہ میں قتل کرنے پر آمادہ ہوجانا جن کی حمایت ومدافعت اسلام سے پہلے ان کی زندگی کا اولین فریضہ تھا۔

مختصر یہ کہ مختلف ومتضاد اخلاق وملکات میں یہ توازن واعتدال کیا سوائے اس جماعت کے کسی اور میں بھی پایا جاسکتاہے جس کی قوتِ نظر وعمل کسی غیر معمولی اثر کے ماتحت نہایت معتدل ومہذب ہوچکی ہو، اور جس نے تمام انفرادیتوں کو یک قلم فراموش کرکے اپنے آپ کو ایک وجودِ اعلیٰ و اشرف کے ساتھ وابستہ کرلیا ہو۔

اب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے حضرت علیؓ کے عہد تک خلافتِ راشدہ کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اوصاف وکمالات خلافتِ راشدہ کے عہد میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اس بناپر عہدِ نبوت کو مستثنیٰ کرکے پوری تاریخِ اسلام میں سب سے زیادہ روشن اور عظیم الشان زمانہ یہی ہے۔ اسی زمانہ کا نظامِ حکومت حقیقی معنیٰ میں کسی حکومت کا بہترین نظام کہلاسکتاہے چنانچہ اس عہدِ خلافت کے چند نمایاں اوصاف حسب ذیل ہیں۔

خلفار کی سادگی خلفاءِ راشدین نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ظاہری نمود وشان کا ان میں پتہ نہ تھا۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ خلافت سے پہلے کسی لڑکی کی بکری کا دودھ دوہیا کرتے تھے آپ خلیفہ ہوئے تو لڑکی بولی "اب ہمارا دودھ کون دوہیگا" حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر فرمایا "خلافت مجھکو خلقِ خدا کی خدمت سے باز نہیں رکھ سکتی۔

حضرت عمرؓ جس سادگی سے رہتے تھے دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے

شان یہ تھی کہ آپ کی فوجوں نے ایران کی ساسانی حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے قیصر وکسریٰ کے سامنے آپ کا نام آتا ہے تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ اور خالدؓ ایسے جرنیلوں سے بازپرس ہوتی ہے تو کیا مجال کہ ان میں سے کسی کی پیشانی پر ناراضگی یا عدول حکمی کی ایک شکن بھی پڑ سکے۔ لیکن اس شانِ جبروت وسطوت کے باوجود سادگی کا یہ عالم ہے کہ بدن پر پیوند لگا ہوا کُرتہ ہے، سر پہ پھٹا پرانا عمامہ ہے اور پاؤں میں ایک بہت ہی معمولی جوتہ ہے۔ سفر میں اس جلیل القدر خلیفہ کو خیمہ وخرگاہ کی ضرورت نہیں۔ چلتے چلتے جہاں نیند آئی وہیں کسی درخت کے سایہ میں پڑ گئے، مکان میں دربان اور خدم وحشم کا اہتمام نہیں ہے، جو شخص جس وقت چاہے بے تکلف آ کر مل سکتا اور اپنی ضرورت بیان کر سکتا ہے پھر خلافت کی ذمہ داری کا احساس اس قدر شدید ہے کہ خود غریبوں اور بیکسوں کی خبرگیری کرتے ہیں اور ضرورت ہوتی ہے تو ان کے گھروں کا کام بھی کر آتے ہیں۔ خلیفہ ہونے کے باوصف انھیں گھر کا کام کرنے میں اور بازار سے سودا سلف لانے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ

> ایک مرتبہ حضرت علیؓ اپنی خلافت کے زمانہ میں بازار تشریف لے گئے اور ایک درہم کے پھل خریدے۔ انھیں کرتہ میں رکھکر خود ہی لا رہے تھے کہ راستہ میں کسی نے کہا، امیر المومنین! اپنا بوجھ کسی کو دیدیجئے" آپ نے جواب دیا" ابوالعیال احق بحملہ" بال بچوں والا شخص اس بوجھ کے اٹھانے کا زیادہ سزاوار ہے" [1]

بیت المال کی حفاظت اس بے غرضی، بے نفسی اور خلوص وللہیت کے باعث خلفاء راشدین بیت المال کے ایک ایک پیسہ کی حفاظت کرتے اور اس کے صرف کرنے میں سد درجہ احتیاط برتتے تھے، وہ اس کو حقیقتہً قوم کی امانت سمجھتے تھے اور اس بنا پر اس کا کوئی ایک پیسہ اپنی ذات یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے آرام وآسائش پر خرچ کرنے کو حرام جانتے تھے جو خلفاء بیت المال سے اپنی معاشی ضرورت کے لئے کچھ لیتے بھی تھے تو صرف اس قدر کہ اس سے زندگی کی ابتدائی ضرورتیں

[1] ابنِ اثیر ج ۳ ص ۱۶۰۔

پوری ہو سکیں، چنانچہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ بیمار ہوئے، دوا میں شہد تجویز کیا گیا، بیت المال میں شہد موجود تھا ہی، لوگوں نے کہا اس میں سے لے لیجئے مگر آپ نے مسلمانوں کی اجازت کے بغیر اُسے لینا گوارا نہ کیا، چنانچہ آپ نے مسجد نبوی میں تشریف لاکر مسلمانوں سے شہد کے استعمال کرنے کی باقاعدہ اجازت لی۔" ؎۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابورافعؓ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں بیت المال کے خزانچی تھے ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان کی صاحبزادی کو دیکھا کہ ایک موتی پہن رکھا ہے، یہ موتی بیت المال کا تھا حضرت علیؓ نے پوچھا "یہ کہاں سے آیا، میں یقیناً اس لڑکی کا ہاتھ کاٹوں گا"۔ ابورافع نے یہ دیکھکر عرض کیا "امیرالمومنین! بخدا میں نے خود یہ موتی اس کو دیا ہے ورنہ یہ کہاں سے لاسکتی تھی" حضرت علیؓ نے فرمایا "میں نے جب فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کیا تھا تو اس وقت میرے پاس بجز ایک مینڈھے کی کھال کے کوئی اور چیز نہیں تھی۔ ہم دونوں اسی پر سوتے تھے اور دن کے وقت اپنی اونٹنی کو اس پر گھاس دانہ کھلاتے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے سوا کوئی اور شخص میرا کام کرنے والا بھی نہیں تھا۔" ؎۲

جس طرح بیت المال کے خرچ کرنے میں حد سے زیادہ احتیاط برتی جاتی تھی، اسی طرح محاصل اور دوسری واجب رقوم کے وصول کرنے میں بھی اس بات کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی عامل کی طرف سے کوئی ناجائز تشدد یا سختی عمل میں نہ آئے۔ اور کوئی سرکاری عہدہ دار وصولیابی میں کسی پر ظلم نہ کرسکے۔

عدل و مساوات احکام و قوانین کے اجرا میں اپنے پرائے کا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا، ہر شخص کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا تھا جس کا وہ از روئے شریعت مستحق تھا۔ خاندانی قرابت یا کسی اور وجہ تقرب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں ہو سکتی تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادہ ابو شحمہ نے جب شراب پی تو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے ان کو کوڑے مارے جس کے صدمہ سے وہ قضا

؎۱ طبقات ابن سعد حالات حضرت عمرؓ۔ ؎۲ ابن اثیر ج ۳ ص ۵۹ و طبری ج ۶ ص ۹۰۔

کر گئے۔ قدامہ بن مظعون جو حضرت عمرؓ کے سالے اور بڑے رتبہ کے صحابی تھے جب اسی جرم میں ماخوذ ہوئے تو علانیہ ان کو اسی درے لگوائے۔[۲] گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص کے متعلق جب ایک قبطی نے آکر ان کے ظلم و زیادتی کی شکایت کی تو حضرت عمرؓ نے فوراً ان کو مصر سے طلب فرما کر سزا دی"[۳]

انتہا یہ ہے کہ اگر خلیفہ خود بھی کسی معاملہ میں مدعی ہوتا تھا تو وہ عام لوگوں کی طرح عدالت میں حاضر ہو کر اپنا مطالبہ پیش کرتا تھا اور قاضی خلیفہ کی شخصیت سے قطع نظر کر کے وہی فیصلہ کرتا تھا جو اُسے از روئے شریعت دوسرے لوگوں کے حق میں کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ گر پڑی کسی نصرانی نے اس کو اٹھا لیا۔ امیر المومنین نے قاضی شریح کی عدالت میں مرافعہ کیا۔ قاضی نے بحکم البینۃ للمدعی والیمین علی من انکر مدعی سے گواہ طلب کیا جائیگا اور منکر پر قسم آئیگی۔ حضرت علیؓ سے گواہ طلب کئے۔ آپ نے فرمایا "میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے" قاضی شریح نے یہ سُن کر فیصلہ حضرت علیؓ کے خلاف دیدیا"[۴]

حضرت عمرؓ کس جاہ و جلال کے خلیفہ تھے لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ ابی بن کعب سے آپ کا نزاع ہو گیا۔ زید بن ثابتؓ کے ہاں مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عمرؓ اس سلسلہ میں ان کے پاس گئے تو وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے اور اپنی جگہ خالی کر دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ پہلی ناانصافی ہے جو تم نے اس مقدمہ میں کی، یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

انتخاب خلیفہ خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ سے ہوتا تھا، یعنی وہ لوگ انتخاب کرتے تھے جو مسلمانوں کے نمائندہ ہوتے تھے اور جن کی اصابتِ رائے و تدبیر پر سب کو اعتماد ہوتا تھا، یہ نہیں تھا کہ اپنی زندگی میں ہی وہ اپنے بیٹے یا چچا بھتیجے کے لئے مسلمانوں سے بیعت لے لیتے ہوں یا ان کے خلیفہ منتخب ہونے کی سفارش کر کے دنیا سے رخصت ہوتے ہوں۔

عمال کی نگرانی اور احتساب خلفائے راشدین خود جس طرح زہد و قناعت، سادگی اور بے غرضی و بے نفسی کی زندگی بسر کرتے تھے اسی طرح وہ اس بات کی بھی شدید نگرانی کرتے تھے کہ عمال اور دوسرے

---

[۱] معارف ابن قتیبہ ص ۸۱ [۲] طبقات ابن سعد تذکرہ قدامہ [۳] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵ [۴] ابن شریح ج ۳ ص ۶۰

عہدہ دارانِ حکومت بھی اسی طور طریقہ پر زندگی بسر کریں، اول تو ان لوگوں کا انتخاب ہی بڑی احتیاط سے ہوتا تھا پھر انتخاب کے بعد ہر ایک سے ان امور کا عہد و پیمان لیا جاتا تھا کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا، باریک کپڑے نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازہ پر دربان نہ رکھے گا، اہلِ حاجت کے لئے اس کا دروازہ کھلا رہے گا.[۱] ہر عامل کی آمدنی اور اس کے اخراجات اور سامان وغیرہ کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی تھی، چنانچہ اگر کسی عامل کا سامان یا اس کے اخراجات اس کی آمدنی سے زیادہ معلوم ہوتے تھے تو فوراً اس سے احتساب ہوتا تھا۔ اور نصف نصف پر مقاسمت ہو جاتی تھی چنانچہ فتوح البلدان میں اس قسم کے کئی واقعات مذکور ہیں۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ حضرت عمرؓ عمال سے روانگی کے وقت جو کھانے پینے اور لباس کے متعلق عہد لیتے تھے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ عمدہ کھانے کھانا اور باریک لباس پہننا حضرت عمرؓ کے نزدیک ناجائز یا حرام تھا بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں میں جفاکشی کی عادت رہے، ان کی زندگی سپاہیانہ ہو اور سب کا طرزِ معاشرت یکساں نظر آئے۔ چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ کو سفید روٹی (غالباً میدہ کی) پیش کی گئی، آپ نے دریافت فرمایا "کیا سب مسلمان یہی کھاتے ہیں؟" جواب نفی میں ملا تو آپ نے فرمایا "بس تو اب ہم بھی اسے نہیں کھائیں گے"۔[۲]

ایک مرتبہ عتبہ بن فرقد السلمی نے جو آذربیجان کے عامل تھے حضرت عمرؓ کی خدمت میں بعض خاص قسم کے حلوے کا غذوں میں لپیٹ کر بطور تحفہ ارسال کئے، حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر فرمایا "اسے واپس کردو" اور ساتھ ہی عتبہ کو لکھا "تم اپنی اور اپنے باپ کی مشقت و محنت کے بغیر اس قسم کے حلوے کھاتے ہو؟ یاد رکھو ہم سوائے ان چیزوں کے کوئی اور چیز نہ کھائیں گے جن کو مسلمان اپنے اپنے گھروں میں شکم سیر ہو کر کھاتے ہوں"۔[۳]

پھر خلفاءِ راشدین کی ذات پر ہی کیا موقوف ہے، یہ پوری جماعت جس نے براہِ راست مشکوٰۃِ نبوت سے نور حاصل کیا تھا "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ

۱۔ طبری ج ۵ ص ۲۱ ۔ ۲۔ اسد الغابہ تذکرہ حضرت عمرؓ ۔ ۳۔ فتوح البلدان ص ۳۳۲۔

ہر دور میں اور ہر جماعت میں بڑی بڑی خوبیوں کے انسان پائے جاتے رہے ہیں لیکن اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ عرب کے بدوؤں جیسے غیر مہذب و ناشائستہ لوگوں میں سے یکایک ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہو جس کا ہر ہر فرد ذہنی و عملی محاسن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا ہو اور جس نے فکر و نظر اور عمل و اخلاق کے بہترین نمونے پیش کر کے اپنے انسانِ اعلیٰ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہو۔

اس مختصر گذارش سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اولین دور میں جو مسلمان جماعت پیدا ہوئی وہ چونکہ فکری اور نظری اعتبار سے عقیدۂ توحید پر ایمان صادق و راسخ رکھتی تھی اور پھر عملی لحاظ سے اس کے تمام کاموں میں، عبادات و معاملات میں، اخلاق اور عادات میں "اتقا" کی روح کارفرما تھی۔ اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ صالح جماعت تھی اور بقاءِ اصلح کے قانونِ فطری کے مطابق اس جماعت کو ہی حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہو کر رہے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ احکم الحاکمین کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا۔

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ تم سبکسر نہ ہو اور غم نہ کرو، تم تو بلند ہو۔

پھر ان کو اللہ نے خود اپنی جماعت قرار دیا اور ان کے لئے فلاح کا وعدہ فرمایا گیا۔ ارشاد ہے۔

اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ خبردار رہو کہ بے شبہ اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہوگا۔

شاعرِ ملت اقبال نے کہا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس میں شبہ نہیں کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم ہی دو ہتھیار ہیں جن سے کوئی قوم اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہو سکتی ہے لیکن جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں، یہ صرف فرزندانِ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ یقینِ محکم رکھتے ہیں لیکن کس چیز کا؟ نسلی، وطنی، یا علمی اعتبار سے دوسروں پر فائق ہونے کا نہیں بلکہ اس بات کا کہ

"خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے"

پھر یہ قوم عملِ پیہم بھی کرتی ہے تو اسی غالب تصور وایمان کے زیر اثر، اس بنا پر یہ ظاہر ہے، کہ مسلمانوں کا "یقینِ محکم" اور ان کا "عمل پیہم" اپنے اندر ایک ایسی خصوصیتِ فائقہ رکھتا ہے کہ وہ عقیدۂ توحید اور اعمال میں "اتقا" کی رعایت رکھے بغیر کسی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تیسری چیز جو اقبال نے بیان کی ہے وہ محبت ہے جس کو انھوں نے فاتحِ عالم کہا ہے، یقین محکم اور عمل پیہم کی طرح یہ "محبت" مسلمانوں کی طرح دوسری اقوام میں بھی پائی جاسکتی ہے مگر مسلمانوں کی محبت بھی ان کے یقین وعمل کی طرح دوسری اقوام کی محبت سے یکسر مختلف ہے، ان کی محبت کسی ذاتی حظِ نفس یا نفسی خواہش پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ خدا کے تعلق کے اعتبار سے اس محبت کی بنیاد انسانی اخوت کے احساس اور خلوص وللّٰہیت کے جذبہ پر قائم ہوتی ہے۔ اسی محبت کو "حب فی اللہ" کہتے ہیں۔ اس محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کسی قوم سے اگر جنگ کرتے بھی ہیں تو چونکہ اس جنگ میں ہوسِ ملک گیری یا جذبۂ ملوکیت پسندی کو دخل نہیں ہوتا بلکہ بندگانِ خدا کی اصلاح وہدایت اور خالصۃً لوجہ اللہ اعلاءِ کلمۂ حق اس کا مقصد ہوتا ہے اس بنا پر یہ عام فاتحینِ عالم کی طرح مفتوح اقوام کے ساتھ ناگوار جبر وتشدد کا معاملہ نہیں کرتے اور سختی کے ساتھ ان احکام کی پابندی کرتے ہیں جو اس بارہ میں ان کو خدا نے بتائے ہیں۔ اس صلح جویانہ روش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فریقِ مخالف اپنے ہنگامی یا جذباتی بغض وعناد کی عینک اتار کر جب ان کے اخلاق واعمال اور ان کے مقدس باطنی احساسات وجذبات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی عداوت محبت سے اور اس کا تنافر انسیت والفت سے بدل جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان صرف کسی ملک کی زمین کو ہی فتح نہیں کرتے بلکہ اپنی للّٰہیت اور انسانی خیراندیشی وخیرسگالی کے باعث اہلِ ملک کے دلوں کو بھی مسخر کر لیتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ ایران کی جنگ میں ایرانی فوج کے چار ہزار سپاہی بیک وقت مسلمان ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی صف سے آملے۔ پھر یہ لوگ یونہی دکھاوے کے مسلمان نہیں تھے بلکہ ان کی جو تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ میں کام آتی تھیں اب ان کی حمایت واعانت میں

کام آنے لگیں، چنانچہ یہ سب حضرت سعد بن ابی وقاص کے زیرِ علَم مدائن اور جلولاء کی جنگ میں شریک ہوئے۔ اور اس معرکہ کو جیت کر سرخروئی حاصل کی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کو کون نہیں جانتا کہ اس نے سندھ میں دشمن کو کس بری طرح پامال کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے اسلامی اخلاق اور کیرکٹر سے مفتوحین کے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں۔

"یزید بن ابی کبشہ السکسکی سندھ کا گورنر ہو کر آیا اور اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا تو اہلِ ہند زار و قطار روتے تھے اور انھوں نے یادگار کے طور پر محمد بن قاسم کی تصویر بنا کر کیرج میں رکھی۔" [۱]

میں نے محبت کی یہ تشریح ضمناً ذکر آجانے کی وجہ سے کی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ "عقیدۂ توحید اور اتقاء" یہ دو بنیادی امور ہیں جن پر تمام فضائلِ اخلاق کی بنیاد قائم ہے۔ انھیں فضائلِ اخلاق میں سے ایک محبت بھی ہے، فلسفۂ اخلاق میں "عدالت" کو جامع فضائل اخلاق کہتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ عقیدۂ توحید اور اتقاء ان دونوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان میں عدالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نظری اور عملی دونوں قسم کے کمالات و فضائل کا جامع بن جاتا ہے۔

اب اس وقت اس جماعت میں ایسی زبردست طاقت و قوت اور مصائب انگیزی و جفاکشی کی ایسی جرأت و ہمت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسری جماعتیں اس کے سامنے سپر افگنی پر مجبور ہوتی ہیں اور اس جماعت کے غیر معمولی عزم و ارادہ کو دیکھ کر شاہانہ جاہ و جلال کے باوصف ان کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔

حضرت نعمان بن مُقرن کی سرکردگی میں سفراءِ اسلام شہنشاہِ ایران یزدگرد کے دربار میں پہنچے تو اس وقت ایرانی رسم و رواج کے مطابق دربار اس شان و شوکت سے سجایا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، لیکن یہی سفراءِ اسلام جب عربی جبے پہنے، کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے اور ہاتھوں میں کوڑے لئے اور موزے پہنے نہایت بے باکی اور حد درجہ شانِ استغناء

[۱] فتوح البلدان ص ۴۲۸۔

کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے توان کے چہروں سے ایسی ہیبت ظاہر ہوتی تھی کہ شہنشاہ ایران مرعوب ہوا جاتا تھا۔

ابورجاء الفارسی کے دادا کا جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے بیان ہے کہ میں خود قادسیہ کی جنگ میں شریک تھا اور ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا، شروع شروع میں عربوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے کہا "یہ تیر کہاں ہیں، یہ تو تکلے ہیں" لیکن آخر کار انہی تکلوں نے ہمارا کام تمام کرکے رکھدیا۔ ہم ادھر سے جو تیر پھینکتے تھے وہ کسی مسلمان کے کپڑوں سے الجھکر رہ جاتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے جو تیر آتا تھا مضبوط سے مضبوط زرہوں اور ڈبل خودوں کو چیرتا ہوا باہر نکل جاتا تھا۔" سلہ

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنئے۔ ایرانیوں کا شکست خوردہ لشکر قادسیہ سے بھاگ کر مدائن پہنچا۔ درمیان میں دریائے دجلہ پڑتا تھا، ایرانیوں نے دریا کو پار کرنے کے بعد تمام کشتیاں دریا سے الگ کرلیں اور پلوں کو آگ لگادی تاکہ مسلمان دریا عبور کرکے ان کا تعاقب نہ کرسکیں لیکن مسلمانوں نے دریا میں گھوڑے ڈالدیئے اور دریا پار کرگئے۔ اب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو آپس میں کہنے لگے، "قسم خدا کی تم تو انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑ رہے ہو۔" سلہ

اب بتائیے کیا یہ عزم وحوصلہ اخلاقی اور روحانی قوت وانبساط کے بغیر کسی قوم میں پیدا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس ایمان وعمل کا ہی وہ مقامِ رفیع تھا جس پر صحابہ کرامؓ کی جماعت فائز تھی! اور اس بِنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ شائستہ اور صالح جماعت تھی، اور بقاءِ اصلح کے فطری قانون کے مطابق اسی کو حق تھا کہ وہ سب پر فائق وبرتر ہو کر رہے، چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے تھا! تاریخ کے صفحات ان کے شاندار کارناموں سے پُر ہیں اور اس کی بنیاد وہی ہے جو میں نے بیان کی۔

سلہ فتوح البلدانؒ ص ۲۶۰ سلہ ایضاً ص ۲۶۳۔

آنحضرت صلعم کی پیشینگوئی

لیکن افسوس ہے کہ اسلام کا یہ عظیم الشان دور زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکا اور رہتا بھی کس طرح؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زبان حق ترجمان سے فرما چکے تھے

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم ثم ان بعد کم قوما یشهدون ولا یستشهدون ویخونون ولا یؤتمنون وینذرون ولا یفون ویظهر فیهم السمن۔ (صحیح بخاری)	میری امت میں سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر اس کے بعد والوں کا اور پھر اس کے بعد والوں کا، پھر تمہارے بعد ایک قوم آئیگی جو شہادت دیگی حالانکہ اس سے شہادت طلب نہ کی جائیگی یہ لوگ خائن ہونگے امانتدار نہیں، یہ نذریں مانیں گے مگر انھیں پورا نہیں کریں گے اور ان میں موٹاپا عام ہو جائے گا۔[1]

اس پیشینگوئی میں یہ بات لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے تین ادوار کو خیر فرمایا ہے لیکن خیر ہونے میں تینوں برابر کے درجہ کے نہیں کیونکہ عربی زبان میں کلمہٗ ثُمَّ جس طرح تراخی زمانی پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اس سے تراخی فی المرتبۃ کا مفہوم بھی متبادر ہوتا ہے، اس بنا پر اس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا بہترین دور تو وہ ہوگا

---

[1] حافظ عماد الدین ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ نے طبرانی سے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں ملک عضوض یا جبری سلطنت کے بعض نشانات کی طرف بھی اشارہ فرمادیا گیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام میں شروع سے اب تک جو کچھ انقلابات ہوئے ہیں اور طریقِ حکومت کے اعتبار سے جو جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان سب کا اجمالی خاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی دکھلا دیا گیا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

ان هذا الامر بدا رحمة ونبوة۔ ثم یکون رحمة وخلافة ثم کائن ملکا عضوضا، ثم کائن عتوا وجبریة وفسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور ویرزقون علی ذالك وینصرون حتی یلقوا الله۔	اس حکومت کا آغاز رحمت اور نبوت سے ہوا ہے پھر یہ رحمت اور خلافت ہوگی اس کے بعد جبری سلطنت بن جائیگی پھر یہ سرکشی، تشدد اور فساد فی الارض میں تبدیل ہو جائیگی مسلمان بادشاہ ریشم اور شراب کو حلال کرلیں گے اور شہوت رانی میں مبتلا ہو جائیں گے ان کو اس کے مواقع ملیں گے یہانتک کہ وہ خدا سے واصل ہو جائیں گے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۰)

جس میں آنحضرتؐ جلوہ فرمائے عالم آب و گل ہوں گے۔ اس کے بعد دورِ صحابہ بھی خیر القرون ہوگا مگر عہدِ نبوت سے کم درجہ پر، اسی طرح عہدِ تابعین بھی خیر ہوگا لیکن اس میں عہدِ صحابہ کی سی بھلائی (خیریت) نہیں ہوگی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں ہی کچھ ایسے واقعات پیش آئیں گے جن کو مسلمانوں کی بدنصیبیوں کی تاریخ کا پہلا باب کہا جائے گا اور اب اسلام کی حقیقی روح کا اضمحلال شروع ہوجائے گا تابعین کے دور میں یہ اضمحلال اور بڑھے گا لیکن ان دونوں زمانوں کا اضمحلال غیر محسوس ہوگا۔ اس لئے بحیثیتِ مجموعی آئندہ آنے والے زمانوں کی بہ نسبت یہ دور پھر بھی خیر القرون ہوں گے۔

تمثیلاً یوں سمجھئے کہ کسی چیز میں سپیدی کامل درجہ کی ہوتی ہے تو اس میں سیاہی کا بالکل نام و نشان نہیں ہوتا لیکن جب سپیدی گھٹنے لگتی ہے تو جس رفتار سے وہ کم ہوتی جاتی ہے اسی رفتار سے سپیدی کی ضد یعنی سیاہی بڑھتی رہتی ہے۔ اول اول یہ غیر محسوس ہوتی ہے، لیکن آخر کار ایک وقت آتا ہے جب سیاہی اس تمام چیز پر محیط ہوجاتی ہے اور اب کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ یہ کبھی سپید بھی تھی، یا مثلاً عالمِ شباب گذرنے کے بعد قویٰ میں ضعف و انحطاط پیدا ہونے لگتا ہے تو شروع میں اس درجہ غیر محسوس ہوتا ہے کہ کسی حاذق طبیب کے سوا کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ پھر جب عہدِ شباب کا آفتاب لبِ بام آکر مطلعِ حیات پر شامِ پیری کی تاریکیاں بکھیر دیتا ہے اور کائناتِ عالم کی ہر چیز اداس و غمگین نظر آنے لگتی ہے تو انسان کو اپنے قویٰ کا انحطاط بین طور پر محسوس ہوتا ہے اور اب اُسے تلافیِ مافات کی فکر ہوتی ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشینگوئی کی تھی وہ ہو بہو پوری ہو کر رہی۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ہر صحابی اپنی انفرادی زندگی میں ایمان و عمل کے آسمان کا آفتاب و ماہتاب، اور فرمانِ نبوی "ان میں سے تم جس کسی کا بھی اقتدا کروگے ہدایت پاؤگے" کا مصداق تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اسلام کا وہ عدیم المثال اجتماعی نظام جو عہدِ نبوت اور اس کے بعد خلفاءِ ثلاثہ کے زمانوں میں قائم تھا، حضرت عثمانؓ کے واقعۂ شہادت ۳۵ھ کے بعد اپنی اسی شکل و صورت کے

ساتھ قائم نہیں رہ سکا۔ خیر کے ساتھ شر لگا ہوتا ہی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی متعدد فتنے اٹھے، لیکن ان دونوں بزرگوں نے اپنی غیر معمولی فراستِ دینی، شجاعت اور جرأت سے ان کا استیصال اس طرح کردیا کہ ان کو پھر ابھرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

حضرت عثمان کی شہادت

لیکن حضرت عثمانؓ کا واقعۂ شہادت اسلام کی تاریخ کا ایسا المناک حادثۂ فاجعہ ہے جس نے رونما ہوکر مسلمانوں کے اجتماعی نظام میں لامرکزیت پیدا کردی اور ایک ایسے فتنۂ عظیم کا دروازہ کھولدیا جس کی نحوستیں مرورِ ایام کے ساتھ بڑھتی ہی رہیں۔ خلیفۂ سوم حضرت ذوالنورین کے شہید مظلوم ہونے میں کس بدبخت کو کلام ہوسکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اگر عثمانی حلم و مسامحت کی جگہ دبدبۂ فاروقی کارفرما ہوتا تو صورتِ حال بالکل ہی دگرگوں ہوتی پھر نہ عبداللہ بن سبا ایسے منافق کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوسکتی تھیں اور نہ مصر و عراق کے بدباطن انسانوں کو خلافت کے برخلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی گستاخی کا حوصلہ ہوسکتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے جان دیدی مگر فتنہ کے کھڑا ہونے کے اندیشہ سے کسی کو باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی، بہرحال جو کارکنانِ قضا و قدر کا فیصلہ ہوچکا تھا وہ پورا ہوکر رہا، خلیفۂ سوم انتہائی بے دردی اور سفاکی کے ساتھ شہید کردیئے گئے، دو دن تک نعشِ مبارک بے گور و کفن پڑی رہی۔ خونِ شہادت میں نہائے ہوئے جسمِ مطہر کو غسل دینے کی کیا ضرورت تھی، تیسرے دن چند آدمیوں نے جان ہتھیلی پر رکھکر دفن کا انتظام کیا۔

حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت

حضرت عثمانؓ کے اس غیر معمولی ایثار کے باوجود ان کو جو اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہوا اور اسلام کے اجتماعی نظام کا شیرازہ پراگندہ ہوگیا۔ آپ کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے، آپ کی بے نفسی اور بے غرضی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آپ نے شروع میں خلافت کا بار سنبھالنے سے بہت انکار کیا اور فرماتے رہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں اور نہ مجھکو اس کی کوئی ضرورت ہے تم جس کسی کو خلیفہ منتخب کرلوگے میں بھی اس پر راضی ہوجاؤں گا۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ ان حضرات کی نمایندگی کررہے تھے، حضرت علیؓ کا انکار دیکھکر جب انھوں نے

کہا کہ مدینہ میں آپ سے بڑھ کر خلافت کا کوئی اور دوسرا شخص مستحق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا۔ "ایسا نہ کرو، میں بہ نسبت امیر ہونے کے وزیر ہونے کی اچھی استعداد رکھتا ہوں" لیکن جب مدینہ کے اکابر صحابہؓ کو زیادہ اصرار ہوا تو آپ نے جمہور کی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے اس کو منظور فرمالیا۔[1]

حضرت علیؓ کی جلالتِ شان، تقویٰ، دیانت اور خلوص وللّٰہیت میں چون وچرا کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے مگر مشکل یہ ہے کہ منافقین کی دسیسہ کاریوں اور بعض نئے مسلمانوں کی ناواقفیت کی بنا پر عراق اور شام میں جو اندرونی کشمکش پیدا ہوگئی تھی وہ نہایت نازک صورت اختیار کرچکی تھی اور اس کو فرو کرنے کے لئے جس غیر معمولی سیاسی تدبر اور حزم ودوراندیشی کی ضرورت تھی۔ حضرت علیؓ کی پاک نفسی، نیک باطنی اور اخلاقی عظمت وبرتری اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی تھی، آپ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ امیر معاویہؓ کو جو شام کے گورنر تھے اور وہاں اپنا بڑا رسوخ واثر رکھتے تھے معزول کرنے کا ارادہ کرلیا، مدینہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایسے جلیل القدر اور سیاست داں صحابہ تشریف رکھتے تھے انھوں نے حضرت علیؓ کو سمجھایا کہ اگر آپ امیر معاویہؓ کو شام کی گورنری سے الگ کرنا چاہتے ہی ہیں تو پہلے ان سے اپنی خلافت پر بیعت لے لیجئے، اغلب یہ ہے کہ وہ اس میں آپ کی مخالفت نہیں کریں گے پھر آپ ان کو معزول کرسکتے ہیں ورنہ اگر آپ نے بیعت لینے سے پہلے ہی ان کو ولایتِ شام سے الگ کردیا تو وہ حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانہ سے آپ کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیں گے اور امت میں تشتت پیدا ہوجائے گا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت مغیرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں بزرگوں کی یہ رائے نہایت صائب اور درست تھی مگر نوشتۂ تقدیر پر کس کی مجال ہے کہ خطِ نسخ پھیر سکے۔ حضرت علیؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا اور کہا اس میں شک نہیں کہ دنیوی مصالح کے لحاظ سے

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۸۴۔

آپ کے مشورہ کے مطابق مجھکو یہی کرنا چاہئے کہ امیر معاویہ اوران کے ساتھیوں کو ابھی اُن کے عہدوں پر رہنے دوں، لیکن مجھکو اُن کے جن حالات کا علم ہے ان کے پیشِ نظر حق اور دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ میں ان کو معزول کردوں، اگر انھوں نے میرے حکم کی تعمیل کی تو خیر! ورنہ پھر میں تلوار سے کام لوں گا۔ ؎۱

حضرت ابن عباسؓ نے تو یہاں تک فرمایا کہ اچھا اگر آپ کو اموی عُمّال کے عزل پر اتنا ہی اصرار ہے تو یہ کیجئے کہ سردست امیر معاویہ کے معاملہ کو ملتوی رہنے دیجئے۔ ایک مرتبہ ان سے بیعت لے لیجئے، پھر کوئی فتنہ اٹھیگا تو میں دیکھ لوں گا، لیکن حضرت علیؓ نے اُسے بھی نہیں مانا اور صرف امیر معاویہؓ نہیں بلکہ اور دوسرے حضرات جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے مختلف جگہوں کے گورنر بنے چلے آرہے تھے ان سب کے نام عزل کا پروانہ بھیجدیا اور ان کی جگہ اپنے نئے نئے عمال مقرر کردیئے

اس سلسلہ میں عثمان بن حنیف کو بصرہ کا، عمارۃ بن شہاب کو کوفہ کا، عبیداللہ بن عباس کو یمن کا، قیس بن سعد کو مصر کا اور سہل بن حنیف کو شام کا عامل بنادیا گیا، لیکن ان سب مقامات کی فضا اس درجہ مخالف تھی کہ لوگ حضرت علیؓ کے عمال سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ شام کو جاتے ہوئے سہل حنیف سے تبوک میں ایک جماعت کی ملاقات ہوئی، جنھوں نے پوچھا "آپ کون ہیں" انھوں نے کہا "میں امیر ہوں" لوگوں نے پوچھا "کس چیز کے؟" بولے "شام کا" اب ان لوگوں نے کہا "اگر آپ کو عثمانؓ نے بھیجا ہے تو بسر وچشم، ورنہ اگر کسی اور نے آپ کا تقرر کیا ہے تو آپ واپس چلے جائیے" سہل بن حنیف نے کہا "کیا جو کچھ ہوچکا ہے تمہیں اس کی خبر نہیں ہے" انھوں نے جواب دیا "کیوں نہیں" اس گفتگو کے بعد سہل بن حنیف واپس چلے آئے۔

اسی طرح عمارۃ بن شہاب کوفہ کے عامل بنا کر بھیجے گئے۔ راستہ میں زبالہ کے مقام پر اُن سے طلیحہ بن خویلد کی ملاقات ہوگئی، طلیحہ نے کہا "تم واپس چلے جاؤ، کیونکہ کوفہ کے لوگ اپنے امیر کے بدلہ میں کسی اور شخص کی امارت پر رضامند نہیں ہوسکتے۔ اور اگر تم نے واپس جانے سے انکار کیا

؎۱ طبری ج ۵ ص ۱۶۰۔

تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ عمارۃ کمزور طبیعت کے انسان تھے ان پر اس گفتگو کا ایسا اثر ہوا کہ سیدھے حضرت علیؓ کے پاس واپس لوٹ آئے۔ یمن کا حال بھی یہی ہوا۔ حضرت علیؓ نے یہاں کا عامل عبید اللہ بن عباسؓ کو مقرر کیا تھا، ان کے یمن پہنچتے پہنچتے یعلی بن امیہ نے ٹیکس کی تمام رقمیں وصول کیں اور انھیں لیکر مکہ آگئے۔ ؎

اب حضرت علیؓ کو ان حالات کا علم ہوا تو آپ نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ سے فرمایا "جس چیز سے میں تم کو ڈراتا تھا وہی ہو گئی، خیر! بہرحال اب جبکہ شدنی بات واقع ہو ہی گئی ہے تو اب اس کی تلافی کی صورت بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے کہ اس کا قلع قمع کر دیا جائے اور جو فتنہ کہ سر اٹھا رہا ہے اس کو کچل کر رکھدیا جائے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے فرمایا" جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا ضبط سے کام لوں گا مگر جب معاملہ قابو سے باہر ہوتا ہوا دیکھوں گا تو مجھکو لامحالہ تلوار اٹھانی پڑے گی کیونکہ بیماری کا آخری علاج داغ لگانا ہے۔"

بات اگر یہیں تک رہتی تو معاملہ زیادہ نہ بگڑتا، حضرت علیؓ اس صورتِ حال پر بہت جلد قابو پا سکتے تھے، لیکن جب انھوں نے اپنے اصرار کے مطابق امیر معاویہ کے نام بھی معزولی کا حکم بھیجا اور ان سے اپنی خلافت پر بیعت طلب کی تو حضرت عبد اللہ بن عباس اور مغیرۃ بن شعبہ کے اندیشہ کے مطابق صورتِ حال نہایت ہی نازک ہو گئی، اول تو امیر معاویہؓ بیس بائیس برس سے شام کے والی چلے آرہے تھے، یہاں کے لوگوں کے عادات وخصائل اور افتادِ مزاج سے اچھی طرح واقف تھے، پھر چونکہ بڑے فیاض طبع اور داد و دہش کے عادی تھے اس لئے اہلِ شام ان سے بہت مانوس تھے۔ ان لوگوں کو حضرت علیؓ کی مخالفت پر آمادہ کر دینے کے لئے یہی کچھ کم نہ تھا کہ خلیفۂ مظلوم کے انتقام کی دعوت نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگا دی۔

پھر اسی سلسلہ میں جب امیر معاویہؓ نے جامع دمشق کے منبر پر آویزاں کر کے حضرت عثمانؓ کے خون آلود کرتہ کا اور ان کی جاں نثار بیوی حضرت نائلہ کی تین کٹی ہوئی انگلیوں کا مظاہرہ

؎ یہی رقوم خطیرہ تھیں جو جنگِ جمل کی تیاری میں حضرت علیؓ کے خلاف صرف کی گئیں۔

مجمع عام میں کیا تو حال یہ تھا کہ بوڑھے اور جوان انھیں دیکھ دیکھ کر زار و قطار روتے تھے اور حلف کرتے تھے کہ جب تک خلیفۂ ثالث کے خونِ بے گناہ کا بدلہ نہیں لے لیا جائے گا وہ کسی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت نہیں کریں گے۔" جو قاصد حضرت علیؓ کا پیغام امیر معاویہؓ کے پاس لیکر گیا تھا اس نے شام سے واپس آکر جب یہ تمام ماجرا حضرت علیؓ کو سنایا تو آپ نے کہا "اے خدا! تو گواہ ہے کہ میں حضرت عثمانؓ کے خون سے بری الذمہ ہوں" امیر المومنین حضرت علیؓ نے یہ جو کچھ فرمایا اس کی صداقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے مگر دشواری یہ تھی کہ ایک طرف انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور مغیرہ بن شعبہؓ کے مشورہ پر عمل نہ کر کے ایک بڑی فروگذاشت کی اور دوسری جانب محمد بن ابی بکرؓ اور اشتر نخعی ایسے لوگوں کو جن پر حضرت عثمانؓ کے قتل کرنے یا اس جرم میں شریک ہونے کا الزام تھا عہدے دیکر اپنی مخالف فضا کو اور زیادہ شدید کر دیا۔

عجب بات یہ ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر اہلِ شام تو حضرت علیؓ کے مخالف تھے ہی۔ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بڑے اصرار سے حضرت علیؓ کو بیعتِ خلافت لینے پر آمادہ کیا تھا اور کہا تھا "ما نختار غیرك" "ہم آپ کے سوا کسی اور کو پسند ہی نہیں کرتے" وہ بھی مکہ معظمہ پہنچکر ام المومنین حضرت عائشہؓ کی جماعت میں شریک ہو گئے اور حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ حالانکہ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ مدینہ کے قیام کے باعث اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں حضرت علیؓ کو کوئی دخل نہیں ہے اور وہ اس سے بالکل مبرہ اور منزہ ہیں، مخالفت کے یہی دو مرکز تھے جہاں حضرت علیؓ کے جذبات پرورش پا رہے تھے۔

ادھر شام اور حجاز میں یہ ہو رہا تھا ادھر مصر میں یہ ہوا کہ حضرت علیؓ نے بعض لوگوں کے کہنے سننے سے مصر کے گورنر قیس بن سعد کو معزول کر دیا جو درحقیقت حضرت علیؓ کے سچے خیر خواہ اور ان کے جاں نثار تھے اور ان کی جگہ محمد بن ابی بکر کو یہاں کا والی بنا کر بھیجدیا۔ حضرت علیؓ کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر والوں میں بھی آپ کی طرف سے بددلی پیدا ہو گئی اور یہاں کے

لوگوں کی اکثریت امیر معاویہؓ کی ہمنوائی کرنے لگی۔ پھر اس پر مستزاد یہ ہوا کہ ۳۶ھ میں جنگِ جمل کے بعد یہ دیکھ کر کہ متعدد فتنوں اور شر انگیز ہنگاموں کے پیدا ہو جانے کے باعث حرم نبوی مدینہ کی توہین ہوتی ہے۔ آپ نے کوفہ کو اپنا دار الخلافت بنا لیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ فعل بھی ان کے دوسرے اعمال و افعال کی طرح نیک نیتی اور پاک طینتی پر ہی مبنی تھا، لیکن سیاسی اعتبار سے اس کا اثر یہ ہوا کہ مدینہ میں جو اکابر صحابہ مقیم تھے آپ ان کے صلاح و مشورہ سے محروم ہو گئے اور کوفہ میں جن نو مسلم عجمیوں کی کثرت تھی وہ آپ کے ارد گرد رہنے لگے۔

حضرت علیؓ نے جو کچھ کیا اس کے لئے سب سے بڑا عذر یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ وہ خود جیسے پاک باطن بے نفس اور متدین تھے ایسا ہی دوسروں کو سمجھتے تھے اور ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ لوگ اپنی ذاتی منفعتوں سے صرفِ نظر کر کے دربارِ خلافت کے احکام کو بے چون و چرا بجا لائیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا یہ گمان ذاتی طور پر ان کے فضائل مآب ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیاستِ مُدن میں ایسے بہت سے مراحل آتے ہیں جبکہ یہ حسنِ ظن مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

پھر اگر اس حسنِ ظن کے ساتھ حضرت عمرؓ کا سا دبدبہ بھی ہوتا تو بات کچھ زیادہ نہ بگڑتی حضرت علیؓ بجبر اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتے تھے اور اگر کوئی فتنہ کھڑا ہوتا تو اس کی روک تھام پوری قوت سے کامیابی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ مگر افسوس کہ یہاں صورتِ حال یہ بھی نہیں تھی۔ حضرت عمرؓ نے خالد بن ولید جیسے ہر دلعزیز اسلامی جرنیل کو معزول کیا تو کسی کو اس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہوئی۔ اسی طرح حضرت مغیرہ بن شعبہ اور فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کی گورنری سے الگ کیا تو کسی کو اس کی مخالفت کی جرأت نہ ہو سکی، لیکن حضرت علیؓ نے امیر معاویہؓ کے نام شام کی گورنری سے معزول ہونے کا پروانہ بھیجا۔ تو تمام اہلِ شام میں آگ سی لگ گئی اور حضرت علیؓ کے خلاف مخالفت کا ایک شدید طوفان امنڈ پڑا۔

حضرت علیؓ کی مخالفت

اس تمام مخالفت کی بنیاد صرف اس بات پر قائم تھی کہ حضرت علیؓ قاتلین

حضرت عثمانؓ سے قصاص لینے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کیوں کامیاب نہیں ہو سکے؟ یہاں اس کے ذکر کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہی ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی امیر کی سیاسی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں اور اس کے احکام کو بے تامل بجالائیں، عراق کے جو لوگ حضرت علیؓ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی سچے دل سے حضرت علیؓ کے ساتھی اور ان کے مددگار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

> "میں جب تم سے موسم سرما میں کہتا ہوں کہ شام والوں سے جنگ کرو تو تم کہتے ہو یہ تو بڑا سخت موسم ہے کڑاکے کا جاڑہ پڑ رہا ہے مگر جب موسم گرما میں کہتا ہوں کہ اچھا اب ان لوگوں سے لڑو تو تم کہنے لگتے ہو کہ آج کل تو بڑی ہی سخت گرمی ہو رہی ہے، گرم ہواؤں کی آندھیاں چل رہی ہیں لوگ کہتے ہیں کہ علیؓ کو سیاست ہی نہیں آتی۔ ہاں ٹھیک ہے جس شخص کی اطاعت نہیں کی جاتی اس کو سیاست بھی نہیں آتی"

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت حالات کس قدر پیچیدہ ہو چکے تھے۔ ایک طرف شام، مصر اور حجاز کے لوگ تھے جن کی اکثریت کھلم کھلا حضرت علیؓ کی مخالفت پر کمربستہ تھی اور دوسری جانب جو جماعت حضرت علیؓ کی حامی تھی اس میں بھی آپ کی حمایت و اعانت کا پورا جوش اور ولولہ نہیں تھا، لیکن چونکہ آپ خلیفہ منتخب ہو چکے تھے اور آپ کا یہ انتخاب بالکل حق بجانب اور درست تھا۔ اس بنا پر آپ کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا کہ جو لوگ دربارِ خلافت کے احکام کی تعمیل نہ کریں ان کو سزا دی جائے۔ حضرت علیؓ کے سیاسی تدبر میں کسی کو کلام ہو تو ہو لیکن ان کی بہادری میں کسی کو کیا مجال گفتگو ہو سکتی ہے؟ آخرکار اس کشمکش کا نتیجہ جنگِ جمل و صفین کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسلام کے وہ بہادر سپاہی جنھوں نے دوش بدوش کھڑے ہو کر بدر اور حنین کے معرکوں میں کفر و شرک کی طاغوتی قوتوں کو شکستِ فاش دی تھی اب وہ خود آپس میں ایک

دوسرے کے خلاف تیغ آزمائی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

امیر معاویہؓ کا طرزِ عمل

لیکن یہ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار صرف حضرت علیؓ کی ذات کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امیر معاویہؓ مشہور مدبر اور صاحبِ سیاست بزرگ تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اسلام کی بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں، انھوں نے ہی طرابلس الشام کو فتح کیا۔ اس کے علاوہ شام کے تمام سرحدی علاقوں پر قبضہ حاصل کر کے شام کو رومیوں کی دستبرد سے محفوظ بنا دیا حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان سے اجازت لیکر ایک بحری بیڑا تیار کیا اور بحرِ روم کے مشہور جزیرہ قبرص (سائپرس) کو فتح کیا۔ یہ بحری بیڑا اتنا طاقتور اور مضبوط تھا کہ اس کے باعث مسلمان رومیوں کے بحری حملوں سے مامون ہو گئے۔ ان فتوحات کے علاوہ وہ چونکہ انتہا درجہ کے بیدار مغز اور ہوشیار تھے اس لئے تمام اندرونی اور بیرونی شورشوں اور سازشوں سے باخبر رہتے تھے، اس بنا پر انھوں نے بہت سی سازشوں کو ظاہر ہونے سے پہلے ہی ناکام کر دیا۔ لیکن ان تمام فضائل کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کی خلافت کو ناکام کرنے کے لئے انھوں نے جو کچھ کیا وہ کم از کم ان جیسی بزرگ شخصیت سے متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر ان میں حضرت عثمانؓ کے قصاص لینے کا ایسا ہی جذبہ تھا تو وہ یہ کام حضرت علیؓ کے ہاتھوں پر خلافت کی بیعت کر کے بھی انجام دے سکتے تھے، دیکھنا یہ ہے کہ اکابر صحابہؓ کی جانیں ضائع ہوئیں، امت میں تفرقے پیدا ہو گئے، اسلام کا اجتماعی نظام درہم و برہم ہو کر رہ گیا مگر حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ پھر بھی نہ لیا جا سکا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انتخابِ خلیفہ کے معاملہ میں مہاجرین و انصار میں جو شدید اختلاف پیدا ہوا تھا اور اس وقت حضرت عمرؓ نے موقع کی نزاکت کو محسوس فرما کر حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے جس طرح اس قضیۂ نامرضیہ کو ختم کر دیا تھا۔ اگر اس وقت حضرت معاویہؓ بھی ایسا ہی طرزِ عمل اختیار کرتے تو بے شبہ امتِ مرحومہ ایک عظیم فتنہ سے بچ جاتی اور وہ رخنے پیدا نہ ہوتے جواب

پیدا ہوئے۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں امیرِ معاویہؓ کا اپنی خلافت پر اصرار کرنا ایک ایسی بات ہے جس کو اسلام کی کوئی اچھی خدمت نہیں کہا جاسکتا۔

تحکیم کا معاملہ چنانچہ اس کا ثبوت واقعۂ تحکیم سے بھی ملتا ہے، تحکیم کی پیش کش امیرِ معاویہؓ کی ہی طرف سے ہوئی تھی جب انھوں نے دیکھا کہ لیلۃ الہریر کی جنگ میں حضرت علیؓ کو کامیابی ہوچکی ہے اور عمرو بن العاصؓ نے کہا "میں ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں جس کی وجہ سے علیؓ کی فوج میں پھوٹ پڑجائے گی اور ہم سب کا اس میں بھلا ہوگا" امیرِ معاویہؓ نے پوچھا "وہ کونسی ترکیب ہے" عمرو بن العاصؓ بولے وہ یہ کہ ہم نیزوں پر قرآن مجید اٹھا کر اہلِ عراق کو دعوت دیں کہ یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ تم اس فریب میں نہ آنا، میں ان لوگوں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں، لیکن عراقیوں کی ایک بڑی جماعت اس فریب میں آچکی تھی، اس نے حضرت علیؓ کو مجبور کرکے قرآن مجید کو حکم ماننے پر مجبور کردیا، اب جنگ ملتوی ہوگئی اور یہ طے پایا کہ امیرِ معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی طرف سے ایک ایک نمائندہ منتخب کیا جائے اور یہ دونوں نمایندے جو فیصلہ کردیں، اس کی پابندی سختی کے ساتھ کی جائے۔ اِن مشیرانِ کار نے یہ بھی کہا کہ "حضرت علیؓ اس تجویز کو قبول کریں یا رد فرمائیں بہرحال ہمارا فائدہ ہوگا۔" [1]

ان الفاظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ تحکیم کی تجویز کو پیش کررہے تھے ان کی نیتوں میں خلوص نہیں تھا اور وہ وقتی طور پر اس بہانہ اپنا کام نکالنا چاہتے تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ تحکیم کی پیش کش جواب تقریباً ستر ہزار فرزندانِ اسلام کی لاشوں کے خاک وخون میں تڑپنے کے بعد کی جارہی ہے نیک نیتی پر نہیں بلکہ خدع وفریب پر مبنی ہے مگر مشکل یہ تھی کہ عمرو بن العاصؓ کی توقع کے مطابق اب خود عراقیوں میں پھوٹ پڑچکی تھی اس لئے حضرت علیؓ کے سامنے اس کو قبول کرلینے کے سوا کوئی اور

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۶۔

چارۂ کار تھا ہی کیا مگر جو اقدام کسی غرض اور ذاتی منفعت کے پیشِ نظر کیا گیا ہو، اس میں اجتماعی خیر و برکت کی توقع کس حد تک ہو سکتی ہے؟ نتیجہ اس کا بھی اسلام کے حق میں نہایت خطرناک نکلا جس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ اب تک مسلمانوں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے حامیوں کی دو جماعتیں تھیں۔ اب خوارج کے نام سے ایک اور فرقہ پیدا ہو گیا جو دونوں کا شدید مخالف اور دشمن تھا۔

اب ذرا تصور کیجیے، حضرت علیؓ کو ناکام کرنے کی ایک تدبیر (تحکیم) نے جو فاتحِ اجنادین عمرو بن العاص کے دماغ نے سوچی تھی کس طرح امت میں چند در چند فتنوں اور رخنوں کے پیدا ہونے کا سبب ہوئی! خوارج کا ظہور بھی اسی کا ایک شاخسانہ تھا۔ اس فرقہ کے عناصر پہلے سے موجود تھے، لیکن ان کو ابھرنے اور منظم ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب ان سب نے ایک مرکز پر جمع ہو کر ایک مستقل اور نہایت خطرناک محاذ قائم کر لیا۔ نہروان کا مقام اس فرقہ کی کوششوں کا خاص آماجگاہ تھا۔ حضرت علیؓ نے خطرہ کا احساس کر کے اس فرقۂ طاغیہ سے قتال کیا اور شکستِ فاش دے کر اس کے کس بل نکال دیے۔

خوارج کی منظم کوششیں پریشان ہو چکی تھیں اب ان کے بچے کھچے لوگوں نے حضرت علیؓ امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تینوں کو قتل کر دینے کی ایک مکمل سازش کی۔ عمرو بن العاص حسنِ اتفاق سے بچ نکلے، امیر معاویہؓ زخمی ہوئے مگر علاج معالجہ کے بعد اچھے ہو گئے۔ اب رہے امیر المومنین حضرت علیؓ وہ دو خارجیوں کے ہاتھوں ایسے شدید زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور آخر کار علم و عمل کا یہ سراجِ منیر اور خلافتِ راشدہ کا آخری کوکبِ رخشاں رمضان ۴۰ھ میں اس عالمِ خاک و باد کو الوداع کہہ گیا۔

حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت پر تبصرہ

حضرت علیؓ کا عہدِ حکومت کچھ زیادہ طویل نہیں ہے اگر اس پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات بآسانی معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کا طرزِ حکومت خلافتِ راشدہ کے منہاج پر تھا، ان کا انتخاب خود ان کی خواہش کے بغیر ہوا، اور ان مہاجرین و انصار نے

انتخاب کیا جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا انتخاب کیا تھا۔ پھر آپ کا عام رویہ صلح جویانہ تھا، کسی کے ساتھ غیر شرعی جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کیا۔ اگرچہ اس وقت بعض منافقوں کی کوششوں سے حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے تھے کہ آپ ان کے سلجھانے میں باحسنِ وجوہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن آپ کے طرزِ حکومت میں ملوکیت کا ذرا شائبہ نہیں تھا، انھوں نے اپنی زندگی اسی تقویٰ طہارت اور سادگی و بے نفسی کے ساتھ بسر کی۔ جو ان کے پیشرو خلفاء کا شعارِ خصوصی تھا، یہاں تک کہ وفات کے وقت آپ کے بعد حضرت حسنؓ کے انتخاب کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے اثبات و نفی میں کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اربابِ رائے پر ہی اس معاملہ کو چھوڑ دیا۔ آپ کے عہدِ حکومت میں ڈھونڈھے سے بھی کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ آپ نے کسی موقع پر بھی "ڈپلومیٹک پالیسی" سے کام لیا ہو، آپ کا ظاہر و باطن ایک تھا جو دل میں ہوتا تھا زبان سے اسی کا اظہار فرماتے تھے اور جو زبان سے کہتے تھے وہی دل میں ہوتا تھا۔ آپ نے منصبِ خلافت سے اپنی ذات کے لئے یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے لئے کوئی ناجائز منفعت کبھی حاصل نہیں کی، آپ پر خشیتِ ربانی اور خوفِ خدا کا پورا غلبہ تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی شک نہیں کہ آپ کی خلافت خلافتِ راشدہ اور اسلام کے "آئیڈیل طرزِ حکومت" کی حامل تھی۔

دو چیزیں بالکل الگ ہیں ایک یہ کہ خلیفۂ وقت خود کن اخلاق و صفات کا حامل ہے اور وہ اپنی حکومت کو کس نظام کے ماتحت چلانا چاہتا ہے اور دوسری یہ کہ اس کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی؟ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ اس بارہ میں حضرت علیؓ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ البتہ ہاں! اس میں شبہ نہیں کہ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت اس اعتبار سے ناکام ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اسلام کے جمہوری نظام کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اس ناکامی کے وجوہ و اسباب مختصراً حسب ذیل ہیں۔

حضرت علیؓ کی ناکامی کے اسباب قبائلی عصبیت کا ظہور

(۱۱) مجھکو صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان اسباب میں سب سے بڑی وجہ قبائلی اور خاندانی عصبیت کا ظہور ہے، یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں ہے کہ یہ عصبیتِ جاہلیہ ہی ایک ایسا زہر ہے جو کسی قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کرکے اس کی تمام اخلاقی اور عملی قوتوں کو کمزور یا ان کو حد سے زیادہ غیر معتدل بنا دیتا ہے۔ جب یہ زہر تدریجی طور پر ترقی کرتے کرتے کسی قوم کے دل اور دماغ پر پوری طرح مسلط ہو جاتا ہے تو اس قوم پر ایک ایسی جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ انسانیت، جمہوریت اور عام رواداری کے تمام مقتضیات کو پسِ پشت ڈال کر وحشیانہ اعمال و افعال میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔ اس میں اپنی برتری اور تفوق کا احساس اس درجہ قوی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس جذبۂ پنہاں کی تسکین کے لئے جائز اور ناجائز کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھتی، اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ کوئی بین الاقوامی اجتماعی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس عصبیت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر نہ پھینک دیا جائے اور خاندانی و قبائلی برتری کے احساس کی جگہ عام مساوات و اخوتِ انسانی کا اذعان و یقین کامل طور پر پیدا نہ کر دیا جائے۔

اسلام میں عصبیتِ جاہلیت کی شدید مذمت

عرب کا ملک اس زہر سے سب سے زیادہ مسموم تھا۔ اس بنا پر یہاں آئے دن قتل و خونریزی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا یہ لوگ غیر عربی قوموں کے ساتھ تو کسی وفاقی نظام کے ماتحت کیا جمع ہوتے خود آپس میں ایک دوسرے کے تعاون و اشتراک سے کوئی قابلِ ذکر عرب اسٹیٹ قائم نہیں کر سکتے تھے۔ پھر جب اسلام آیا تو عقیدۂ توحید کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ یہ لوگ جاہلانہ تعصبات و حمیات سے الگ ہو کر ایک مرکز پر جمع ہو گئے اور جو پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اب شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ عصبیتِ جاہلیہ کی شر انگیزی اور ہیبت کا اندازہ اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا تو چونکہ دنیا کو آپ اپنا ایک آخری پیغام دے رہے تھے اس لئے ظاہر ہے آپ بہت ہی اہم اور ضروری باتوں کا ذکر فرما سکتے تھے آپ نے اس خطبہ میں

جہاں دین کے اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی ان کے ساتھ ہی مسلمانوں کو عصبیت جاہلیت سے بچے رہنے کی تلقین وتاکید فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فان دماءکم واموالکم واعراضکم	پس تحقیق تمہارے خون، مال اور آبروئیں تم پر ایسی ہی
علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا۔	واجب الحرمت ہیں جیسا کہ آج کا دن لائق حرمت ہے

اس کے بعد ارشاد ہوا۔

وستلقون ربکم فیسألکم عن	اور تم عنقریب اپنے رب سے ملوگے تو وہ تم سے
اعمالکم الا فلا ترجعوا بعدی	تمہارے اعمال کی نسبت دریافت کریگا۔ خبردار رہو
ضُلاَّلاً یضرب بعضکم رقاب بعض	کہ میرے بعد تم گمراہ مت ہوجانا کہ تم آپس میں ایک
(بخاری باب حجۃ الوداع)	دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

صحیحین کی ہی ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صریح الفاظ ہیں۔

الا کل شئ من امر الجاھلیۃ	یاد رکھو جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں
تحت قدمی موضوعٌ۔	پاؤں کے نیچے رکھے ہوئے ہیں۔

نسب وحسب کے، رنگ وروپ کے اور دولت وغربت کے جتنے امتیازات تھے اور جو ہمیشہ دنیا میں شر وفساد اور بے چینی وبدامنی کا سبب بنتے ہیں ان سب کو یکقلم ختم کردینے کا حتمی اور قطعی اعلان فرمادیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں یہ بھی ارشاد فرمادیا تھا۔

ان اللہ اذھب عنکم عبیّۃ	بے شبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا حصہ اور آباء
الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء۔ انما	واجداد پر فخر کرنے کی عادت کو دور کردیا ہے، اب دنیا
ھو مومن تقیٌّ وفاجرٌ شقیٌّ	میں صرف دو ہی قسم کے آدمی ہوں گے ایک پرہیزگار
الناس کلھم بنو آدم وآدم	مومن، دوسرے بدنصیب کافر، تمام انسان آدمؑ کے
خلق من تراب۔	بیٹے ہیں اور آدمؑ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار میں جو مواخاۃ کرائی تھی وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کی نسبت جو ارشاد فرمایا تھا۔

سلمانُ منا اھل البیت۔ سلمان تو ہمارے ہی گھر کا ایک فرد ہے۔

تو اس سے بھی غرض یہی تھی کہ مسلمان عربیت اور عجمیت کے امتیاز کو بالکل فراموش کر دیں یہی وجہ ہے کہ چونکہ عصبیتِ جاہلیت انسانوں کے اجتماعی نظام کی تکمیل کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، اس لئے جب اسلام نے اس سنگِ گراں کو دور کر کے عام اخوت اور مساوات کا جذبہ پیدا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کے حق میں اپنی ایک رحمتِ خاص بتا کر اس کا احسان جتایا چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔

اور تم خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کے لطف و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

پھر اس کام کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرماتا ہے کہ محمدؐ! لوگوں کو جوڑ دینا تمہارا کام نہ تھا بلکہ اس میں خود خدائے مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔

وہ وہی خدا ہے جس نے اپنی مدد اور مومنین کے ذریعہ آپ کی تائید کی اور مسلمانوں کے دلوں میں اسی نے باہمی الفت پیدا کی اور اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کر دیتے جو زمین میں ہے تب بھی مسلمانوں کے دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے، لیکن اللہ نے ان کو جوڑ دیا، بے شبہ بڑی طاقت اور حکمت والا ہے۔

مراتبِ ایمانی کا تفاوت

عصبیتِ جاہلیت کی ہلاکت آفرینی اور اسلام میں اس کی شدید مذمت کو معلوم کرنے کے بعد اب ذرا اس پر غور کیجئے کہ قطع نظر اس بحث سے جو ائمۂ محدثین نے الایمان یزید وینقص کے باب میں کی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ایمان جس اذعانی کیفیت کا نام ہے اس میں اشتداد وضعف دونوں کی استعداد ہوتی ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح آجکل مسلمان مسلمان سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ مراتبِ ایمانی میں متفاوت ہوتے ہیں۔ اسی طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اس مرتبہ میں یکساں اور برابر کے درجہ کے نہیں تھے۔ خود اپنی ذاتی استعداد اور فطری صلاحیت، افتادِ طبع اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرفِ صحبت کی زیادتی اور کمی کے باعث ان برگزیدہ ہستیوں میں بھی باہمی فرق وامتیاز تھا۔

امیر معاویہؓ کی مثال

مثلاً حضرت معاویہؓ کو ہی لیجئے۔ ان کی شان میں کسی غیر صحابی کو گفتگو کرنے کی کیا مجال ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ چونکہ فتح مکہ کے بعد اپنے والد ماجد ابوسفیان کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے اس لئے آپ کو خلفاءِ اربعہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں رہنے اور براہِ راست آفتابِ نبوت ورسالت سے کسبِ فیض کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے ایک معزز اور نامور خاندان سے تعلق رکھنے کے باعث آپ میں جو عمدہ صفات تھیں مثلاً سیاسی تدبر، استقامت واستقلال اور شہامت وشجاعت اسلام قبول کرنے کے بعد اُن پر اور جِلا ہو گئی اور ان قوتوں کا مصرف بدل گیا۔

تاہم بنوامیہ اور بنوہاشم میں جو باہمی رقابت مدت سے چلی آرہی تھی امیر معاویہؓ کو اس سے خالی الذہن نہیں کہا جاسکتا۔ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں انھوں نے جو کچھ کیا اس میں دوسرے عوامل واسباب کی طرح اس رجحان کو بھی بڑا دخل ہے۔ ممکن ہے حضرت علیؓ پر بھی یہ شبہ کیا جائے لیکن یہ پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوئی عمل ایسا نہیں کیا جس کو خاندانی رقابت کے زیرِ اثر اور اسلام کی تعلیمات یا اس کی روح کے خلاف کہا جائے اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہؓ بہادری، عالی حوصلگی، دریادلی اور سیاسی تدبر کے لحاظ سے ہم عصروں

میں ممتاز تھے لیکن جب انھوں نے اپنی ان قوتوں سے کفر کے مقابلہ میں کام لیا تو ایسے شاندار کارنامے کئے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو ان پر ناز ہو سکتا ہے، لیکن جب ان کی یہی قوتیں اموی خاندان کی جڑیں مضبوط کرنے میں صرف ہونی شروع ہوئیں تو اس سے ایک ایسے طرزِ حکومت کی تشکیل ہوئی جس کو خلافتِ راشدہ کے منہاج پر نہیں کہا جا سکتا اور رسول صادق و امینؐ کی یہ پیشینگوئی کہ "اے مسلمانو! نبوت کے بعد تم میں خلافت علیٰ منہاج النبوت ہوگی اور جب تک خدا چاہیگا وہ رہے گی، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے گا اور اس کے بعد "ملکِ عاض" (جابرانہ سلطنت) کا رواج ہوگا" (مسند امام احمد بن حنبل) پوری ہوئی۔

عجمی مسلمانوں کے اثرات

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی فتوحات کے باعث عجمی قوموں کے جو لوگ مسلمان ہو ہو کر عرب مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے تھے وہ چونکہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور مسلمانوں کی اندرونی کشمکش کے باعث ان کو صحیح اسلامی تربیت کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا، اس بنا پر اسلام کی حقیقی روح ان کے دل و دماغ میں سرایت نہیں کر سکی تھی اور عہد جاہلیت کے اطوار و طرق کا کچھ کچھ اثر ابھی ان کی زندگیوں میں محسوس ہوتا تھا۔ اِدھر سبائیوں کا گروہ دیندار مسلمانوں کے بھیس میں برابر اپنی ذلیل تگ و دو میں مصروف تھا اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو مسموم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور انبیاء کرام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہوتا۔ ان دونوں طبقوں کے ساتھ میل جول کا یہ اثر ہوا کہ چند مواقع پر بڑے بڑے راسخ العقیدہ مسلمانوں سے بھی شدید لغزشیں سرزد ہو گئیں اور وہ ان خطرات کا احساس نہیں کر سکے جو اُن کے طرزِ عمل سے پیدا ہو سکتے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اس کا احساس پہلے سے تھا اس بنا پر وہ مختلف عُمّال و حکام کو وقتاً فوقتاً ایسی ہدایات دیتے رہتے تھے جن پر عمل پیرا ہونے سے اسلام اپنی مخصوص سادہ فطرت پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "اے کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کی دیوار حائل ہوتی"۔

اکابر صحابہؓ کی گوشہ نشینی

اِن وجوہ کی بِنا پر مسلمانوں میں اختلاف و انشقاق کا جو فتنہ برپا ہوا اس کو زیادہ اُبھرنے اور پھیلنے کا موقع اس لئے بھی ملا کہ بعض ارباب رسوخ و اثر صحابہ کرام جو عہدِ نبوت اور اس کے بعد خلفاءِ ثلاثہ کے مبارک زمانوں میں عملی طور پر بڑے شاندار کارنامے انجام دے چکے تھے، وہ ان شرور و فتن کو دیکھکر گوشہ نشین ہو گئے تھے گویا پبلک زندگی سے انہوں نے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا اور اب میدان پر صرف ان لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنے ہاتھ میں تھوڑی بہت طاقت رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی نسبت مشہور ہے کہ جب واقعۂ تحکیم میں انھوں نے عمرو بن العاصؓ کا طرزِ عمل دیکھا تو انھیں اس کا اتنا شدید صدمہ اور رنج ہوا کہ وہ تمام سیاسی کاموں سے کنارہ کش ہو کر ایک گاؤں میں جا بسے اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حضرت عائشہؓ جنگِ جمل کے سلسلہ میں مدینہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہونے لگیں تو اہلِ کوفہ کو اس کا اس درجہ رنج ہوا کہ وہ زار و قطار روتے اور آہ و بکا کرتے تھے، یہاں تک کہ اس دن کا نام ہی یوم النحیب (روزِ گریہ) پڑ گیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ایک جلیل القدر صحابی تھے وہ ام المومنین کی اس دعوت پر شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے الگ تھلگ رہنے کو ہی خیر سمجھا۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ حضرت عائشہؓ کے ہمراہ جانے کا قصد رکھتی تھیں لیکن ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کو سمجھایا اور قسم دے کر انہیں بصرہ جانے سے روکا۔

غرض یہ ہے کہ یہ حضرات اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اب اسلام میں فتنہ کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے اس کا درد وہ اپنے دل میں محسوس کرتے اور اس پر اشکباری کرتے تھے پھر زبان سے وعظ و نصیحت میں اور ارشاد و تلقین میں بھی انھوں نے کوئی فروگذاشت نہیں کی، لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ وہ حضرات تھے جو اس وقت سیاسی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ مختلف ادارے اور عہدے دوسرے لوگوں کے قبضہ میں تھے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ارباب خیر و تقویٰ کی آواز صدا بصحرا یا نقار خانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی اور پھر وہ سب کچھ ہوا جو نہ ہونا چاہیئے تھا۔

لمثل ھذا یذوب القلب من کمدٍ ان کان فی القلب اسلامٌ و ایمانٌ

جیساکہ شروع میں عرض کیا گیا ہے، یہ واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ امت کا زوال اس وقت شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ارشادِ نبوی کے مطابق یہ زمانہ خیر القرون تھا۔ بڑی بات تو یہ تھی کہ اکابر صحابہؓ موجود تھے جنھوں نے ایک عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ مبارکہ کا شرف حاصل کیا تھا۔

اس وقت سیاسی اعتبار سے ان کا اثر خواہ کچھ زیادہ نمایاں نہ ہو لیکن وعظ و نصیحت، درس و تبلیغ اور ارشاد و ہدایت کا چشمۂ فیض ان بزرگوں کے نفوس قدسیہ کی بدولت برابر جاری تھا اور اس کا اثر یہ تھا کہ انفرادی زندگی میں کسی کو ارتکابِ منہیات و معصیات کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، کسی گورنر یا حاکم سے کوئی ظالمانہ فعل سرزد ہوتا بھی تھا تو وہ اس کے لئے قرآن و حدیث سے ہی کوئی سندِ اعتذار تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا، یہ حضرات آپس میں کیسے ہی لڑتے ہوں لیکن کفر کے مقابلے میں اپنے سب اختلافات بھول کر ایک ہو جاتے تھے، اس بنا پر اس وقت بھی ان کی ترقی اور فتوحات کا قدم رکا نہیں بلکہ وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ دینِ قیم کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بنو امیّہ کا عہد

سلکۃ میں خلافتِ راشدہ کے بعد امیرِ معاویہؓ کے ہاتھ پر عام بیعت ہوئی تو اس دن سے بنو امیہ کا عہدِ حکومت شروع ہوا، یہ عہد اپنے دامن میں امتِ مرحومہ کے عروج و زوال کی متعدد داستانیں رکھتا ہے، امیرِ معاویہؓ اس خاندان کے پہلے خلیفہ تھے، آپ کی خلافت سلکۃ سے سنۃ۶۰ھ تک یعنی تقریباً بیس سال رہی جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے آپ کی خلافت نہ خلافتِ راشدہ تھی اور نہ آپ خلیفۂ راشد تھے، لیکن اس کے باوجود تھوڑا بہت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھائے ہوئے تھے، صحابی تھے اور کاتبِ وحی بھی رہ چکے تھے اس لئے متعدد غلطیوں کے باوجود آپ کا دل خشیتِ ربانی اور اسلام کی ترقی و عروج کی حقیقی تڑپ سے خالی نہ تھا۔

چنانچہ طبری میں ہے کہ ایک مرتبہ شام کے کسی مقام پر ٹھیرے ہوئے تھے، سامنے سے آپ کے جاہ و حشم کا سامان گھوڑے، کنیزکیں اور گاڑیاں گذریں تو آپ انھیں دیکھکر شرمسار ہوگئے اور ابن مسعدۃ سے فرمانے لگے جو اس وقت آپ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے "اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے نہ انھوں نے دنیا کو چاہا اور نہ دنیا نے ان کا ارادہ کیا، عمرؓ کو دنیا نے تو بہت چاہا مگر خود انھوں نے اس کا کبھی ارادہ نہیں فرمایا۔ رہے عثمانؓ تو ان کو دنیا سے کچھ ملا اور دنیا نے ان سے بھی کچھ حاصل کیا۔ ان کے بعد ہم تو دنیا میں لت پت ہی ہو گئے" [۱]

اس ذاتی خوبی کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ نے اس زمانہ کے نازک اور پیچیدہ حالات میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو مضبوط اور محفوظ بنانے میں جس سیاسی تدبر، دوراندیشی اور موقع شناسی کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے فضائل میں سرِ فہرست بننے کے لائق ہے۔

---

[۱] طبری ج ۶ ص ۱۸۶۔

شمالی افریقہ کا بڑا حصہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ہی فتح ہو چکا تھا۔ امیر معاویہؓ نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا، یہاں کے بربریوں نے سرکش ہو کر ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ امیر معاویہؓ نے اس بغاوت کا قلع قمع کر کے مسلمانوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔ شام اور مصر بحرِ روم کی وجہ سے رومیوں کے حملے سے مامون نہیں تھے، امیرِ باتدبیر نے اس ملک کی سرحدوں پر چھاؤنیاں قائم کیں اور اپنے بحری بیڑہ کے ذریعہ رومیوں کو بحرِ روم میں شکستِ فاش دے کر اور بعض اہم جزیروں قبرص اور روڈس اور اروادپر قبضہ کرنے کے بعد یہاں اپنی چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے جس سے مصر اور شام کے علاقے دشمن کے حملوں سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئے۔ جزیرۂ کریٹ اور سسلی پر بھی حملہ کیا گیا مگر اس وقت تک فتح حاصل نہ ہو سکی پھر خود اندرونِ ملک جو سیاسی پارٹیاں تھیں اور اپنی انقلابی کوششوں کے ذریعہ اسلامی مرکزیت کو تباہ و برباد کرنا چاہتی تھیں ان کا استیصال کیا۔ ان فتوحات کے علاوہ بہت سے تعمیری کام بھی آپ نے ایسے کئے جن کی اس وقت شدید ضرورت تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں جبر و تشدد کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں لیکن ان کا یہ تشدد اس جراح کے تشدد کے مماثل ہے جو کسی عضوِ فاسد کو عملِ جراحی کے ذریعہ کاٹتا چھانٹتا ہے تو اس سے دوسرے اعضاء اس عضوِ بریدہ کے متعدی مرض سے محفوظ ہو جاتے ہیں، لیکن ساتھ ہی عملِ جراحی کے باعث تکلیف و اذیت اعضاءِ فاسدہ و صالحہ سب کو ہی محسوس ہوتی ہے جو شخص اس دور کے حالات پر انصاف کی نگاہ سے غور کرے گا اس کو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ ان حالات پر قابو پانے کے لئے ایسے ہی جبر و تشدد کی ضرورت تھی جو حضرت امیر معاویہؓ نے اختیار کیا۔ اس وقت اسلام کی خدمت کا سب سے بڑا اقتضا یہ تھا کہ جس طرح بھی ہوتا اسلام کی سیاسی طاقت کو سنبھال لیا جاتا اور اس کو اندرونی اور بیرونی خطروں سے محفوظ و مامون کر دیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے امیر معاویہؓ کے سامنے یہی چیز تھی، چنانچہ انھوں نے بہت سی ناگوار باتیں بھی برداشت کیں مگر اس مقصد کی تکمیل میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ اسلام جس رفتار سے

پھیل رہا تھا اور جس طرح اس کی فتوحات کا دامن وسیع ہوتا جا رہا تھا، اس میں کمی کیا زیادتی ہی ہوتی رہی۔ اور سطحی نظر سے یہ محسوس نہیں ہو سکتا کہ اس وقت اسلام روبہ انحطاط تھا یا اس کی ترقی میں جمود پیدا ہو گیا تھا۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ منہاج السنہ جلد دوم میں فرماتے ہیں۔

"خلافت جب بہت زیادہ ضعیف ہو گئی تو وہ ملوکیت کی شکل میں منتقل ہو گئی، حضرت معاویہؓ نے اس کو رحمت اور حلم سے قائم رکھا، اسلام میں کوئی بادشاہ حضرت معاویہؓ سے بہتر نہیں پیدا ہوا، وہ بے شبہ تمام ملوکِ اسلام میں سب سے اچھے تھے اور ان کی سیرت بعد میں آنے والے سلاطین کی سیرت سے کہیں زیادہ پسندیدہ تھی"

ملوکیت کے اثرات تاہم خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ امیر معاویہؓ کے طرزِ عمل سے جس طریقِ حکومت کی تشکیل ہوئی اس سے اسلام کے اجتماعی نظام کی روح کو شدید صدمہ پہنچا۔ حکومت بجائے جمہوری کے شخصی ہو گئی اور اسلام کے جو مصالح عامہ اس کے صالح ترین نظام سے وابستہ تھے اب ان کا تعلق بادشاہ کی تہاذات اور اس کی شخصیت سے ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ چونکہ ذاتی طور پر فضائل مآب تھے اس لئے طریقِ حکومت کا یہ تغیر اول اول لوگوں کو محسوس نہیں ہوا۔ لیکن جو اربابِ نظر تھے وہ اس چیز کا کامل احساس رکھتے تھے، زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور کہنا بھی نہیں چاہئے تھا کیونکہ اس کے یہ معنی تھے کہ امت کو پھر ایک اور فتنہ میں مبتلا کر دیا جائے لیکن دل میں وہ اس کا درد رکھتے تھے اور موقع ہوتا تو کبھی کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی کر گذرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ فاتح قادسیہ سعد بن ابی وقاصؓ امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کو اس طرح سلام کیا جس طرح عجمی بادشاہوں کو کیا جاتا ہے۔ امیر معاویہؓ یہ دیکھکر ہنسے اور بولے "اگر تم مجھکو امیر المومنین کہدیتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا" فاتحِ قادسیہ نے جواب دیا "جس طریق سے آپ نے خلافت حاصل کی ہے اگر مجھکو ملتی تو میں ہرگز اس کو قبول نہ کرتا۔

بنوامیہ کا سب سے بڑا مخالف خاندان بنوہاشم تھا۔ لیکن امیر معاویہؓ نے ذاتی طور پر حلیم و بردبار ہونے کے باعث سریرِ خلافت پر متمکن ہو جانے کے بعد اس خاندان کے ساتھ جبر و تشدد

کا معاملہ نہیں کیا، بلکہ عطیات اور وظائف کے ذریعہ ان کی دلجوئی ہی کرتے رہے، تاہم طرزِ حکومت میں ملوکیت کی شان نمایاں تھی اور اس بنا پر اندازِ فکر اور طرزِ خیال میں جو تبدیلی پیدا ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس ایک معمولی واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ گورنر کوفہ زیاد، عرب کی ایک فاحشہ عورت جس کا نام سُمَیّہ تھا اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور عرب کے رواج کے مطابق زیاد بن ابیہ کہلاتا تھا، یہ کنیت اس کے دامنِ شہرت پر ایک ایسا بدنما داغ تھا کہ "پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے" والا مضمون تھا۔

امیر معاویہؓ زیاد کی قابلیتوں سے جو فائدہ اٹھانا چاہتے تھے زیاد کی یہ بدنامی اس راہ میں سنگِ گراں کا کام کرتی تھی اس لئے انھوں نے حکمِ نبوی "الولد للفراش وللعاهر الحجر" بچہ کا نسب جائز نکاح سے ثابت ہوتا ہے اور زانی کے لئے تو سنگساری ہے" کا خیال نہ کرتے ہوئے اعلانِ عام کرادیا کہ آئندہ سے زیاد کو بجائے ابنِ ابیہ کہنے کے ابنِ ابی سفیان کہکر پکارا جائے۔ فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ ایک مرتبہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے زیاد کو خط لکھا اور اس میں انھوں نے امیر معاویہؓ کے حکم کے مطابق زیاد بن ابی سفیان لکھا تو اس سے زیاد کو اتنی خوشی ہوئی کہ وہ لوگوں کو ام المومنین کا یہ خط دکھاتا پھرتا تھا اور مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔"

یزید کے لئے بیعت لینا یہ واقعہ اپنی حیثیت میں معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کے اجتماعی نظام کو اس کی اصل شکل وصورت سے منتقل کر کے کسی دوسری اور غیر واقعی شکل سے متشکل کر دینے کے باعث تدریجی طور پر ذہنیت میں اور طرزِ فکر وخیال میں کیسی کچھ تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ کس طرح بنیادوں کو ہی متزلزل کر دینے کا باعث بن سکتی ہیں، چنانچہ اس طرزِ حکومت کا سب سے زیادہ المناک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے خلافت کے تصور سے ہی محروم ہوگئے۔ جمہور کا حق انتخاب ارباب حل وعقد کی اس باب میں مشاورت اور اس خدمتِ جلیلہ کے لئے امت کے کسی صالح اور موزوں ترین فرد کی تلاش وجستجو، یہ سب باتیں ایسی خواب ونسیاں ہوگئیں کہ آج تک اسلام کی چشمِ تمنا پھر اسی نظارۂ روح پرور کی بازدید کے

انتظار میں نرگس کی طرح وا ہے۔ مگر وہ منظر لوٹ کر نہیں آتا، اور سالوں بلکہ قرنوں کے ایسے تاریک پردے درمیان میں حائل ہو گئے ہیں کہ نگاہِ اشتیاق دورہ کے ماضی کے ان نقوشِ جمال وعظمت کی طرف اٹھتی ہے مگر دیکھ نہیں سکتی۔

امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعتِ خلافت لیکر اس طرزِ حکومت کو ایسا استوار کر دیا کہ آج تک اس کی بنیادیں قائم ہیں۔ اس وقت صحابہ میں اور ان کے علاوہ تابعین میں بعض ایسے افراد موجود تھے کہ اگر حضرت معاویہؓ ان میں سے حضرت عمرؓ کی طرح چند حضرات کا یا حضرت ابوبکرؓ کی طرح کسی ایک شخص کا انتخاب فرما کر بطورِ وصیت ان کے حق میں خلافت کی سفارش کر جاتے تو بے شبہ وہ فساد پیدا نہ ہوتا جو یزید کو خلیفہ بنانے سے پیدا ہوا اور جس کے باعث بادشاہت محض ایک خاندانی ورثہ ہو کر رہ گئی، خلیفہ کے لفظ میں دینی اقتدار کا مفہوم بھی شامل تھا اس لئے بنوامیہ نے اس لقب کو ترک نہیں کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلافت تو اب ختم ہو چکی تھی اور یہ جو کچھ بھی تھا ایک فریب اصطلاح سے زیادہ اور کوئی وقعت نہیں رکھتا تھا۔

بنوامیہ کے عہد پر تبصرہ

امیر معاویہؓ نے جس طرح حکومت بجبر حاصل کی تھی اسی طرح یزید کی بیعتِ خلافت بھی بجبر لی گئی، جو حضرات دل سے اس کو پسند نہیں کرتے تھے ان کو بھی بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دینا ہی پڑا، ملوکیت یا شخصی حکومت کا سب سے زیادہ برا اثر یہ ہوتا ہے کہ عوام میں حریتِ فکر اور آزادیٔ بیان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور قہر و غلبہ اور استبداد و تشدد کی فراوانی ہو جاتی ہے، بنوامیہ میں ملوکیت کے یہ تمام جراثیم پائے جاتے تھے۔

امیر معاویہؓ کے بعد ان کے بیٹے یزید کے عہدِ حکومت میں ہی جو کچھ ہوا دنیا اس سے بےخبر نہیں ہے۔ جگر گوشۂ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قربانی سے اس استبداد کو ختم کرنا چاہا لیکن ختم نہیں ہوا۔ عبداللہ بن زبیرؓ ایسے مقدس صحابی نے اپنے خون سے قبائے اسلام کے ان دھبوں کو دھونا چاہا مگر نہ دھل سکے۔ اب سلطنت کا استحقاق صرف اس شخص کے لئے رہ گیا جو بجبر اپنے لئے حکومت کا

تخت حاصل کر سکے، خواہ وہ اعمال وافعال کے لحاظ سے کیسا ہی نااہل اور حکومت کے لئے ناموزوں ہو۔ یزید سے لیکر آخری اموی خلیفہ مروان تک بجز دو ایک کے سب اموی خلفاء میں یہ بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ خلافِ طبع بات پر بیجا تشدد اور ناروا جبر سے کام لیتے تھے۔ ہشام بن عبدالملک نسبتاً بہتر تھا اس سے پہلے خلفاء بنی امیہ کے زمانوں میں منبروں پر علی الاعلان حضرت علیؓ پر جو سب وشتم کیا جاتا تھا اس نے اسے بند بھی کرا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عصبیت کا یہ حال تھا کہ خاندانِ علیؓ میں سے کسی ایک کی تعریف نہیں سن سکتا تھا۔

چنانچہ ایک مرتبہ امام زین العابدینؒ (امام حسینؓ کے صاحبزادہ) طوافِ کعبہ کر رہے تھے۔ جب وہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھے تو فرطِ ادب و احترام سے لوگوں کا ہجوم چھٹ گیا لیکن جب ہشام بن عبدالملک بوسہ کے لئے آگے بڑھا تو مجمع میں سے ایک شخص نے بھی اس کے لئے راستہ نہیں چھوڑا۔ یہ دیکھکر ایک شامی نے امام زین العابدینؒ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا من ھذا یہ کون ہیں؟ ہشام امام سے اچھی طرح واقف تھا مگر اس وقت ازراہِ تجاہلِ عارفانہ بولا "میں نہیں جانتا" عربی کا مشہور شاعر فرزدق اس وقت موجود تھا۔ ہشام کی زبان سے امام عالی مقام کی شان میں یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا اور اس نے برجستہ ایک قصیدہ پڑھا۔ یہ قصیدہ جو کم وبیش عربی ادب و تاریخ کی تمام کتابوں میں مذکور ہے، خلوص و محبتِ اہلِ بیت کے ایسے پاکیزہ جذبات سے پُر ہے کہ اربابِ ذوق اس کو پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔[1]

---

[1] اس قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے۔

ھذا سلیل حسین وابن فاطمۃ — بنت الرسول من انجابت بہ الظلم

ترجمہ:- یہ (امام زین العابدینؒ) حسینؓ کے فرزند دلبند ہیں اور فاطمہؓ کے لختِ جگر۔ کون فاطمہؓ؟ جو رسول اللہؐ کی دخترِ نیک اختر تھیں جن کے ذریعہ تاریکیاں چھٹ گئیں۔

قصیدہ بہت طویل ہے لیکن اس کے بعض چیدہ چیدہ اشعار آپ بھی سن لیں تو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) ھٰذا الذی تعرف البطحاءُ وطأتہٗ — والبیت یعرفہٗ والحلّ والحرمُ

(۲) اذا راٰتہٗ قریش قال قائلھم — الیٰ مکارمِ ھذا ینتھی الکرمُ

(ابن خلکان ج۲ ص۳۲۵ مطبوعہ مصر)

یہ ظاہر ہے کہ فرزدق نے اس قصیدہ میں بنوامیہ پر کوئی طنز نہیں کیا اور نہ انھیں کچھ برا بھلا کہا تھا بلکہ شاعرانہ لطافتوں کے پیرایہ میں صرف اس قلبی عقیدت وارادت کا اظہار کیا تھا جو بحیثیت مسلمان ہونے کے ہرایک کو اس خاندانِ والاگہر کے ساتھ ہونی چاہئے پھر بھی ہشام اس کو برداشت

(۳) هذا ابنُ خيرِ عبادِ الله كلهم — هذا التقي النقي الطاهرُ العَلَمُ

(۴) يكادُ يمسكُهُ عِرفانَ راحتهِ — ركنُ الحطيم اذا ما جاء يستلمُ

(۵) يبينُ نورَ الضُّحى من نورِ غرّتِهِ — كالشمس ينجاب من اشراقها القتم

(۶) مُشتقّةٌ مِنْ رسول اللهِ نبعتُهُ — طابت عناصرهٗ والخيم والشيمُ

(۷) هوابن فاطمةَ ان كنتَ جاهِلَهٗ — بجدّهٖ انبياءُ اللهِ قد ختموا

(۸) وليس قولك من هذا بضائرِهٖ — العرب تعرف من انكرت والعجمُ

(۹) من معشرٍ حبُّهُمْ دينٌ وبغضهُمْ — كفرٌ وقربهُمُ منجىً ومُعتصمُ

(۱۰) ان عُدَّ اهلُ التقى كانوا ائمتهم — او قيل من خيرُ اهل الارض قيل هُمُ

(۱۱) لا يقبض العُدمُ بسطًا من اكفهم — سيان ذلك ان اثروا وان عدموا

(۱۲) من يعرفِ اللهَ يعرفْ اوّليّةَ ذا — والدين من بيتِ هذا نالهُ الأُمَمُ

(۱۳) ما قال لا قطُّ الّا فی تشهّدِهٖ — لولا التشهد كانت لاؤهٗ نعَمُ

ترجمہ:۔ (۱) یہ تو وہ ہیں جن کے قدموں کی آہٹ کو بطحا کی زمین بھی پہچانتی اور بیت اللہ اور حرم وغیر حرم سب اس سے آشنا ہیں۔

(۲) اہلِ قریش انھیں دیکھتے ہیں تو ان کا کہنے والا پکار اٹھتا ہے انھیں کے مکارمِ اخلاق پر تو کرم کی انتہا ہوگئی ہے۔

(۳) یہ اللہ کے بندوں میں جو سب سے بہتر بندہ تھا اس کے نورِ نظر ہیں، پاک وصاف، متقی پرہیزگار اور سردار ہیں۔

(۴) یہ جب بیت اللہ کا طواف کرتے کرتے رکنِ حطیم کا بوسہ دینے کے لئے اپنے ہاتھ دراز کرتے ہیں تو چونکہ رکنِ حطیم بھی ان کی ہتھیلی کو پہچانتا ہے اس لئے وہ ان کے ہاتھوں کو پکڑنے لگتا ہے۔

(۵) ان کی پیشانی کا نور چاشت کے وقت کے خورشیدِ درخشاں کی طرح چمکتا ہو جس کے چمکنے سے تاریک غبار پھٹ جاتا ہے۔

(۶) ان کا مایۂ خمیر رسول اللہؐ کے مایۂ خمیر سے تیار ہوا ہے اس بنا پر ان کے عناصر وجود پاک وصاف ہیں اور ان کے خصائل وشمائل بھی۔

(۷) یہ فاطمہؓ کے لال ہیں اگر تو ان کو نہیں جانتا تو نہ جانے۔ انھیں کے نانا پر تو اللہ کے پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

(باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ ہو)

نہ کرسکا بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے اس "جرم" کی پاداش میں فرزدق کو قید کردیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بیت المالِ خلافت سے فرزدق کو جو وظیفہ ملتا تھا اسے بند کردیا تھا۔ [۱۵]

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف خلفاءِ بنی امیہ خاندانِ نبوت کے ساتھ تعصب عناد کا یہ معاملہ کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کی فراخدلی اور وسیع المشربی کا یہ عالم ہے کہ اخطل جیسے عیسوی شعراء بے تکلف ان کے دربار میں آتے جاتے ہیں، خلفاء کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور بعض غیر اسلامی حرکتیں جو ان شعراء سے سرزد ہوتی ہیں ان کو بھی انگیز کرلیا جاتا ہے۔ اس سے یہ صاف خیال ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد سے ہی ملوکیت کے تباہ کن اثرات ظاہر ہونے لگے تھے یعنی خلفاء کا اصل مقصد اپنے اور اپنے خاندان کی وجاہت و برتری کو قائم رکھنا تھا اور ذاتی مفاد کو قومی و جماعتی مفاد پر مقدم رکھا جاتا تھا۔

عمال کا ظلم | خلفاء میں قہر و استبداد اور غرض پرستی کا غلبہ ہوتا ہے تو عمال اور حکومت کے مختلف صیغوں اور اداروں کے ذمہ دار افراد میں بھی طرح طرح کی بے عنوانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، چنانچہ بنو امیہ کے عمال نے بھی اسلامی روح کو یکسر فراموش کرکے ناجائز کارروائیوں اور انتہا درجہ کے

(۸) تیرا یہ پوچھنا کہ "یہ کون ہیں" انھیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے جسے تو نہیں جانتا تمام عرب اور عجم اسے پہچانتا ہے۔

(۹) یہ اس خاندانِ والا شان میں سے ہیں جس کی محبت عین دین ہے اور جس سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس کا قرب نجات اور پناہ کا مستقر ہے۔

(۱۰) اگر اہلِ تقویٰ کا شمار کیا جائے تو یہ حضرات ان سب کے امام قرار پائیں گے یا اگر پوچھا جائے کہ تمام اہلِ زمین میں سب سے بہتر کون ہیں؟ تو جواب ملیگا "یہی"۔

(۱۱) تنگدستی بھی ان کے ہاتھوں کی فراخی اور کشادگی کے لئے مانع نہیں ہوتی۔ ان کے لئے دونوں حالتیں برابر ہیں خواہ یہ صاحبِ ثروت ہوں یا نہ ہو۔

(۱۲) جو شخص اللہ کو جانتا ہے وہ ان کی (امام زین العابدینؒ) اولیت و فضیلت کو بھی پہچانتا ہے (کیونکہ) قوموں نے دینِ حق کی دولت انھیں کے کاشانۂ قدس سے تو پائی ہے۔

(۱۳) انھوں نے (فرطِ جود و سخا سے) سوائے تشہد کے کبھی لا (نہیں) کہا۔ اگر تشہد کا معاملہ نہ ہوتا تو ان کا لا بھی نعم (ہاں) ہوتا۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا) [۱۵] شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۴۲۔

ظلم وستم پر کمر باندھ رکھی تھی، زیاد اور اس کے بیٹے عبید اللہ نے مدینہ اور عراق میں جو کچھ کیا اس کو سن کر بھی بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ حجاج نے مسعودی کی روایت کے مطابق سوا لاکھ کے قریب بے گناہوں کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپایا۔ مگر اس کے باوجود عبد الملک بن مروان ایسا بیدار مغز اموی خلیفہ بھی حجاج کے ساتھ اغماض و سامحت کا معاملہ کرتا اور اسے اپنی خلافت کے استحکام کا ایک بڑا ذریعہ سمجھتا رہا۔

بنوامیہ کا تعصب بنوامیہ کی حکومت کا ایک بڑا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ ان لوگوں میں قبائلی عصبیت کے علاوہ عربیت اور عجمیت کا تعصب بھی پایا جاتا تھا۔ عجم کے جو لوگ مسلمان ہو ہو کر عربوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے تھے بنوامیہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھے جاتے تھے اور ان پر بعض اوقات ناروا مظالم کئے جاتے تھے، حجاج کے متعلق مشہور روایت ہے کہ اس نے موالی (نو مسلم عجمیوں) کی ایک کثیر جماعت کو جلاوطن کر کے اطراف و اکناف کے دیہاتوں میں محض اس لئے منتشر کر دیا تھا کہ یہ لوگ عربوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے باعث فصیح و بلیغ عربی بولنے پر قادر نہ ہو سکیں۔ اس بیجا اور غیر اسلامی تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ عجمیوں نے حکومت کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور یہیں سے ایک عظیم الشان تحریکِ شعوبیت کا آغاز ہوا، جس نے آگے چل کر بعض اچھے اچھے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بیت المال کی بدنظمی خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں بیت المال پوری قوم کی ایک امانت تھی اس کے ایک ایک پیسہ کو احتیاط سے خرچ کیا جاتا تھا۔ خلفاء اس میں سے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورتوں کے لئے کچھ لیتے بھی تھے تو صرف اتنا ہی جس سے معمولی طریقہ پر گذر بسر ہو سکے، لیکن اس کے برعکس خلفاءِ بنوامیہ مسلمانوں کی اس امانت کو اپنی ذاتی اور شخصی ملکیت سمجھتے تھے، اُسے جس طرح چاہتے خرچ کرتے تھے، خود شاہانِ عجم کی سی شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرتے اور اس کے لئے جتنے اخراجات کی ضرورت ہوتی اُنھیں بیت المال سے ہی پورا کرتے تھے، اپنے مسرفانہ اخراجات کے علاوہ عمال کو بھی بیش قرار تنخواہیں دی جاتی تھیں اور وہ بھی خلفاء کی طرح پُرشکوہ اندازِ معاشرت رکھتے تھے، اس کے

علاوہ جو لوگ بنو امیہ کا پروپیگنڈہ کرتے تھے، یا جن سے حکومت کو کسی قسم کی قوت بہم پہنچنے کا احتمال تھا ان پہ قوم کی امانت بے دریغ خرچ ہوتی تھی اور ان کے خلاف جو لوگ حریتِ فکر و رائے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے، باوجود استحقاق کے ان کے مقررہ وظائف بند کر دیئے جاتے تھے، چنانچہ یزید نے اہلِ حرمین کے وظائف بند کر دیئے تھے، انصار کی مقررہ تنخواہیں محض اس بنا پر کئی بار روک دی گئیں کہ وہ اہلِ بیت کی حمایت کرتے ہیں۔

ان فضول خرچیوں اور بے اعتدالیوں کے باعث بیت المال پر ناجائز مصارف کا بار پڑتا تھا تو اس کو پورا کرنے کے لئے خلفاء خود اور ان کے عمال ٹیکسوں اور جزیہ و خراج کے وصول کرنے میں ناروا تشدد سے کام لیتے تھے اور اس میں جائز و ناجائز کا فرق و امتیاز بھی مرعی نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ بعض صوبوں میں ان لوگوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا جو ذمی سے مسلمان ہو گئے تھے، عمال کے اس جبر و تشدد کا جس کی بنیاد ہوسِ زر پہ قائم تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ افریقہ اور خراسان کے عام نو مسلموں میں اسلام کی طرف سے بددلی پیدا ہو گئی۔

افتراق و تشتت جس نظامِ حکومت کی بنیاد ذاتی منفعت طلبی پر ہو اس سے بمشکل یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی معاملہ میں بھی جماعتی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے کسی فائدہ کو قربان کر سکتا ہے بنو امیہ سیاست اور طرزِ جہاں بانی میں مشہور ہیں، کیا اچھا ہوتا اگر ان کی یہ سیاسی قابلیتیں اسلامی طرزِ حکمرانی کو بحال کرنے میں صرف ہوتیں مگر یہاں معاملہ برعکس نظر آتا ہے، وہ بہر نہج اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ حکومت ان کے خاندان سے منتقل ہو کر کسی اور خاندان میں نہ چلی جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کو اس بات میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا کہ عرب کے مختلف قبائل میں عہدِ جاہلیت کے مٹے ہوئے تعصبات کو ابھار کر ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ کے خلاف لڑائیں اور اس طرح مسلمانوں میں وحدتِ اجتماعی باقی نہ رہنے دیں۔ چنانچہ عرب میں جو مضری اور یمنی قبائل آباد تھے ان میں شروع سے رقابت چلی آرہی تھی۔ اسلام نے ان کو ایک ہی رشتۂ توحید میں منسلک کر کے بھائی بھائی کر دیا تھا۔ مگر اب بنو امیہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ان

خاکِ نسیاں میں دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر اپنے دامنِ افساد سے ہوا دیکر مشتعل کر دیا اور اس کا نتیجہ افسوسناک کشت وخونریزی کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں بعض کبارِ تابعین بھی کام آگئے۔

ان واقعات وحالات سے یہ امر محتاجِ نظر نہیں رہتا کہ بنوامیہ کی حکومت شخصی اور استبدادی حکومت تھی اور اس میں اس روح کا فقدان تھا جو اسلام کے نظامِ اجتماعی کی بنیاد و اساس ہے، تاہم ناانصافی ہوگی اگر اس عہد کے تاریک پہلو کے ساتھ اس کے بعض روشن پہلوؤں پر بھی روشنی نہ ڈالی جائے۔

عیب می جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

صحتِ عقائد بنوامیہ کے عہدِ حکومت کا ایک روشن کارنامہ یہ ہے کہ اس خاندان کے افراد ذاتی طور پر خواہ کیسے ہی رہے ہوں لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے تمام خلفاء صحیح العقیدہ تھے اور اس بنا پر انھوں نے فِرَقِ باطلہ کے قلع قمع کرنے میں جس غیر معمولی بہادری اور حزم ودوراندیشی کا ثبوت دیا ہے وہ بے شبہ مستحقِ تحسین ہے۔"

عبدالملک بن مروان اس سلسلہ میں عبدالملک بن مروان کا نام سرفہرست ہونا چاہئے، عبدالملک ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک حکمراں رہا۔ اس کے بست ویک سالہ دورِ حکومت کی تاریخ فتنوں اور شورشوں سے پُر ہے۔

خوارج کا استیصال نہروان میں شکست کھانے کے بعد خوارج نے پھر فارس اور عراق میں اپنی تنظیم شروع کر دی تھی اور اس زور سے اپنے عقائد باطلہ کی تبلیغ شروع کی تھی کہ بعض اچھے اچھے راسخ العقیدہ مسلمان بھی ان کے ہمدرد بن چلے تھے اس بنا پر یہ فرقۂ ضالہ اسلام کے لئے ایک نہایت خطرناک صورت اختیار کر چکا تھا عبدالملک بن مروان نہایت استقلال و پامردی کے ساتھ ایک عرصہ تک ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور آخر کار ان کا سارا زور ختم کر کے دم لیا۔

فتنۂ مختار اس کے علاوہ مختار بن ابی عبید ثقفی کا فتنہ بھی خوارج کے شر سے کسی طرح کم ہلاکت انگیز نہ تھا اس نے مختلف پارٹیوں کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر بنوامیہ کی حکومت کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکدینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مختار خود نہایت بیہودہ عقائد کا انسان تھا۔ اگر اس وقت اس کو عرب میں سیاسی

اقتدار قائم کرنے کا موقع مل جاتا تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آج امتِ مرحومہ کی اکثریت گمراہی کے کس ورطۂ عظیم میں مبتلا ہوتی۔

توابین پھر توابین کا گروہ کہنے کو تواب تھا لیکن ان کا حال بالکل اس شعر کا مصداق تھا ؎

تغافل سے جو باز آیا جفا کی　　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہ ظاہر ہے کہ جن بزدلوں نے امام حسینؓ کو کوفہ بلا کر خونِ شہادت سے غسل کرنے کے لئے یکہ و تنہا چھوڑ دیا ہو، اب اگر وہ بنو امیہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر اور اس طرح امام شہید کے قاتلوں سے انتقام لیکر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر بھی دیتے تو عرب کی مختلف سیاسی اور طاقتور جماعتوں پر کس طرح اپنا اثر و نفوذ قائم رکھ سکتے تھے، یہ گروہ اپنے آپ کو توابین (توبہ کرنے والے) کہہ کر امام حسینؓ کے ساتھ اپنی بے وفائی کا تدارک کرنا چاہتا تھا لیکن امام عالی مقام کی روحِ پُرفتوح ان سے خطاب کر کے کہہ رہی تھی ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اب اس کے سوا اور کیا چارۂ کار تھا کہ "مشتے بعد از جنگ" کو خود انھیں کے کلہ پر مار دیا جاتا۔

عراقیوں کی شورش عراقی طبعاً نہایت شورش پسند واقع ہوئے تھے جب ان کو اپنی کوششیں ناکام ہوتی نظر آئیں تو انھوں نے عبدالرحمٰن بن اشعث کو اپنا آلۂ کار بنا کر ایک ہنگامۂ محشر بپا کر دیا، لیکن عبدالملک نے ان کے بھی کس بل نکالدیئے اور حجاج کی قیادت میں ایک لشکرِ جرار بھیجکر ان کی بغاوت کا خاتمہ کر کے رکھدیا۔

ان اندرونی شورشوں اور فتنوں کے فرو کرنے کے علاوہ عبدالملک نے شمالی افریقہ کے بربریوں اور جزیرۂ صقلیہ اور قرطاجنہ کے رومیوں کو ان کی سرکشی کی ایسی سخت سزا دی کہ ان علاقوں پر مسلمانوں کا دوبارہ مضبوط قبضہ ہو گیا۔ غرض یہ ہے کہ عبدالملک بن مروان نے اس پُرآشوب دور میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کو قائم کرنے کی راہ میں جس غیر معمولی حزم و عزم اور جرأت و ہمت کا ثبوت دیا اس پر وہ بے شبہ لائقِ تحسین و آفرین ہے۔

عبد الملک کو تاریخ میں اموی حکومت کا مجدد یا مؤسس ثانی کہا جاتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ عبد الملک کا احسان صرف اموی حکومت پر نہیں بلکہ اسلام کی شانِ مرکزیت کا بقا اور فِرَقِ باطلہ کے مقابلہ میں صحیح العقیدہ مسلمانوں کی فتح بھی بڑی حد تک اس کی مرہونِ کرم ہے، یہی وجہ ہے کہ بعضوں نے عبد الملک بن مروان کو امیر معاویہؓ کا ہم پایہ قرار دیا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک سیاسی سمجھ بوجھ اور شجاعت و دلیری کا تعلق ہے وہ اس کا بجا طور پر مستحق ہے۔

مسعودی[1] نے ایک واقعہ لکھا ہے جس سے عبد الملک کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے موصوف کا بیان ہے "۶۶ھ میں عبد الملک کوفہ میں مختار سے جنگ کرنے شامی افواج کو اپنی کمان میں لئے ہوئے چلا جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک شب اس کو عبید اللہ بن زیاد کے قتل ہو جانے اور اس کے لشکر کی شکست خوردگی کی خبر ملی، ساتھ ہی اسے اطلاع ملی کہ جو فوج عبد اللہ بن زبیرؓ سے جنگ کرنے مدینہ گئی تھی اس کا کمانڈر مارا جا چکا ہے۔ اس خبر کے بعد ہی فوراً اسے معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن زبیر کا لشکر فلسطین کی سرزمین میں داخل ہو چکا ہے؛ اور ان کے بھائی مصعب بن زبیر بھی ان سے جا ملے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اطلاع پہنچی کہ شہنشاہِ روم شام کے ارادہ سے روانہ ہو چکا ہے، اور اب مصیصہ کے مقام پر اپنی فوجِ گراں لئے پڑا ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی ایک مخبر نے خبر دی کہ دمشق کے شورہ پشتوں نے وہاں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے اور اہلِ شہر پر طرح طرح کے ظلم و ستم توڑ رہے ہیں، یہاں تک کہ قیدی بھی قید خانوں کی سلاخیں توڑ کر بھاگ نکلے ہیں اور اعراب کے ایک گروہ نے حمص اور بعلبک وغیرہ میں لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

اگر کوئی اور شخص ہوتا تو پے بہ پے ایک ہی وقت میں ان پریشان کن خبروں کو سن کر ہوش و حواس کھو بیٹھتا۔ لیکن عبد الملک کی جرأت و دلیری اور ہمت و بہادری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ان اطلاعات کو سن کر ایک لمحہ کے لئے بھی دل گرفتہ نہیں ہوا۔ رات بھر ہنستا اور قہقہے لگاتا رہا اور اس کی ہر ہر ادا سے عزمِ مصمم اور ثباتِ قلب و دماغ کا اظہار ہوتا تھا۔

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۱۱۳۔

اس زمانہ کے حالات کا اقتضا یہ تھا کہ جس طرح بھی ہوتا فرقِ باطلہ کا زور توڑا جاتا اور باغیوں کی سرکوبی کر کے انھیں اس کا موقع نہ دیا جاتا کہ وہ اپنے اغراضِ فاسدہ کی تکمیل کے لئے بعض بھولے بھالے سادہ لوح مسلمانوں کی آڑ لیکر اسلام میں لامرکزیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائیں اور اس طرح اندرونی تحفظات کے مضبوط ہوجانے کے باعث ہمسایہ طاقتوں کو مسلمانوں پر یورش کرنے کا حوصلہ نہ ہوسکے۔ جہانتک حالات کے اس اقتضا کا تعلق ہے، یہ امر تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ عبد الملک بن مروان نے وقت کی اس ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ایک طرف اس نے اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کو بڑی ہمت، جسارت اور تدبیر سے دبایا اور فنا کیا اور دوسری جانب رومیوں اور بربریوں کی سرکشی کو ملیامیٹ کر کے اسلام کی سیاسی مرکزیت کو اس قدر مضبوط بنا دیا کہ اس کی وسعتوں کا دامن سمٹنے کے بجائے پھیلتا ہی رہا۔ اور اس کو عروج حاصل ہوتا رہا۔

عبد الملک بن مروان نے اسلام کی صرف سیاسی خدمات ہی انجام نہیں دیں بلکہ اس نے متعدد تعمیری کام بھی کئے وہ خود بڑا صاحبِ علم وفضل اور باکمال تھا۔ قرآن مجید کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا، جگہ جگہ اس مقصد کے لئے مکاتب قائم کئے حکومت کی دفتری زبان فارسی اور رومی تھی ان دفاتر کو عربی زبان میں منتقل کیا جس سے عربی زبان کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس کو عظیم الشان فروغ حاصل ہوا۔ بعض نئے شہر بھی آباد کرائے گئے اور کئی ایک مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں۔

ولید بن عبد الملک عبد الملک بن مروان کے بعد اس کا بیٹا ولید سریر آرائے خلافت ہوا، یہ اگرچہ باپ کی طرح صاحبِ علم وفضل تو نہیں تھا مگر طرزِ جہانبانی و فرمانروائی میں بہت ممتاز تھا۔ مذہبی زندگی بھی بہت سوں کے لئے درسِ عبرت تھی، عبد الملک اپنے عہد میں عرب کی اندرونی بغاوتوں، اور شورشوں کا خاتمہ کر ہی چکا تھا۔ ولید نے اس فرصت سے فائدہ اٹھایا اور خوش قسمتی سے اُسے محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر اور قتیبہ بن مسلم ایسے بہادر اور مدبر سپہ سالار بھی مل گئے جنھوں نے اپنے شاندار کارناموں سے اسلامی تاریخ کو چار چاند لگا دیئے۔

چنانچہ قتیبہ بن مسلم نے خراسان، خوارزم اور چینی ترکستان فتح کیا۔ محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور سخت ترین معرکوں کے بعد اس مہم کو سر کیا۔ موسیٰ بن نصیر نے اندلس کی سرزمین پر پہنچکر اسلامی حکومت و سلطنت کا پرچم لہرایا۔ اس طرح چین سے اسپین تک کا علاقہ مسلمانوں کے زیرنگین آ گیا ان فتوحات کے علاوہ ولید کو تعمیری کاموں کی طرف بھی بڑی توجہ تھی، اس نے نہایت عمدہ اور خوبصورت مسجدیں تعمیر کرائیں، فوج کی باقاعدہ تنظیم کی، تبلیغی ادارے قائم کئے اور مسلمانوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی، قرآن مجید کے درس کے لئے جگہ جگہ مکاتب قائم کئے اور علماء و متعلمین کے وظائف مقرر کرکے ان کو فکرِ معاش سے آزاد کیا اور گداگری کا انسداد کرکے مسلمانوں کو فرمانِ نبوی "السوال ذُلّ" یاد دلایا۔

قسطنطنیہ پر مسلسل ناکام حملے

جس طرح اندلس کی فتح سے اسلامی فتوحات کی تاریخ میں ایک نئے اور شاندار باب کا اضافہ ہوتا ہے جو مسلمانوں کے سیاسی عروج کی ایک روشن دلیل ہے اسی طرح مشرقی رومن امپائر کے دارالسلطنت قسطنطنیہ کے معرکہ میں مسلمانوں کی ناکامیابیاں بھی اپنے اندر عبرت و بصیرت کی بہت سی داستانیں رکھتی ہیں، اندلس کی فتح کے ساتھ اس ناکامی کا حال پڑھکر اندازہ ہوگا کہ اس زمانہ میں کس طرح اسلامی فتوحات کی وسعت کے باوجود زوال و انحطاط بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے، گویا جسم بظاہر بہت توانا اور فربہ تھا مگر روح اندرونی طور پر اضمحلال پذیر ہو رہی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی مادی ناکامی کی شکل و صورت میں اس کا ظہور ہوتا ہی رہتا تھا اس بنا پر یہاں قسطنطنیہ کا محاصرہ اور اس کی ناکامی کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا شاید بے موقع نہ ہوگا۔

قسطنطنیہ مشرقی یورپ کا دروازہ تھا۔ مسلمان اس کی اہمیت اور اس کو فتح کرنے کی ضرورت کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے عہد میں ۳۲ھ مطابق ۶۶۳ء) امیر معاویہؓ ایک فوج لیکر روانہ ہوئے اور ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے آبنائے باسفورس کے کنارہ تک پہنچ گئے۔ اسی زمانہ میں بسر بن ارطاۃ نے فونکس (.Phoenix) پہاڑ کے سامنے رومی بیڑہ کو شکست فاش دی جس کی کمان شہنشاہ کونسٹین دوم کر رہا تھا۔ اس بحری جنگ میں بیس ہزار رومی سپاہی

کھیت رہے لیکن مسلمان فوج کے نقصانات بھی کچھ کم نہ تھے۔ ان نقصانات کے باعث مسلمان اس کو فتح نہ کر سکے اور وہ واپس آ گئے۔

اس کے بعد ۴۳ھ میں جبکہ امیر معاویہؓ کی خلافت تسلیم کی جا چکی تھی اور دمشق بنو امیہ کا دارالسلطنت قرار پا چکا تھا، قسطنطنیہ پر خشکی اور سمندر دونوں طرف سے حملہ ہوا۔ بری فوج کی کمان عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کر رہے تھے اور بحری بیڑہ حسب سابق بسر بن ارطاۃ کی کمان میں تھا۔ یہ بیڑہ بحر مارمورہ تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن موسم سرما کی شدت کے باعث یہاں کوئی کارروائی نہ کی جا سکی اور مسلمانوں نے سردی کا موسم اناطولیہ میں گذارا۔

اس کے بعد ۴۸ھ میں حضرت معاویہؓ نے پھر بڑے ساز و سامان کے ساتھ حملہ کی تیاریاں شروع کیں، شام اور مصر کی بندرگاہوں میں فضیلۃ بن عبید الانصاری کی قیادت میں ایک بڑا بحری بیڑہ متعین کیا جو اناطولیہ کو عبور کرتا ہوا کلسیڈون تک فتوحات کرتا چلا گیا۔ دوسرے سال یعنی ۴۹ھ میں سفیان بن عوف الازدی کی زیر قیادت ایک بڑی فوج قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجی گئی۔ یزید بن معاویہ بھی اس لشکر میں شامل تھا اور اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ایوب انصاریؓ ایسے جلیل القدر صحابہ کرامؓ بھی اس میں شریک تھے۔ اس بری فوج کے علاوہ بحری بیڑہ جس کی کمان بسر بن ارطاۃ کر رہا تھا، رود بار دانیال کی موجوں کو چیرتا ہوا مشرقی رومن امپائر کے دارالسلطنت سے چند میل کے فاصلہ پر یورپین ساحل تک پہنچ گیا۔ گویا یہ کہنا چاہئے کہ مسلمان اس وقت قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے تھے۔ مشرقی امپائر کے شہنشاہ کو مسلمانوں کی ان عظیم الشان تیاریوں کا علم پہلے سے ہو چکا تھا اور اس بنا پر اس نے مقابلہ کی تیاریاں بھی بڑے پیمانہ پر کر رکھی تھیں اور ان کے پاس ایک نیا ہتھیار بھی تھا جسے یونانی آگ (Greek Fire) کہتے ہیں اور جو تارپیڈو کا کام کرتا تھا۔ مسلمان کئی دن تک اپنی بری اور بحری فوجوں کے ساتھ شہر کا محاصرہ کئے پڑے رہے اور صبح سے شام تک برابر حملے کرتے رہے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور عبدالعزیز بن زرارہ کلبی اس معرکہ میں شہید ہوئے لیکن اس مرتبہ بھی قسطنطنیہ فتح نہ ہو سکا اور مسلمانوں کو

ناکام لوٹنا پڑا۔ اب انھوں نے قسطنطنیہ سے اسّی میل کی مسافت پر اپنے ڈیرے خیمے ڈال دیئے اور کئی سال تک ان کا معمول یہی رہا کہ جاڑوں میں یہاں آجاتے تھے اور گرمیوں کے موسم میں پھر قسطنطنیہ کا محاصرہ کرکے اُسے فتح کرنے کی سعی کرتے تھے ان مسلسل ناکامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہازوں کا، آدمیوں کا اور دوسرے ساز و سامانِ جنگ کا شدید نقصان برداشت کرنا پڑا۔ آخر کار ۵۸ھ میں یہ لشکر واپس آگیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ان لڑائیوں میں تیس ہزار فداکارانِ اسلام کی جانوں کا نقصان ہوا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ پیہم شکستوں نے جہاں رومیوں کے حوصلے بڑھا دیئے ان سے مسلمانوں کی عظمت کو بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچا آخر کار امیر معاویہؓ نے رومیوں سے ایک معاہدہ کرلیا جو چالیس سال تک قائم رہا۔

قسطنطنیہ کے محاصرہ میں مسلمانوں کو جو مسلسل ناکامیاں اٹھانی پڑی تھیں وہ کوئی ایسی معمولی چوٹ نہ تھی جس کا اثر امتدادِ ایام کے ہاتھوں مٹ جاتا۔ بلکہ اسلامی فوج کے دل و جگر پر ایک ایسا داغ تھا جو رہ رہ کے ابھرتا تھا اور ان کو بیقرار کر جاتا تھا۔ چنانچہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں جب موسیٰ بن نصیر اندلس کی مہم سے کامیابی کے ساتھ فارغ ہو گیا تو اس نے چاہا کہ وہ اپنا رخ مغرب سے مشرق کی طرف کردے اور اس طرح قسطنطنیہ ہوتا ہوا دمشق پہنچے تاکہ عیسائیت اور عیسائی حکومت دونوں کا اقتدار بیک وقت ختم ہو سکے لیکن دربارِ خلافت کی طرف سے موسیٰؒ کو اس کی اجازت نہیں ملی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فتوحات فرانس کے جنوب تک ہی محدود ہو کر رہ گئیں۔

سلیمان بن عبدالملک کا زمانہ

ولید کی وفات کے بعد اس کا حقیقی بھائی سلیمان تختِ خلافت پر ۹۶ھ مطابق ۷۱۵ء میں متمکن ہوا۔ اس وقت بنو امیہ کی حکومت اندرونی بغاوتوں اور شورشوں سے مامون تھی۔ سیاسی فتوحات نے حوصلے بلند اور ہمتیں مستحکم کردی تھیں اعلیٰ ترتیب یافتہ اور منظم فوجِ گراں موجود تھی۔ اسلحہ اور ساز و سامانِ جنگ کی بھی کمی نہ تھی، پھر دوسری طرف بازنطینی حکومت میں طوائف الملوکی پیدا ہو چلی تھی۔ بیس برس کی قلیل مدت میں چھ قیصر تخت نشین ہوئے اور

معزول کر دئے گئے تھے۔ بلغاری اور سلافی (Sclavonians.) شمالی صوبجات کو پامال کر کے دار السلطنت کی دیواروں تک پہنچ چکے تھے اور دوسری جانب عرب ایشیائے کوچک میں سے گذر کر اپنی فتوحات کا دامن آبنائے باسفورس کے ساحل تک پھیلا چکے تھے، خود اندرونِ ملک شورشیں اور بغاوتیں برپا تھیں۔ اس صورتِ حال کو اپنے موافق دیکھ کر سلیمان بن عبدالملک نے قسطنطنیہ پر از سرِ نو حملہ کرنے کا ارادہ کیا اس مقصد کے لئے سلیمان نے بری اور بحری فوجیں بڑی بھاری تعداد میں مہیا کیں اور ان کو طرح طرح کے سامان اور اسلحۂ جنگ سے آراستہ و پیراستہ کر کے اپنے بھائی مسلمہ بن عبدالملک کی زیرِ قیادت روانہ کیا، خود دابق میں ٹھہر گیا۔ اور بھائی کو ہدایت کر دی کہ یا تو قسطنطنیہ فتح کرنا ورنہ وہیں مقیم رہ کر میری دوسری ہدایات کا انتظار کرنا۔

۹۸ھ کے آغاز یعنی ستمبر ۷۱۶ء میں مسلمہ نے اناطولیہ کے مرتفع میدانوں کو پامال کیا اور کئی ایک بازنطینی قلعے اور شہر فتح کر لئے۔ اس کے بعد اناطولیہ کے دار السلطنت عموریہ کا رخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ عموریہ کا گورنر ایک شخص لیو (Leo) تھا جو بڑا بہادر، حوصلہ مند اور چالاک تھا اس نے مسلمہ سے صلح کر لی مگر پھر قیصر کو معزول کر کے خود قسطنطنیہ کے تخت و تاج کا مالک بن بیٹھا۔ مسلمہ نے نہایت بہادری اور ہمت سے ایک عظیم الشان فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ بازنطینی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس وقت خشکی اور سمندر کی جانب سے مسلمانوں کی جو فوج قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جمع ہو گئی تھی اس کی تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تک پہنچتی تھی۔ سلیمان دابق میں بیٹھا ہوا برابر امدادی فوجیں اور ضرورت کی چیزیں بھیج رہا تھا اور مسلمانوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی آرزو میں بار بار

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

مسلمہ نے بحر مارمورہ کے ساحل ساحل چل کر اپنی بری اور بحری دونوں فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا اور منجنیقوں سے گولہ باری شروع کر دی، یہ محاصرہ بہت دنوں تک جاری رہا لیکن اس وقت بھی قدرت کو منظور نہ تھا کہ مسلمان فاتح اور فائز المرام ہو کر لوٹیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں

کو اس محاصرہ میں بھی شدید نقصانات اٹھانے پڑے۔ پھر سردی بھی اس سال اس قدر شدید ہوئی کہ عرب اس کو برداشت نہ کر سکتے تھے، ہزاروں مر گئے اور ہزاروں سخت بیمار ہو کر جنگ کے قابل نہ رہے اور سامانِ رسد جو ساتھ تھا وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ اسی اثناء میں سلیمان بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے۔ آپ کو ان حالات کا علم ہوا تو مسلمہ کو حکم بھیجا کہ قسطنطنیہ کا محاصرہ اٹھا لیا جائے اور اسلامی فوجیں واپس لوٹ آئیں، چلتے چلتے ایک اور ستم یہ ہوا کہ یونانیوں نے ایڈریانوپل کی اسلامی فوج کے بقیہ بحری دستوں پر حملہ کر دیا جس کے باعث بہتیرے جہاز غرق ہو گئے صرف چند ایک جو بچ رہے تھے شام کی بندرگاہ تک پہنچ سکے۔

اس مرتبہ کی ناکامی ایسی حوصلہ شکن تھی کہ اس کے بعد سے نویں صدی ہجری کے نصفِ ثانی تک یہ مہم سر نہ ہو سکی یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں یعنی مذکورہ بالا معرکہ سے کامل آٹھ سو سال بعد ترکوں نے اس کو فتح کیا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اگر اس وقت مسلمان قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو آج یورپ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور کون کہہ سکتا ہے کہ مصر و شام و عراق کی طرح یہاں کی آبادی کا بھی اکثر و بیشتر حصہ فرزندانِ توحید پر مشتمل نہ ہوتا لیکن۔

یُرِیْدُ الْمَرْءُ اَنْ یُّعْطٰی مُنَاہُ　　وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا مَا یَشَاءُ

(آدمی چاہتا ہے کہ اس کو اس کی مراد مل جائے۔ لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے)

ناکامی کے اسباب

مورخین نے ان اہم معرکوں میں ناکامی کے مختلف وجوہ و اسباب بیان کئے ہیں مثلاً ایک یہ کہ عربوں کو بحری جنگ کا کامل تجربہ نہ تھا۔ (۲) مسلمہ بن عبدالملک نے عموریہ کے گورنر لیو پر اعتماد کر کے غلطی کی اور اسے اپنا ہمراز بنا لیا۔ (۳) موسم کی شدت عربوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھی (۴) رومیوں کے پاس طاقت و قوت زیادہ تھی اور اسلحہ بھی بعض نئی قسم کے تھے۔

مادی اعتبار سے یہ اسباب مسلمانوں کی ناکامی میں موثر ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کے علاوہ ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان امراء جو اس وقت اسلامی فوج میں نمایاں اثر رکھتے تھے روحانی اعتبار سے کسی بڑی عظمت کے مالک نہیں تھے، تشدد، جبر و ظلم، استبداد

اور سخت گیری خلفاء سے لیکر معمولی درجہ کے عمّال وولاۃ تک کا شیوہ تھی۔ مسلمان تو مسلمان خود غیر مسلم بھی اس راز کو محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے مسیحی بادشاہ نے چوتھی صدی ہجری میں خلیفۂ عباسی کے نام جو ایک منظوم خط عربی میں لکھا تھا اس میں وہ کہتا ہے۔

الا شمّروا یا اھل بغداد ویلکم | فملککم مستضعف غیر دائم
تعودوا الی ارض الحجاز اذلۃ | وخلّوا بلاد الروم اھل المکارم
ملکنا علیکم حین جار قویکم | وعاملتم بالمنکرات العظائم
قضاتکم باعوا جھاراً قضاءھم | کبیع ابن یعقوب ببخس دراھم

ترجمہ۔ اے اہلِ بغداد تمہارے لئے تباہی ہے۔ تم بھاگنے کے لئے مستعد ہو جاؤ۔ کیونکہ تمہارا ملک ضعیف اور ناپائدار ہے تم ذلیل ہو کر ارضِ حجاز کی طرف واپس چلے جاؤ اور ذی عزت رومیوں کے شہروں کو خالی کردو۔ ہم تم پر غالب اس وقت ہوئے جبکہ تمہارے قوی نے ضعیف پر ظلم کیا اور تم اعمالِ شنیعہ کرنے لگے۔ تمہارے قاضی اپنے فیصلوں کو اس طرح بیچنے لگے جس طرح یوسف علیہ السلام چند دراہم میں بیچے گئے تھے۔

خلیفۂ عباسی نے ان اشعار کا جواب اس زمانہ کے مشہور عالم اور ادیب قفال مروزی سے لکھوایا تھا۔ دیکھئے جواب میں کس صفائی کے ساتھ امرِ حق کا اعتراف کیا گیا ہے فرماتے ہیں۔

وقلتم ملکنا بجور قضاتکم | وبیعھم احکامھم بالدراھم
وفی ذاک اقرار بصحۃ دیننا | وانا ظلمنا فابتلینا بظالم

ترجمہ:۔ تم کہتے ہو کہ ہم (عیسائی) اس وجہ سے تم پر غالب آگئے کہ تمہارے قاضی ظلم کرتے تھے اور وہ اپنے فیصلوں کو دراہم کے بدلے میں فروخت کردیتے تھے ہاں یہ صحیح ہے لیکن اس میں تو ہمارے دین کی سچائی کا اقرار ہے کہ ہم نے ظلم کیا تو ہمارا واسطہ ظالموں سے پڑ گیا۔

سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں محاصرۂ قسطنطنیہ کے ناکام ہونے سے دو سو برس بعد ایک عیسائی بادشاہ نے مسلمانوں کی ناکامی کا جو سبب بتایا تھا یعنی عمال وحکام کا ظلم وجور اور دینِ قیم کے احکام سے انحراف۔ دیکھئے یہ کس طرح مسلمانوں کی پوری تاریخ میں شروع سے آخر تک کارفرما

رہا ہے۔ بابر نے ہندوستان پہ پے بہ پے حملے کئے مگر جب تک وہ

نوروز و نو بہار و مے و دلبر یا خوش است　　　بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

پر عامل رہا فتح حاصل نہ کرسکا۔ پھر جب اس نے پیمانۂ و سبو کو توڑ کران تمام رندانہ بدمستیوں سے توبہ کرلی تو فتح و ظفر نے بھی آگے بڑھکر اس کے قدم چوم لئے۔

یہی سلیمان بن عبد الملک ہے جس کو حسنِ سیرت میں ایک خاص امتیاز کا مالک سمجھا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے جبر و تشدد اور استبداد و انتقام کا یہ عالم ہے کہ اس نے قتیبہ بن مسلم اور محمد بن قاسم ایسے نامور سپہ سالارانِ اسلام کو ان کی حسنِ خدمات کے باوجود قتل کرادیا اور محض اس بناپر کہ ان کے متعلق اس بات کا گمان تھا کہ یہ لوگ ولید کے بعد اس کے بیٹے کو خلیفہ بنانے اور سلیمان کو خلافت سے محروم کرنے کی رائے رکھتے ہیں۔ موسیٰ بن نصیر نے بے شبہ اندلس کو فتح کرکے اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دی تھی اور اس بناپر وہ ہر طرح لائق تحسین و آفرین تھا مگر یہ غریب بھی شاہی عتاب سے نہ بچ سکا یہاں تک کہ اس کا بیٹا عبد العزیز تو قتل ہی کردیا گیا۔

اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ بعض بعض عمّال ایسے بھی تھے جنھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاکر اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا اور اس طرح وہ دربارِ خلافت سے باغی ہوگئے لیکن یہ قصور بھی کس کا ہے؟ جب خلفار میں استبداد عام ہوجائے پھر عمّال سے بھی اس قسم کے اعمال کا صدور مستبعد نہیں رہتا۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سلیمان کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیزؒ خلیفہ ہوئے تو چونکہ آپ ملکِ عادل اور خلفاءِ راشدین کے طرز کے خلیفہ تھے اس لئے آپ نے اس حقیقت کو اچھی طرح محسوس کرلیا کہ اصل چیز خود اپنے نفس کا تزکیہ اور اپنے اعمال و افعال کی اصلاح ہے۔ ملکی فتوحات مقصود بالذات نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ کلمۂ حق عالمگیر ہو اور کوئی طاقت اس کی اشاعت میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اس بناپر آپ نے مسلمۃ بن عبد الملک کو جو اس وقت قسطنطنیہ کی جنگ میں

مصروف تھے حکم بھیجا کہ سب مسلمانوں کو لیکر واپس چلے آئیں۔[۵۰] اور اپنی تمام تر توجہ عُمّال وحُکام اور اُمراء وولاۃ کی اصلاح کی طرف ہی مبذول کردی، اس اصلاح سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ایمان وعمل کے اعتبار سے سچے اور حقیقی مسلمان بن کر زندگی بسر کریں۔

اصلاح کی پہل اپنے گھر سے کی، چنانچہ آپ نے سب سے پہلے خاندانِ شاہی کے افراد کو جمع کر کے ان سے فرمایا "میرا خیال ہے امتِ مرحومہ کا نصف یا دو تہائی حصہ تم لوگوں کے قبضہ میں ہے تم اسے ان لوگوں کو واپس کردو جن سے یہ لیا گیا ہے" بنو مروان بھلا اس کو کب ماننے والے تھے، بگڑ بیٹھے اور بولے "ہمارے سر قلم ہوجائیں گے لیکن یہ املاک واپس نہیں ہوسکتے۔ ہم نہ اپنے آباؤ اجداد کو کافر بنانا پسند کرتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کو مفلس وکنگال" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے تغلّب اور خیانت کی لعنت کا خاتمہ کر دینے کا عہد کر رکھا تھا فرمایا "خدا کی قسم! اگر تم ایسا نہیں کروگے تو میں تم کو ذلیل وخوار کر کے چھوڑ دوں گا" اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے ایک مجمعِ عام میں یہ تقریر کی۔

"اموی خلفاء نے ہم لوگوں کو ایسی جاگیریں اور جائدادیں دی ہیں جن کے دینے کا ان کو اور ہم کو ان کے لینے کا کوئی حق نہیں تھا، میں ان سب جاگیروں کو ان کے اصلی حقداروں کے تم واپس کرتا ہوں اور خود اپنی ذات اور اپنے خاندان سے اس کا آغاز کرتا ہوں"

اِس تقریر کے بعد آپ نے اپنی کل جاگیر واپس کردی، یہاں تک کہ ایک نگینہ بھی نہ رہنے دیا۔ بعض حضرات نے سمجھایا کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد کا کیا انتظام ہوگا؟ ارشاد فرمایا "میں ان سب کو خدا کے حوالہ کرتا ہوں" آپ کی بیوی فاطمہ، عبد الملک کی بیٹی تھیں ان کو باپ نے ایک یاقوت دیا تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا "تم یا تو اس یاقوت کو بیت المال میں داخل کردو، ورنہ مجھ سے ترکِ تعلق کرنے پر آمادہ ہوجاؤ"

اپنی اور اپنے خاندان کی جاگیروں کو واپس کر دینے کے بعد آپ نے تمام عمّال وحکام کو بھی

۵۰۔ طبری ج ۸ ص ۱۳۰۔

تہدیدی خطوط کے ذریعہ تاکید کی کہ وہ تمام مغصوبہ اور بجبر وصول کئے ہوئے اموال کو واپس کردیں اور آئندہ کے لئے اس طرح کی بے عنوانی کرنے سے مجتنب رہیں آپ کے ان احکام کا اثر یہ ہوا کہ مال وجائداد اور نقد، غرض یہ کہ ایک حبہ بھی جو کسی نے ناجائز طور پر وصول کیا تھا اصلی حقدار کو واپس کردیا گیا۔ [1] عمالِ بنو امیہ نے طرح طرح کے ناجائز ٹیکسوں اور محصولات کے ذریعہ لوگوں پر ظلم وستم کے دروازے کھول رکھے تھے آپ نے ان تمام ذرائع آمدنی کو بھی یکقلم بند کرادیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے عبدالحمید عامل کوفہ کے نام جو فرمان جاری کیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"ظالم عمال کے برے طرزِ عمل اور اللہ کے احکام میں زیادتی کرنے کے باعث اہلِ کوفہ کو سخت ترین مصائب وشدائد کا شکار ہونا پڑا ہے۔ دین کی اساس عدل اور حسنِ سلوک ہے ویران زمین کا ٹیکس آباد زمین سے نہ لو اور نہ آباد زمین کا ٹیکس ویران زمین سے لو، ویران زمین کو اچھی طرح دیکھو بھالو۔ اور جتنے کی اس میں سکت ہو اس سے وہ خراج لو، اور اس کو ٹھیک ٹھاک کرو کہ وہ آباد ہو جائے، پھر آباد زمین سے جو خراج وصول کرو وہ نرمی سے اور زمین کے مالکوں کی سہولت کی رعایت کرتے ہوئے وصول کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ سکہ بنانے والوں کی مزدوری پر کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ نوروز اور مہرگان کے تحفہ تحائف قرآن مجید کی قیمتیں، ہاؤس ٹیکس، نکاح خوانی کا معاوضہ ان میں سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کرنی چاہئے، اور ہاں اس کی بھی تاکید جانو کہ جو زمیندار مسلمان ہو جائے گا اس پر خراج واجب نہیں ہوگا۔" [2]

"آپ نے صرف عمال کے نام اس طرح کے فرامین جاری کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب کسی گورنر یا والی کا معاملہ مخدوش نظر آیا آپ نے اس کو قرار واقعی سزا دینے میں ذرا رو رعایت نہیں کی، چنانچہ یزید بن مہلب عرب کا نامی گرامی امیر تھا جب وہ مالیہ کی نسبت صفائی پیش نہیں کرسکا تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو قید کردیا اور باوجود لوگوں کی سفارشوں کے اسے رہا نہیں کیا۔" [3]

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۵۲۔ [2] طبری ج ۸ ص ۱۳۹۔ [3] ابن اثیر الجزری ج ۵ ص ۱۹۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یہ اصلاح نہ صرف تاریخِ اسلام میں بلکہ تاریخِ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اس سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ امتِ مرحومہ کا اصل مرض پہچان گئے تھے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی حکومت کا کوئی گناہ اس سے بڑھکر خطرناک اور تباہ کن نہیں ہوسکتا کہ اس کے عمائد، امراء اور حکام و اراکین رعایا کے اموال میں مطلق العنانی کے ساتھ جا و بیجا تصرف کریں اور کوئی ان سے بازپرس کرنے والا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو فتحِ ممالک کی طرف زیادہ توجہ نہیں تھی وہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کو اسلاً ضروری اور سب سے اہم سمجھتے تھے اور اسی پر انھوں نے اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

خلفاء بنی امیہ اپنے جبر و تشدد اور خلافتِ راشدہ کے منہاج پر قائم نہ رہنے کے لئے عذر یہ پیش کرتے تھے کہ اب لوگ بھی ایسے نہیں رہے ہیں جیسے کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں تھے چنانچہ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان نے خود یہی خیال صاف لفظوں میں ظاہر کیا تھا۔ لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ان باتوں کے قائل نہیں تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ بادشاہ کی مثال ایک بازار کی سی ہے جس میں وہی چیزیں لائی جاتی ہیں جن کی بازار میں مانگ ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ خود نیک ہوگا تو رعایا بھی نیک ہوگی اور اگر وہ نیک نہیں ہے تو رعایا بھی نیک نہیں ہوسکتی۔

ایک مرتبہ امام اوزاعیؒ نے عباسی خلیفہ منصور کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بادشاہ چار قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو خود بھی ضبطِ نفس کرتا ہے اور اپنے عمال کو بھی اس کی تاکید کرتا ہے یہ بادشاہ درحقیقت اللہ کے راستہ کا مجاہد ہے۔ اس کو ایک نماز کا ثواب ستر ہزار نمازوں کے ثواب کے برابر ملے گا۔ اور اللہ کی رحمت کا ہاتھ ہمیشہ اس کے سر پر سایہ فگن رہے گا۔ دوسری قسم کا بادشاہ وہ ہے جو خود بھی رعایا کے اموال میں خورد بُرد کرتا ہے اور اپنے عمال کو بھی اس نے ایسا کرنے کے لئے مطلق العنان چھوڑ دیا ہے یہ بادشاہ سخت ترین گناہگار ہے۔ اس کو اپنے گناہوں کا خمیازہ تو بھگتنا پڑے گا ہی، اس کے عُمال کے گناہ کی بازپرس بھی اس سے ہوگی۔ تیسری قسم بادشاہ کی یہ ہے کہ خود تو کفِ نفس کرے مگر عمال کو اس نے جبر و تشدد کے لئے آزاد چھوڑ رکھا ہو،

یہ بادشاہ بڑا ہی بدنصیب ہے کہ دوسروں کی دنیا کے بدلہ میں اپنی آخرت بیچتا ہے۔ چوتھی قسم کا بادشاہ وہ ہے جو خود تو بہت ہی غیر محتاط ہے مگر عمال کو محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا:-

فذالک شر الاکیاس۔ یہ تو بہت ہی بری فرزانگی ہے۔

امام اوزاعیؒ کی اس تقسیم کے مطابق کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا شمار پہلی قسم کے بادشاہوں میں ہے۔ آپ نے خود بھی ورع وتقویٰ اور احتیاط و پرہیز گاری کی زندگی بسر کی اور اپنے عمال کو بھی مجبور کیا کہ وہ شریعت اسلام کے مطابق لوگوں سے معاملہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت کو علیٰ منہاج الخلافۃ الراشدہ کہا جاتا ہے۔ آپ کی معدلت گستری حق پسندی اور پاک باطنی اس درجہ روشن تھی کہ اپنے تو اپنے بیگانے اور پرائے تک آپ کی ان صفات وخصائص کا اعتراف کرتے تھے، مسعودیؒ کا بیان ہے کہ قیصر روم کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خبر وفات پہنچی تو اسے سخت ملال ہوا۔ بار بار خلیفۂ مرحوم کے محاسن ومناقب کا ذکر کرتا تھا اور روتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ اسی سلسلے میں اس نے کہا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے بعد کوئی شخص مردوں کو زندہ کر سکتا۔ تو میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق گمان کرتا کہ وہ یہ معجزہ دکھا سکتے ہیں آخر میں کہا "میں اس راہب کو پسند نہیں کرتا جو دنیا کے تمام تعلقات کو منقطع کر کے کسی ایک گرجا میں گوشہ نشین ہو کر خدا کی عبادت کرتا ہے بلکہ میں اس راہب (حضرت عمرؒ کی طرف اشارہ ہے) کو دیکھ کر ہمیشہ تعجب کرتا تھا جو اپنے قدموں کے نیچے دنیا جہان رکھتا تھا اور پھر بھی راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔" [۱]

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کا نظامِ حکومت تمام مفاسد و ذمائم سے پاک وصاف ہو کر پھر اپنی اسی اصلی شکل وصورت کے ساتھ قائم ہو جائے لیکن افسوس کہ آپ کا عہدِ خلافت بہت ہی مختصر تھا۔

---

[۱] مروج الذہب برحاشیہ ابن اثیر ج ۷ ص ۱۳۰-۱۳۱-

یزید بن عبدالملک آپ کے بعد یزید بن عبدالملک خلیفہ ہوا مگر وہ اس روش کو برقرار نہ رکھ سکا۔ اس نے تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے کچھ دنوں بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مقرر کئے ہوئے عمّال کو یکقلم معزول کر دیا اور اپنے عمّال کو صاف لفظوں میں لکھ دیا کہ "عمر بن عبدالعزیزؒ کی جو پالیسی تھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتی، ان کے طرزِ عمل سے خراج اور ٹیکس کی مقدار میں بہت کمی آگئی ہے۔ اس لئے تم لوگ پھر اسی دورِ قدیم کا سا معاملہ کرنا شروع کر دو۔ اس میں لوگ سرسبز و شاداب رہیں یا قحط زدہ ہو جائیں، اس طرزِ عمل کو پسند کریں یا ناپسند، بہرحال تم کسی بات کی پروانہ کرو۔"

علاوہ ازیں یزید بن عبدالملک انتہا درجہ عیش پسند اور آرام طلب تھا۔ سلامہ اور حبابہ اس کی محبوب ترین کنیزکیں تھیں، ان میں سے حبابہ کے ساتھ عشق و محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک معمولی سے حادثہ سے حبابہ کا انتقال ہو گیا، یزید نے تین روز تک اس کی نعش کو بے گور و کفن اپنے پاس محل میں ہی رکھا۔ اس حالت میں وہ بار بار نعش کو بوسہ دیتا اور پیار کرتا اور فرطِ درد و کرب سے چیختا چلاتا تھا۔[1] بعض مورخین کا بیان ہے کہ یزید کی موت کا سبب بھی یہی حادثۂ جانکاہ تھا، غرض یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دو سال چند ماہ کی مختصر ترین مدت میں نظامِ خلافت کے جن مفاسد کی اصلاح کی تھی وہ دنیا سے آپ کے رخصت ہوتے ہی پھر رونما ہونے لگے اور حق تو یہ ہے کہ مسلسل غلط کاریوں کے باعث جو زہر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی رگوں میں سرایت کر گیا تھا اس کو اب خارج کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔

ہشام بن عبدالملک چار سال ایک ماہ کی خلافت کے بعد شعبان ۱۰۵ھ میں یزید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا تو اس کی وصیت کے مطابق اس کا بھائی ہشام بن عبدالملک سریر آرائے خلافت ہوا۔ ہشام فہم و تدبر اور سیاست و فرزانگی میں ایک خاص امتیاز کا مالک تھا۔ اس حیثیت سے خلفاء بنی امیہ میں اس کو وہی مقام حاصل ہے جو امیر معاویہ اور عبدالملک بن مروان کو حاصل تھا۔

[1] ابن اثیر ج ۵ ص ۴۵۔

روپیہ پیسہ خرچ کرنے میں بڑا محتاط تھا یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس پر بخل کا دھوکہ ہوتا تھا۔ مال جمع کرنے کا شوق ضرور تھا۔ عمّال کے متعلق اس کی روش تقریباً وہی تھی جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تھی۔

مورخین کا بیان ہے کہ ٹیکس اور خراج وغیرہ کی رقوم کے وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا جتنا اچھا نظام ہشام بن عبدالملک کے عہد میں تھا کسی اور خلیفہ کے عہد میں نہیں تھا۔ ان تعمیری اور انتظامی کارناموں کے علاوہ فتوحات کے اعتبار سے بھی ہشام کا زمانہ بنی امیہ کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس کے عہد میں پھر خوارج نے سر اٹھایا تھا۔ اس نے سرکوبی کر کے ان کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔ سندھ محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا مگر یہاں کے بعض علاقوں میں پھر بغاوت وسرکشی کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ ہشام نے اپنے نامی گرامی سپہ سالارِ فوج جنید کو بھیجکر ان بغاوتوں کا استیصال کرایا۔ ایشیاءِ کوچک میں متعدد فتوحات حاصل کیں۔ اندلس میں انتظامی اعتبار سے جو بعض خرابیاں پیدا ہو چلی تھیں ان کی اصلاح کر کے وہاں کی فضا کو ہموار کیا۔ شمالی افریقہ کی بربر قوم حسبِ عادت پھر سرکش ہو گئی تھی۔ اس کی طاقت کو زیر وزبر کیا۔ فرانس پر متعدد حملے ہوئے۔ غرض یہ ہے کہ اسلام کی سیاسی طاقت ومرکزیت کو متعدد اسباب ووجوہ سے جو خطرات لاحق ہو گئے تھے، ہشام نے اپنی فہم وفراست عزم وحزم اور ہمت وحوصلہ سے کام لیکر اُن کا مقابلہ انتہائی پامردی اور عالی حوصلگی کے ساتھ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اپنی سیاسی عظمت کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہ سکے۔ پھر چونکہ ہشام علمی لحاظ سے خود بھی رندمشرب یا لاأبالی مزاج نہیں تھا اور مذہبی تعلیم وتبلیغ کا اہتمام بھی کافی کرتا تھا، علماء اور فقہاء کا قدردان تھا۔ اس بناء پر سیاسی عظمت وبرتری کے ساتھ دینِ قیم کے عقائد واحکام کی اشاعت بھی وسیع پیمانہ پر ہوتی رہی۔

ہشام اسلام کے عقائدِ صحیحہ کے بارہ میں کسی قسم کی مداہنت کا روادار نہ تھا۔ کوئی شخص اگر اُن کے خلاف اپنے عقائدِ فاسدہ کی تبلیغ کرتا تھا تو اسے دربارِ خلافت سے شدید ترین سزا

دی جاتی تھی تاکہ دوسرے لوگوں کے لیے سرمایۂ عبرت ہو اور انھیں اپنے خیالات پھیلا کر مسلمانوں میں دماغی پراگندگی پیدا کرنے کی جرأت نہ ہو۔ خلقِ قرآن کا فتنہ سب سے پہلے ہشام بن عبدالملک کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ ہشام نے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ اس فتنہ کے بانی جعد بن درہم کو قید کر کے عراق کے امیر خالد بن عبداللہ القسری کے پاس بھیج دیا اور لکھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ خالد نے اس میں کچھ تساہل سے کام لیا۔ ہشام نے پھر دوبارہ لکھا اور سخت تاکید کی کہ جعد کو قتل کر دیا جائے چنانچہ اس نے عین بقرعید کے دن عید کی نماز کے بعد جعد کی گردن اڑا دی[ا]۔

اسی طرح غیلان بن یونس ایک شخص تھا جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں قدریہ عقائد کا اظہار کرتا تھا۔ حضرت عمرؒ نے اس کو بلا کر توبہ کرا لی تھی مگر ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں اس شخص نے پھر اپنے عقائدِ فاسدہ کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ہشام نے اپنے حکم سے اس کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے۔[۲]

لیکن ہشام کو بنی امیہ کا آخری خلیفہ سمجھنا چاہیے، جس نے اسلام کی سیاسی مرکزیت کو اپنی سیاست و تدبیر کے مضبوط ہاتھوں سے تھامے رکھا۔ اس کی مدتِ حکومت پندرہ سال ہے، اس کے بعد آخری خلیفہ مروان ثانی تک جتنے خلفاء ہوئے ان میں کوئی یا تو بالکل ہی نالائق اور نااہل تھا یا ذاتی اوصاف کے لحاظ سے تو نیک تھا مگر اس میں سیاست و تدبیر اور ہمت و جرأت کا فقدان تھا جس کے باعث وہ وقتی اور ہنگامی شورشوں کا سدِباب نہ کر سکا۔

چنانچہ ہشام کے بعد یزید بن عبدالملک کا بیٹا ولید خلیفہ ہوا جس کو یزید خود اپنی زندگی میں ولیعہد بنا گیا تھا، یہ پرلے درجہ کا فاسق و فاجر اور ظالم و جابر تھا، بادۂ رنگیں اور نغمۂ شیریں کے علاوہ اس کو کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہشام اس کی رندانہ بدمستیوں کو دیکھ کر چاہتا تھا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو اپنا جانشین بنا دے لیکن ایسا نہ ہو سکا اس بنا پر ولید نے ہشام کے بعد اس کی اولاد اور اس کے عُمّال و حکام سے شدید انتقام لیا، متعدد با اثر اصحاب قتل کیے گئے۔ مُضر اور

[ا] ابن اثیر الجزری ج ۵ ص ۹۶۔ [۲] ابن اثیر ج ۵ ص ۹۷۔

نزار کے قبیلوں کی باہمی آویزش جو مدہم پڑ گئی تھی پھر تازہ ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۲۶ھ میں یعنی ولید کی تخت نشینی سے ایک سال بعد یزید بن ولید تخت نشین ہوا، یہ خود عبادت گذار تھا مگر انتظامی قابلیت کم تھی۔ اسی لئے اس کو یزید الناقص کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے تخت نشین ہوتے ہی مخالفتوں اور بغاوتوں کا ایک کوہِ آتش فشاں پھٹ پڑا، عرب کے مضری قبائل اس کے سخت مخالف تھے انھوں نے شورش برپا کر دی۔ ادھر حمص اور فلسطین میں بغاوت کے شرارے بلند ہوئے اگرچہ عارضی طور پر ان کا تدارک کیا گیا لیکن ان کا استیصالِ کلی نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ آخری خلیفہ مروان ثانی کے عہد میں یہ ہی چیزیں جو قطرہ قطرہ ہو کر جمع ہو رہی تھیں ایک سیلابِ بلا بن کر امنڈ پڑیں اور اموی حکومت کے جاہ وجلال کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گئیں۔

مورخ طبری کا بیان ہے کہ مروان سن رسیدہ اور تجربہ کار تھا اس کے علاوہ حزم و دور اندیشی سے بھی بے بہرہ نہ تھا لیکن بدنصیبی سے اس کو تختِ حکومت اس وقت ملا جبکہ ملک میں عام بدنظمی اور شورش بپا تھی۔ ایک طرف خود اموی خاندان میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ شام میں متعدد سیاسی پارٹیاں تھیں جو باہم دست وگریباں تھیں۔ ادھر خراساں عباسی دعوت کا مستقر اور مرکز بنا ہوا تھا۔ اس تحریک کو اب اور بھی ابھرنے اور بروئے کار آنے کا موقع مل گیا۔ خوارجِ یمن میں اپنی منتشر طاقتوں کو جمع کر رہے تھے یہ صورتِ حال دیکھ کر ان کو بھی یہ حوصلہ ہوا کہ یمن سے نکل کر مکہ اور مدینہ میں اپنے عقائد کی دعوت وتبلیغ شروع کر دی۔ مروان نے ان کے مقابلہ کے لئے ایک لشکرِ جرار روانہ کیا جس نے حجاز میں اور یمن میں گھس کر ان سے شدید جنگ کی اور ان کے ہزاروں آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا۔

عباسی دعوت کا ہیرو اور سپہ سالار ابو مسلم خراسانی تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ بنو امیہ کی بہت بڑی طاقت خوارج سے جنگ کرنے میں مشغول ہے تو ایک لاکھ انسانوں کی منظم فوج جمع کر کے پہلے خراساں پر باقاعدہ قبضہ کیا۔ اس کے مختلف علاقوں کا انتظام اپنے متعدد لوگوں کے

سپرد کردیا۔ پھر قحطبہ نامی ایک بہادر جرنیل کی کمان میں ایک لشکرِ گراں عراقِ عجم کو فتح کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اموی حکومت کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے رے، اصفہان اور نہاوند وغیرہ مقامات پر معمولی لڑائیوں کے بعد قحطبہ کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ موصل اور اربل کے درمیان زابِ اعلیٰ کے کنارہ پر مروان خود ایک فوجِ گراں لئے پڑا تھا۔ یہاں دونوں میں گھمسان لڑائی ہوئی۔ مروان شکست کھا کر بھاگا۔ شام کے لوگوں سے بہت کچھ توقعات تھیں مگر ان لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ اس کی شکستہ حالی کو دیکھ کر اور الٹا اثر یہ ہوا کہ جہاں جہاں اس کی حکومت کے معاون و مددگار تھے قتل کر دیئے گئے۔

چنانچہ مصر والوں نے اپنے گورنر کو اور اہلِ حمص نے گورنرِ حمص کو سپردِ تیغ کر دیا۔ اہلِ مدینہ نے کم ازکم یہ کیا کہ مروان کے مقرر کئے ہوئے عامل کو قتل نہیں بلکہ صرف مدینہ سے نکال باہر کیا۔ غرض کہ زمین کی وسعتیں اس پر تنگ ہو گئی تھیں۔ نزاری جن پر اس کو بڑا اعتماد تھا وہ بھی بے مروتی کر رہے تھے، محروم و مایوس ہو کر دمشق اور فلسطین ہوتا ہوا مصر پہنچا۔ عباسی لشکر پیچھے سے تعاقب میں آ ہی رہا تھا۔ یہاں مروان نے چند ساتھیوں کے ساتھ پھر کچھ مقابلہ کیا مگر یہ مقابلہ ایک مرغِ بسمل کی پرافشانی سے زیادہ وقیع نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مارا گیا اور اس کے مٹتے ہی اموی حکومت کا چراغ بھی ۱۳۲ھ میں گل ہو گیا۔

بنو امیہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہو گا کہ اسلام کی حقیقی روح کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ کس طرح اس کے عروج کے اسباب بھی بہم پہنچتے رہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان اور عمل کے حقیقی معیار کا تعلق ہے اس دور کے مسلمانوں کو عہدِ صحابہ کے مسلمانوں کے ساتھ بحیثیتِ مجموعی کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ اگر اس عہد کے مسلمانوں کا بحیثیت ایک قوم کے دنیا کی دوسری متمدن قوموں کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کیا جائے تو یہ بات صاف نمایاں ہو گی کہ مسلمان اپنے عقائد و افکار، اعمال و اخلاق، معاشرت و معاملات کے

اعتبار سے اب بھی دنیا کی بہترین قوم تھے۔ ان میں اسلام کی واقعی روح مضمحل تھی مگر مردہ نہیں ہوئی تھی۔ ان کی حیرت انگیز جانبازیوں میں کچھ نہ کچھ دنیا طلبی کا دخل ہو تو ہو مگر ساتھ ہی اعلاءِ کلمۃ اللہ کے جذبہ سے بے بہرہ نہ تھے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر مسلمانوں میں وحدتِ اجتماعی نہ ہوتی تو ان کو چین، ہندوستان، افریقہ، اور اندلس میں وہ شاندار کامیابیاں ہرگز نہیں ہو سکتی تھیں جو انھوں نے حاصل کیں اور اس وحدتِ اجتماعی کا دار و مدار کسی قبائلی یا خاندانی رشتہ پر نہیں تھا بلکہ اسلام کے اس تعلق پر تھا جس نے افریقہ اور چین کے مسلمانوں کو ایک سلک میں منسلک کر دیا تھا۔

خلفاءِ بنو امیہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تہذیب کو خالص عربی تہذیب رکھا۔ ایرانی، یونانی، ترک اور تاتار، ہندی اور چینی غرض یہ کہ مختلف قومیں مسلمان ہو ہو کر عربوں کے ساتھ رہنے سہنے لگی تھیں۔ لیکن عربوں کی تہذیب نے نومسلم قوموں کو متاثر کیا۔ خود عرب ان کی تہذیب سے اثر پذیر نہیں ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ فتوحات کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت بھی عالمگیر ہوتی رہی اور جہاں جہاں مسلمانوں کا پرچمِ فتح و نصرت لہرایا وہاں مسجدیں تعمیر ہو کر آباد ہوئیں، حق کے غلغلوں سے وہاں کی فضا گونج اٹھی اور تمام لوگ اسلامی تہذیب و تمدن کے رنگ میں رنگے گئے۔ قرآن کی زبانِ عربی کو فروغ ہوا۔ تمام ممالکِ محروسہ میں قرآن و حدیث کے درس کے لئے مکاتب قائم ہوئے۔

عہدِ بنی عباس

خراسانیوں کے گرز البرز شکن نے بنو امیہ کے قصر حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو اس کے کھنڈروں پر خلافت بنی عباس کی شاندار عمارت قائم ہوئی، یہ عمارت شاید اس وقت تک مضبوط اور پر ہیبت وجلال نہیں ہو سکتی تھی جب تک کہ اس کی مٹی کو بنی امیہ کے خون سے نہ گوندھا جاتا اور اس کی بنیاد بے شمار انسانوں کے سروں اور ان کے اعضاء بریدہ پر نہ رکھی جاتی۔

دردناک مظالم | نہر زاب کے کنارہ پر اموی اور خراسانی لشکروں کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ اس کے علاوہ عراق اور خراسان کے دوسرے مقامات پر بے شمار انسانوں کا خون بہایا گیا۔ مگر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی۔ مروان مصر کے ایک مقام بوصیرہ میں قتل کر دیا گیا اس کے قتل ہونے سے پہلے ہی کوفہ میں بماہ ربیع الاول ۱۳۲ھ خاندانِ بنو عباس کے پہلے خلیفہ ابوالعباس سفاح کے لئے بیعت لے لی گئی تھی مگر ان لوگوں کی آتشِ انتقام پھر بھی سرد نہیں ہوئی اور بنو امیہ کے ایک ایک آدمی کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر قتل کر دیا گیا۔ سفاح کے چچا داؤد بن علی نے مکہ اور مدینہ میں اور عبداللہ بن علی نے شام میں اموی خاندان کے یا اس خاندان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے جس کسی شخص کو پایا بے دریغ سپردِ تیغ کر دیا۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ابنِ اثیر الجزری کا بیان ہے[1] کہ سلیمان بن علی گورنر بصرہ نے تو یہاں تک کیا کہ بہت سے اموی جو بیش قیمت لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھے ان کو بصرہ میں قتل کرایا، اور اس کے بعد پیروں میں رسیاں بندھوا کر ان کی بے گور وکفن نعشوں کو شاہراہِ عام پر ڈلوا دیا جہاں ان کے جسم کتوں کے لئے سامانِ ضیافت بنے۔

---

[1] تاریخ الکامل ج ۵ ص ۱۵۴ تا ۱۶۲۔

عبداللہ بن علی کی آتشِ انتقام زندہ انسانوں کے قتل کرنے سے نہ بجھی تو اس نے بنو امیہ کے جلیل القدر خلفا امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان، اور ہشام بن عبدالملک تینوں کی قبریں کھدوائیں۔ ہشام کی نعش بجز اس کی ناک کے بانسے کے بالکل صحیح سالم تھی۔ اس کو کوڑوں سے پٹوایا۔ ابن اثیر نے بنو امیہ پر مظالم کے اس سے بھی زیادہ دردناک واقعات لکھے ہیں جن کو پڑھکر انسانیت اور شرافت لرزہ براندام ہوجاتی ہیں۔ یہاں ان کو بیان کرنا چنداں ضروری نہیں ہے۔

جوشِ انتقام میں ان لوگوں کا توازنِ دماغی کس درجہ معطل ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام بن عبدالملک بیٹھا ہوا تھا اور سفاح اس کے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کر رہا تھا۔ اتنے میں سدیف نامی ایک شاعر آیا اور اس نے ذیل کے دو شعر پڑھے ؎

لَا یَغُرَّنْکَ مَا تَرٰی مِن رِجَالٍ　　　اِنَّ تَحتَ الضُّلُوعِ دَاءً دَوِیًّا

فَضَعِ السَّیفَ وَارفَعِ السَّوطَ حَتّٰی　　　لَا تَرٰی فَوقَ ظَهرِهَا اُمَوِیًّا

ترجمہ۔ اے سفاح تجھکو یہ لوگ جنھیں تو دیکھ رہا ہے کہیں دھوکہ میں مبتلا نہ کردیں، ان کی پسلیوں میں چھپی ہوئی بیماریاں ہیں یعنی ان کا دل صاف نہیں ہے تو تلوار سے کام لے اور کوڑا اٹھا یہاں تک کہ زمین کی پشت پر ایک اموی کو بھی زندہ نہ چھوڑ۔

ان اشعار کے سنتے ہی سفاح محل میں چلا گیا اور اس کے بعد ہی سلیمان کو پکڑ کر قتل کردیا گیا پھر بنو امیہ ہی کیا موقوف ہے جن لوگوں پر آلِ علی کی حمایت اور ان کی طرفداری کا شبہ تھا ان کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتاؤ کیا گیا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اس شاندار حکومت کا آغاز ہوا جس کے عہد کو مسلمانوں کی تاریخ کا "عہدِ زریں" کہا جاتا ہے اور جس پر ہمارے مورخین فخر کرتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے۔

سفاح کا قول و عمل بیعتِ خلافت کے وقت ابوالعباس سفاح نے جامع کوفہ میں جو خطبہ دیا تھا اس میں اس نے بڑے فخر سے کہا تھا "اللہ نے اپنے دین کو ہمارے ذریعہ مضبوط کیا اور ہم کو اس کا قلعہ اور پناہ گاہ بنایا۔ ہم اس دین کی حفاظت کرنے والے اور اس کے لئے دشمنوں سے لڑنے والے

ہیں۔ اللہ نے ہم کو تقویٰ اور طہارت کا پابند بنایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کا شرف عطا فرما کر ہم کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مستحقِ خلافت کیا ہے۔" اس کے بعد سفاح نے قرآن مجید کی چند آیات پڑھیں جن میں ذوی القربیٰ کے حقوق کا ذکر ہے۔ پھر بنو امیہ اور اہلِ شام پر سب شتم کیا۔ اور رنگین بیانی سے کام لیکر ان کو خلافت کا غاصب اور انتہائی ظالم و جابر ثابت کیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ وہی اہلِ کوفہ جنھوں نے جگر گوشۂ رسول امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیوفائی کی جوان کی مظلومانہ شہادت کا سبب بنی۔ سفاح ان لوگوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ "اے اہلِ کوفہ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم سب ہماری محبت اور مودت کا مرکز ہو اور تم وہی ہو کہ زمانہ کے حوادث اور ظلم و جبر کی فراوانیاں بھی تم کو ہم سے برگشتہ نہیں کر سکیں۔ اور ہمارے متعلق تمہارے رویہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اس لئے تم ہمارے نزدیک سب سے زیادہ سعادتمند اور معزز و مکرم ہو۔ اور میں نے آج سے تمہارے عطیات میں سو سو دراہم کا اضافہ کر دیا ہے۔ خطبہ کے آخر میں اپنی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "فانا السفاح المبیح والثائر المنیح" میں خون کو مباح سمجھنے والا خونریز ہوں اور شدید انتقام لینے والا ہوں۔"

ابو العباس سفاح اس وقت تپ زدہ ہو رہا تھا اس سے زیادہ نہ بول سکا اور یہاں تک تقریر کر کے گھر میں چلا گیا۔ اس کے بعد سفاح کا چچا داؤد بن علی منبر پر آیا اور اس نے ایک طویل تقریر کی۔ اس تقریر میں کئی جگہ داؤد نے کہا کہ خلافت ہمارا حق ہے جو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور میراث ہم کو پہنچتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اس حق کو غصب کرنیوالے ہلاک ہوگئے اور یہ حق پھر ہم کو واپس مل گیا۔ داؤد نے صرف اس قدر کہنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اس نے پوری جرأت اور ڈھٹائی سے یہاں تک کہدیا "تم سب لوگ اچھی طرح سن لو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے اب تک بجز امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر المومنین عبد اللہ بن محمد یعنی ابو العباس سفاح کے اس منبر پر کوئی صحیح معنی میں خلیفہ بیٹھا ہی نہیں ہے۔"

اب ذرا ایک طرف سفاح اور داؤد بن علی ان دونوں کے خطبات کو پڑھیے اور دوسری جانب

ان کا عمل دیکھئے اور پھر بتایئے کہ اسلام میں غدر، فریب، جھوٹ اور مکاری و بے ایمانی کی مثال کوئی اس سے بھی بدتر ہو سکتی ہے؟ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے برابر کوئی خلیفہ برحق ہوا ہی نہیں، یہانتک کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بھی خلیفہ نہیں تھے۔ لیکن عمل ہو بہو اس شعر کا مصداق ہے۔

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

اسباب خواہ کچھ ہوں لیکن اس میں ذرا شبہ نہیں کہ مسلمان ہمیشہ اپنی اس بدقسمتی پر روئیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لے گئے ابھی پورے سوا سو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ مسلمانوں نے ایک ایسی حکومت قائم کی جس کی بنیاد محض جوشِ انتقام، عربوں سے نفرت و عداوت اور خود غرضی پر قائم تھی اور اس بنا پر اس کو قائم کرنے اور اسے مضبوط بنانے کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو اسلامی شریعت میں ناجائز و ناروا تھا۔ عربی کی ایک مثل کے مطابق بنو امیہ اگر نباشِ اول (پہلے گورکن) تھے تو اس میں شبہ نہیں کہ بنو عباس نباشِ ثانی (دوسرے گورکن) تھے اور اس لئے موخرالذکر کے مقابلہ میں اول الذکر بہرحال رحمتہ اللہ علی النباش الاول کے مستحق تھے۔

سعید الفطرت وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں سے عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں مگر بنو عباس نے ایسا نہیں کیا۔ ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بنو امیہ کے زوال میں دو چیزوں کو بہت بڑا دخل ہے، ایک حد سے زیادہ جبر و تشدد، ظلم و جور اور سفاکی و بے رحمی اور دوسرے خلیفہ کا اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو بلکہ تین تین کو اپنا ولیعہد بنانا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے بھی اپنا رویہ یہی رکھا۔ اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

ولی عہد بنانے کے ہولناک نتائج

متوکل باللہ کے زمانہ تک خلفاء کا دستور یہ رہا کہ وہ اپنی حیات میں ہی اپنی اولاد میں سے کسی کو یا بھائی اور بھتیجہ کو یا دونوں کو یکے بعد دیگرے اپنا ولیعہد بنا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ قصرِ خلافت میں زہر خورانی کے واقعات پیش آتے تھے۔ باہمی سازشیں ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ سخت ترین جنگ و جدال کی نوبت بھی آجاتی تھی اور اس طرح

اعزا و اقربا رآپس میں میل ملاپ اور صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے اور اس سے شاہی محلات کی زندگی کے ابتر اور پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ رعایا کی زندگی بھی ایک عجیب کشمکش میں بسر ہوتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ اس طرزِ عمل سے بعض اوقات باپ اور بیٹوں تک میں شرمناک واقعات پیش آجاتے تھے جن کا کوئی مسلمان تو کیا ایک معمولی درجہ کا انسان بھی تصور نہیں کرسکتا۔ متوکل باللہ عباسی کے متعلق صاحب شذرات الذہب کا بیان ہے۔

وھو الذی احیا السنۃ واماتَ التجہم   اس نے سنت کو زندہ کیا اور جہمیت کو فنا کیا۔

لیکن اس محیِ سنت کا بھی حال یہ تھا کہ اس نے پہلے تو اپنے تین لڑکوں منتصر، معتز اور موید کو اپنا ولیعہد مقرر کردیا۔ لیکن چونکہ معتز کی ماں سے جو صبیحہ نام کی ایک لونڈی تھی محبت زیادہ کرتا تھا اس لئے بعد میں اس کی رائے ہوئی کہ منتصر سے ولیعہدی سے علیحدگی کا اقرار نامہ لکھالے، اور اس کے بجائے معتز کو اپنا قائم مقام بنادے۔ منتصر نے اس کو گوارا نہ کیا اور غیظ و غضب کی آگ نے برافروختہ ہوکر اس کو باپ کے قتل کردینے پر آمادہ کردیا۔ چنانچہ شوال ۲۴۷ھ میں متوکل اپنے وزیر فتح بن خاقان کے ساتھ بیٹے کے ہاتھوں قتل کردیا گیا۔ جس بیٹے کا اپنے باپ کے ساتھ یہ سلوک ہو وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا کم تھا۔ باپ کو قتل کرنے کے کچھ دنوں بعد منتصر نے اپنے دونوں بھائیوں کو مجبور کیا کہ ولیعہدی سے الگ ہوجائیں۔ معتز نے کچھ مخالفت کی مگر آخر کار موید اور معتز دونوں کو منتصر کا حکم ماننا پڑا۔

ترک غلاموں کا اقتدار

متوکل کی موت کے بعد خلافت بنی عباس کا پورا اقتدار ترک غلاموں کے ہاتھ میں آگیا تھا وہ جس کو چاہتے تھے خلیفہ بناتے تھے اور جب اُس سے ناراض ہوتے اُسے الگ کردیتے بلکہ نہایت وحشیانہ طریقہ پر طرح طرح کی ایذائیں دیکر قتل کردیتے تھے، چنانچہ متوکل باللہ سے لیکر آخری خلیفہ تک جتنے خلفاء ہوئے ان میں ایک کثیر تعداد ان خلفاء کی ہے جن کو ترک غلاموں نے تختِ سلطنت پر بٹھایا اور آخر کار نہایت بے دردی کے ساتھ ان کا خاتمہ کردیا۔ خود متوکل منتصر کے ایماء سے ترک غلاموں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اسی طرح ان غلاموں نے مستعین باللہ المتوفی ۲۵۲ھ کو کچھ دنوں قید رکھا پھر گردن اڑادی معتز باللہ کو ۲۵۵ھ میں جبکہ وہ حمام میں نہارہا تھا کھولتے ہوئے پانی میں غوطہ دیکر مار ڈالا۔ ایک روایت یہ ہے کہ ایک تہ خانہ میں بند کر کے تہ خانہ کو اوپر سے بند کردیا اور معتز اسی میں دم گھٹ جانے سے مرگیا۔ ۲۵۶ھ میں مہتدی کو انھیں بے رحموں نے نشانۂ ظلم وستم بنایا اور تھپڑ اور لاتیں مار مار کر اسے جاں بحق کردیا۔ ۲۹۶ھ میں ابن المعتز کو گلا گھونٹ کر انھیں ظالموں نے شہید کیا۔ مقتدر باللہ کو اس وحشیانہ طریقہ پر قتل کیا کہ پہلے تلوار سے گردن اڑادی پھر سر کو نیزہ پر اٹھا کر اس کی نمائش کی اور تمام جسم عریاں کردیا۔ قاہر باللہ کی آنکھوں میں ایک آگ میں تپتی ہوئی سلاخ پھیری اور اس طرح اسے تڑپا تڑپا کے ختم کیا۔ اسی طرح خلیفہ مستکفی باللہ المتوفی ۳۳۴ھ کے پاؤں میں رسی باندھ کر اسے زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور پھر آنکھوں میں لوہے کی سلاخ ڈال کر اس کا خاتمہ کردیا۔ متقی باللہ کے ساتھ بھی اسی قسم کا معاملہ ہوا۔ خلیفہ مسترشد باللہ پر اچانک سترہ آدمیوں نے چاقوؤں سے حملہ کرکے اس کے جسم کو پارہ پارہ کردیا اور ناک کان کاٹ کر انھیں آگ میں جلا دیا۔ راشد باللہ کو اس کے بیٹے کے ساتھ بہت دنوں تک قید میں رکھا یہاں تک کہ پھر دونوں قید خانہ میں ہی جاں بحق ہوگئے۔ پھر سب سے آخر میں خلیفہ مستعصم باللہ کا جو حشر ہوا اس کو سن کر بھی بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ وزیر ابن علقمی کی سازش سے تاتاریوں نے اس کو گرفتار کیا اور ایک تھیلہ میں بند کر کے اس کو روند ڈالا گیا اور اسی پر خلافتِ بنی عباس کا چراغ جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

خلافتِ عباسیہ کے دو دور

عہد بنی عباس تاریخی طور پر دو دوروں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور جو تاریخ کی عام زبان میں اس خلافت کا عہدِ زرین کہلاتا ہے ۱۳۲ھ سے شروع ہوکر معتصم باللہ کے آخر عہدِ حکومت ۲۲۷ھ تک ممتد ہے اس کے بعد سے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جو ۶۵۶ھ میں آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کے بغداد میں قتل ہونے پر منتہی ہوجاتا ہے۔

دورِ انحطاط

یہ آخری دور عباسیوں کا دورِ انحطاط ہے جس میں دربارِ خلافت کا اقتدار تقریبًا بالکل ختم ہوگیا تھا۔ غلاموں، خواجہ سراؤں اور عورتوں کا عمل دخل امورِ سلطنت میں بہت بڑھ گیا تھا۔

اندرونِ ملک شورشیں برپا تھیں۔ مختلف صوبوں میں طوائف الملوکی اور خود مختاری پیدا ہو چلی تھی۔ یہانتک کہ راضی باللہ (از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ) کے عہد میں خلیفۂ اسلام محض نام کا خلیفہ رہ گیا۔ مختلف صوبوں میں خود مختارانہ حکومتیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ بصرہ میں ابن رائق، خورستان میں بریدی، فارس میں عماد الدولہ بن بویہ، کرمان میں ابو علی بن الیاس، رے، اصفہان اور جبل میں رکن الدولہ بن بویہ اور رشمگیر بن زیاد، موصل اور دیار بکر و ربیعہ و مضر میں بنو حمدان، مصر اور شام میں اخشید، مغرب اور افریقہ میں قائم علوی، اندلس میں عبد الرحمٰن بن محمد الاموی، خراسان اور ماوراء النہر میں نصر بن احمد بن سامان۔ طبرستان اور جرجان میں، دیلم، بحرین اور یمامہ میں ابو طاہر القرمطی اپنی اپنی مستقل حکومتیں قائم کر کے بیٹھ گئے اور خلافت صرف ایک دینی رسم ہو کر رہ گئی۔ اب خلیفۂ بغداد اور اس کے اطراف و اکناف کے علاوہ کسی اور حصۂ ملک کا مالک نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بغداد میں بھی وہ پورے طور پر آزاد نہیں تھا۔ صوبوں کی خود مختارانہ حکومتیں مسلمانوں میں اپنا وقار قائم کرنے کے لئے دربارِ خلافت سے کچھ نہ کچھ وابستگی ضرور رکھتی تھیں اور کوئی سلطان خلیفۂ بغداد سے سندِ سلطانی حاصل کئے بغیر سلطنت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ خلفاء ان سلاطین سے جتنا ڈرتے تھے خود سلاطین ان سے اس قدر خوف نہیں کھاتے تھے۔ اس بنا پر کسی صوبہ کا خود مختار گورنر جو چاہتا تھا خود اپنے اثر و رسوخ سے یا خلیفہ کے کسی غلام، خواجہ سرا یا کسی لونڈی کی سفارش سے دربارِ خلافت سے اس کی منظوری حاصل کر لیتا تھا۔

امورِ سلطنت میں عجمی غلاموں کا یہ عمل دخل منصور کے زمانہ سے ہی شروع ہو گیا تھا، اگر معاملہ غلاموں کو سرکاری عہدے دینے تک ہی محدود رہتا اور ان کے اعزاز و اکرام کے ساتھ خالص اسلامی طریقہ پر ان کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام رکھا جاتا تو خلافت ان کے ہاتھوں تباہ نہ ہوتی بلکہ اس میں اور استحکام پیدا ہو جاتا۔ خلفاء بنی عباس کی طرح سلطان علاء الدین خلجی اور فیروز شاہ کی ملکیت میں بھی پچاس پچاس ہزار غلام رہتے تھے، جو فوجی محکمہ اور سلطنت کے دوسرے شعبوں میں چھائے ہوئے تھے لیکن یہ چونکہ ایک خاص قسم کی تربیت پائے ہوئے تھے اس لئے ان غلاموں کا

وجود حکومت کے لئے خطرناک ہونے کے بجائے بہت کچھ تقویت اور مضبوطی کا سبب تھا۔

شمس سراج عفیف کا بیان ہے کہ

"فیروز شاہ اپنے غلاموں سے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق کام لیتا تھا جو غلام سیاسی خدمات انجام دینے کے اہل تھے ان کو سلطنت کے مختلف شعبوں میں مقرر کیا جاتا تھا اور جو غلام علمی اور تعلیمی کاموں سے طبعی مناسبت رکھتے تھے ان کو اسکولوں اور کالجوں میں داخل کر کے مختلف علوم و فنون کی اور دینیات کی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ بعض بعض غلاموں کو مکہ معظمہ بھیج دیا جاتا تھا کہ وہ ارضِ مقدس میں دنیوی علائق سے یکسو ہو کر ہمہ تن زہد و عبادت میں مشغول رہیں۔" [۱]

لیکن خلفاء بنی عباس کا حال سلاطینِ دہلی کے برعکس تھا۔ انھوں نے نہ تو غلاموں کی اخلاقی تعلیم و تربیت پر توجہ کی اور نہ ان پر حد سے زیادہ اعتماد کرنے کے باعث ان کی اندرونی سرگرمیوں سے واقف رہنے کی کوشش کی۔ پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف رفتہ رفتہ سلطنت کے ذمہ دارانہ عہدے اور مناصب عجمیوں بلکہ ترک غلاموں کے قبضہ میں آرہے تھے جن کے دلوں میں اسلامی تعلیمات نے ابھی پورے طور پر گھر نہیں کیا تھا اور ان کے دماغوں سے جاہلیت کے رسوم و عادات کے نقوش بالکل مٹے نہیں تھے اور ادھر محلاتِ شاہی میں ملک ملک کی لونڈیوں نے خلفاء اور شہزادوں کے اقلیم دل میں اپنی حکمرانی کا سکہ چلانا شروع کر دیا تھا۔ تدریجی طور پر یہ دونوں اثرات اپنا کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ خلافتِ بنی عباس کے دوسرے دور میں خلافت محض برائے نام رہ گئی۔ خلفاء کے القاب اب بھی کروفر کی شان رکھتے تھے۔ مگر جاننے والے جانتے تھے کہ ان ریشمی غلافوں کے اندر ایک جسمِ ناتواں چھپا ہوا ہے جو "ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ" ہونے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔ عرب کے ایک شاعر ابنِ ابی شرف نے بادشاہانِ اندلس کے پُرشکوہ القاب پر ایک مرتبہ طعن کرتے ہوئے کہا تھا۔

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۲۶۸، ۲۷۳۔

مما یزھدنی فی ارض اندلس اسماء معتمد فیہا و معتضد

القاب مملکۃ فی غیر موضعہا کالہر یحکی انتفاخا صورۃ الاسد

ترجمہ: جس چیز نے مجھکو اندلس سے برگشتہ کردیا ہے وہ وہاں کے بادشاہوں کا معتمد اور معتضد جیسے نام رکھنا ہے، یہ سلطنت کے القاب بالکل بے محل ہیں، ان کی مثال اس بلی کی سی ہے جو پھول کر شیر کی نقل اتارتی ہے۔

یہ شعر بعینہ خلافتِ عباسیہ کی ان کٹ پتلیوں پر بھی صادق آتے ہیں جن کی دور محلِ شاہی کی کسی نازک اندام جاریہ کے دستِ سیمیں میں ہوتی تھی یا کسی غلامِ نافرجام کی انگشتِ آہن سرشت میں۔

وزارت کی ابتری | جب خلافت بے دست وپا ہو چکی ہو تو پھر وزارت کا حال جو کچھ بھی ہو کم ہے اس کی ابتری اور پریشاں حالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ منصبِ وزارت حاصل کرنے کے لئے بیش قرار رشوتیں پیش کی جاتی تھیں اور اس طرح دربارِ خلافت سے اس شخص کو پروانۂ وزارت مل جاتا تھا جو زیادہ سے زیادہ رقم دے سکے۔ اگرچہ اس اہم عہدہ کی صلاحیت اس میں بالکل بھی نہ ہو، چنانچہ ابن الطقطقی کا بیان ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں ابنِ مقلہ نے پانچ لاکھ دیناروں کی رشوت دیکر راضی باللہ سے وزارت کا عہدہ حاصل کیا[1]۔ اسی طرح ابنِ جہیر نے قائم بامر اللہ کو تیس ہزار دنانیر کی گراں قدر رقم پیش کی تھی اور اس کے عوض منصبِ وزارت خریدا تھا[2]

رشوت ستانی کے سلسلہ میں ایک نہایت شرمناک اور حیرت انگیز واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ میں ناظرِ امورِ عامہ کی ایک جگہ خالی تھی، مقتدر باللہ کے وزیر خاقانی نے اس جگہ کے لئے ایک دن میں انیس آدمیوں سے رشوت لی اور ان میں سے ہر ایک کو اس منصب کا پروانہ لکھکر دیدیا، اب یہ لوگ روانہ ہوئے تو اتفاق سے راستہ میں ایک مقام پر سب کا اجتماع ہو گیا۔ یہاں ان کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم میں سے جو شخص وزیر کے پاس سب سے آخر میں گیا تھا اس کو ہی کوفہ پہنچکر یہ عہدہ سنبھالنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے پروانہ کے لئے کوئی ناسخ نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سب سے آخر میں جس شخص کو کوفہ کی نظارت کا فرمان

---

[1] الفخری ص ۲۰۰ [2] ایضاً ص ۲۱۴۔

ملا تھا وہ کوفہ چلا گیا اور باقی سب وزیر کے پاس لوٹ آئے۔ اب وزیر نے ان لوگوں کو متفرق کام سپرد کر دیئے۔" (الفخری ص ۱۹۷)

یہ روایت ابن الطقطقی کی ہے ممکن ہے من وعن صحیح نہ ہو، تاہم اس عہد کے عام حالات جو کم وبیش تمام تاریخوں میں مذکور ہیں ان کے پیش نظر یہ کوئی مستبعد اور ناممکن الوقوع بات نہیں ہے چنانچہ ایک شاعر نے اس وزیر کی ہجو میں کہا بھی ہے۔

وزیرٌ لا یمل من الرقاعہ ۔۔۔ یولی ثم یعزل بعد ساعۃ

ویدنی من تعجل منہ مالٌ ۔۔۔ ویبعد من توسل بالشفاعۃ

وان اھلُ الرشا صاروا الیہ ۔۔۔ فاحظی القوم اوفرھم بضاعۃٌ

ترجمہ:۔ "یہ ایسا وزیر ہے جو رقعہ لکھنے سے اکتاتا نہیں ہے وہ ایک شخص کو والی بنا دیتا ہے پھر ایک گھنٹہ بعد اُسے معزول کر دیتا ہے، جن لوگوں کی طرف سے اس کو جلدی رشوت موصول ہو جاتی ہے اسے اپنا مقرب کر لیتا ہے اور جو لوگ سفارش کو اپنا وسیلہ بناتے ہیں انھیں اپنے سے دور کر دیتا ہے اور اگر اہلِ رشوت اس کے پاس آتے ہیں تو ان میں جو سب سے زیادہ مالدار ہوتا ہے وہی اس کے نزدیک سب سے زیادہ کامیاب رہتا ہے۔"

اب خود غور فرمائیے جس مملکت میں عہدے اور منصب بکتے ہوں، جہاں عیاشی اور رندی و بدمستی عام ہو اور جہاں کے خلفاء اور امراء خود غرض، آرام طلب، عشرت کوش اور عاقبت نااندیش ہوں اس کو صحیح معنی میں خلافت کہنا تو درکنار، کیا اسے ایک مسلم اسٹیٹ بھی کہا جا سکتا ہے؟

خلافت کے ٹکڑے خلافت جو کل عالمِ اسلام کے لئے تھی اس کے حصے بخرے تو تیسری صدی ہجری کے آخر میں ہونے لگے تھے۔ ایک طرف شمالی غربی افریقہ میں فاطمیوں نے اپنی امامت و خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور اب مصر کی طرف بھی ان لوگوں کی نگاہِ حرص و آز اٹھنے لگی تھی اور دوسری طرف عبدالرحمٰن ناصر امیر اندلس نے جو ۳۰۰ھ میں تخت نشین ہوا اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اس طرح خلافت کے تین ٹکڑے ہو ہی چکے تھے کہ راضی باللہ (از ۳۲۲ھ تا ۳۲۹ھ) کے عہد میں جو ملک اور صوبے خلافتِ بغداد سے ملحق تھے ان میں بھی خود مختار سلطنتیں اور حکومتیں قائم ہونے لگیں

چنانچہ فارس پر علی بن بویہ کا قبضہ تھا۔ رے، اصفہان اور جبل پر اس کے بھائی حسن بن بویہ نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ موصل دیار بکر و دیار ربیعۃ و مضیر پر بنو حمدان کی حکومت تھی۔ مصر اور شام، محمد بن طغج کے زیر نگین تھے پھر بنو فاطمہ کے پاس آگئے۔ خراساں اور شرقی علاقے نصر بن احمد السامانی کے قبضہ میں تھے۔ اب خلافت سمٹ سمٹا کر بغداد اور اس کے اطراف میں محدود ہو کر رہ گئی اور سچ تو یہ ہے کہ بغداد میں بھی خلیفہ کا اقتدار برائے نام ہی تھا ورنہ یہاں کے سپید و سیاہ کا اصل مالک راضی باللہ کا ایک وزیر ابن رائق تھا یہ واسط کا گورنر تھا۔ بعد میں اسے فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور امیر الامراء کے لقب سے بھی مشرف کیا گیا۔ کہا جاتا ہے خلیفہ نے بعد میں حکم دیدیا تھا کہ منبر پر خطبہ بھی ابن رائق کے ہی نام کا پڑھا جائے۔ [۱]

حنابلہ پر سخت تشدد پھر غضب یہ تھا کہ خلیفہ، وزراء اور اعمال وارکان سلطنت کی بدعملیوں کی وجہ سے خاص بغداد میں فسق و فجور کی جو گرم بازاری ہوگئی تھی اس کے انسداد کا انتظام و اہتمام دربار خلافت کی طرف سے تو کیا ہوتا۔ اگر اس کے لئے علماء حق اور ارباب عزیمت کی کوئی جماعت کھڑی بھی ہوئی تو الٹا اسی جماعت پر تشدد کیا گیا اور طرح طرح کی تہدید و تخویف کے ذریعہ انھیں ناکام کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ بغداد میں فسق و فجور کی کثرت و عام اشاعت دیکھکر امام احمد بن حنبل کے پیرو کاروں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اس طرح ادا کرنا شروع کیا کہ جس کسی گھر میں نبیذ دیکھی اسے بہا دیا اور جہاں کہیں کوئی گانیوالی عورت ملی اسے زد و کوب کیا۔ اس سے اہل بغداد کی عشرت کوشی میں خلل پیدا ہونے لگا تو شہر کے کوتوال نے اعلان عام کرا دیا کہ بغداد میں کسی ایک جگہ پر بھی دو حنبلی جمع نہ ہوں۔" ساتھ ہی خلیفہ راضی باللہ نے حنابلہ کے لئے ایک تہدید آمیز تحریر لکھی جس میں اس نے لکھا تھا "اگر تم لوگ اپنے قبیح مذہب اور طریق کج سے باز نہیں آئے تو میں تم لوگوں کے ساتھ مار پیٹ، قتل و قتال اور تفریق و تشتیت ہر قسم کا برا معاملہ کروں گا، تلواریں تمہاری گردنوں پر ہوں گی اور آگ، تمہارے گھروں اور مکانوں میں۔" [۲]

---

[۱] دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۱۱ ص ۱۲۳ - [۲] ایضاً ج ۱۱ ص ۱۲۴ و ۱۲۳ -

خلافتِ بغداد کا دم واپسیں

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے راضی باللہ کے عہد میں خلافت عملاً صرف بغداد اور اس کے نواحی واطراف میں محدود ہوگئی تھی ۳۲۹ھ میں اس کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد خلافتِ بغداد کے تخت پر سولہ خلفاء اور متمکن ہوئے لیکن خلافت کو اب جو گھن لگ چکا تھا۔ اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ درمیان میں کوئی کوئی خلیفہ ذاتی طور پر نیک دل اور حسّاس بھی ہوا لیکن نظامِ خلافت اس درجہ فاسد ہو چکا تھا کہ تنہا کسی ایک خلیفہ کی نیکی اس کی اصلاح کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ خلیفہ مختلف سلطنتوں اور حکومتوں کے درمیان ایسا مقید تھا جیسے ایک زبان دانتوں کے حلقہ میں محصور ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس کے اختیارات اس درجہ محدود تھے کہ وہ خود اپنی مرضی سے کوئی ایک کام بھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔ آخر کار ۶۵۶ھ میں اس نام نہاد خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ وزیر ابنِ علقمی کی سازش سے تاتاریوں کے ہاتھوں انتہائی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

یہ تھا اس دور کا حال جس کو خود تاریخ بھی خلافتِ عباسیہ کا دورِ زوال کہتی ہے۔ اب آئیے ذرا اس دورِ زوال کا جائزہ لیجئے جسے عام طور پر خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زریں کہا جاتا ہے؟ مگر یہ عہدِ زریں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لئے کس حد تک سرمایۂ فخر و مباہات ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مامون رشید جو اس دور کا گلِ سر سبد ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اس کے مسلک و مشرب کو اس شعر کا مصداق بتاتے ہیں ؎

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ　　　تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھکو

علوم و فنون کی ترقی اور زوالِ امت میں اس کا اثر

اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں نے اسلامی علوم و فنون کی تدوین کی اور دوسری زبانوں سے علومِ فلسفہ و حکمت کے تراجم کئے۔ صرف تراجم ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان علوم کے مسائل پر روشن دماغی کے ساتھ غور و خوض کر کے ان کی تنقید کی، ان کے معائب و اسقام کو طشت از بام کیا۔ اور مختلف علوم و فنون کی تدریس و اشاعت کے لئے مکاتب اور مدارس بلکہ یونیورسٹیاں قائم کیں۔ علماء کے

گرانقدر وظائف اور مشاہرے مقرر تھے اور وہ اطمینان سے اپنے علمی کاموں میں شب و روز مصروف و مشغول رہتے تھے پھر علمی کاموں کے علاوہ صنعت و حرفت، فنِ تعمیر اور شعر و ادب کو بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ادب و تاریخ کی کتابوں میں جو واقعات مذکور ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد تو مرد عورتیں بلکہ باندیاں تک اس زمانہ میں شعر و ادب کا بہت ستھرا اور شستہ مذاق رکھتی تھیں بات بات میں شعر کہتیں اور حاضر جوابی میں اپنا مثال نہیں رکھتی تھیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ علوم و فنون کی ترقی اور شعر و ادب کی گرم بازاری مسلمانوں میں بڑی حد تک ان میں دماغی بلند پروازی اور ذہنی ثقافت و عروج کے پیدا ہو جانے کا سبب ہوئی لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے اسلامی عقائد کی سادگی اور راسخ العقیدتی کو صدمۂ عظیم پہنچا اور یونانی علوم و فنون کی گرم بازاری نے خالص اسلامی افکار کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلمان عقیدہ و خیال کی وحدت سے کٹ کر ایک نہایت خطرناک قسم کی دماغی لامرکزیت میں مبتلا ہو گئے۔

مامون رشید نے ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کو لکھا کہ آپ کے پاس فلسفہ اور دوسرے یونانی علوم کی جو کتابیں ہیں وہ ہمارے پاس بھجوا دیجئے۔ شاہِ روم کو پہلے پہل تو مامون کی اس فرمائش کی تکمیل میں تردد ہوا لیکن جب یہاں کے بڑے پادری نے کہا کہ آپ ان کتابوں کو ضرور بھجوا دیجئے کیونکہ یہ کتابیں جہاں کہیں بھی ہوں گی ان سے دینی عقائد میں تذبذب پیدا ہو گا اور لادینی کو ترقی ہو گی" تو اس نے فوراً یہ تمام کتابیں دربارِ خلافت کے نذر کر دیں۔ پادری صاحب نے جو توقع ظاہر کی تھی وہ پوری ہو کر رہی۔

چنانچہ ان کتابوں کا اثر یہی ہوا کہ شرعی اور الٰہیاتی مسائل کے متعلق مسلمانوں کا طریقِ فکر بدل گیا۔ اور وہ ایک نئے انداز سے ہی اسلامی عقائد و افکار پر غور کرنے لگے، یہ نیا اندازِ فکر بے شبہ اس طریقِ فکر سے مغائر تھا جو قرآن مجید نے اپنے مخصوص اسلوب بیان اور طریقِ استدلال کے ذریعہ مسلمانوں میں پیدا کیا تھا اور جس کی وجہ سے ان میں مابعد الطبیعاتی حقائق کا اذعان اس درجہ

پختہ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کو کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔

قرآن مجید کا اصولِ تفہیم

قرآن مجید کا ایک عام اصول یہ ہے کہ وہ پہلے کسی چیز کی نسبت ایک خاص قسم کا فکر پیدا کرتا ہے پھر اس فکر کو شواہد و نظائر کے ذریعہ یقین کی صورت بخشتا ہے، اس کے بعد جب یہ یقین جذبہ کی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے تو اب اس پر ان اعمالِ صالحہ کی شاندار عمارت قائم ہوتی ہے جن کے بغیر کوئی مدنیت، مدنیتِ صالحہ نہیں بن سکتی۔ افسوس ہے کہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اجمالاً ایمان باللہ کو لیجئے۔ قرآن انسان کے ضمیر و وجدان کو بیدار کر کے خدا کے وجود اور اس کی صفات کا یقین پیدا کرتا ہے اور فلسفیانہ دلائل کی موشگافیوں میں نہیں الجھاتا یعنی جس طرح ایک نابالغ بچہ اپنے ماں باپ کو پہچانتا اور ان کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے مگر اس کا یہ یقین اس احساسِ تعلق پر ہی مبنی ہوتا ہے جو ماں باپ کی اس کے ساتھ غیر معمولی محبت و شفقت اور اس کے ہر قسم کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے متجاوز ہو کر اس کے والدین کے زناشوئی تعلقات کا علم بالکل نہیں ہوتا اور غالباً اسی وجہ سے بچہ کو اپنے ماں باپ کے ساتھ جو شیفتگی اور گرویدگی اور ان کے اوامر و نواہی کو بجا لانے کی جو آمادگی اس زمانہ میں ہوتی ہے وہ جوان ہو جانے کے بعد اس وقت باقی نہیں رہتی جبکہ اس کو والدین کے زناشوئی تعلق کا علم ہو جاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید انسانوں کو خدا کے وجود اور اس کی صفات کا جو یقین دلاتا ہے اس کے لئے وہ وہی طریقِ استدلال اختیار کرتا ہے جس سے ایک بچہ اپنے ماں باپ کے ماں باپ ہونے کا یقین رکھتا ہے، یہی طریقہ فطری ہے اور اس راہ سے انسان جس چیز کا یقین پیدا کرے گا اس پر اعمالِ صالحہ کی بنیاد قائم ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں کہیں منکروں اور کافروں کی جہالت کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں کے دماغوں میں عقل نہیں ہے بلکہ ان کے قلوب کے سر بمہر ہونے کا ماتم کیا ہے مثلاً "لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا"[1] یا

[1] عربی زبان میں تفقہ کے معنی وجدان سے کسی بات کو معلوم کر لینے کے ہیں جس کا تعلق قلب سے ہے (باقی صفحہ ۹۲ پر)

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ" اور ایک جگہ ارشاد ہے "اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا"

بہر حال یہ ہے وہ طریقِ فکر جو قرآن نے مسلمانوں میں پیدا کیا اور جس سے ان میں عقیدہ و عمل کی استواری پیدا ہوئی، اسی کا نتیجہ تھا کہ عہدِ صحابہ و تابعین میں مسلمان خدا کی نسبت صرف اس قدر جانتے اور اس پر ایمانِ کامل رکھتے تھے کہ خدا خالقِ کائنات ہے، ازلی اور ابدی ہے اور اس کی ذات تمام صفاتِ حسنہ کی مستجمع ہے۔

فلسفہ کا طریقِ استدلال

لیکن عہدِ بنی عباس میں جب یونانی فلسفہ کا زور ہوا تو اب مسلمانوں نے خدا کی نسبت بھی ایک دوسرے انداز سے سوچنا اور غور کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ایک طرف خدا کو علتِ تامہ یا علتِ اولیٰ و مطلقہ کہا اور دوسری جانب چونکہ فلسفۂ یونان کا کلیہ "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" "ایک سے صرف ایک ہی صادر ہو سکتا ہے"۔ ان کے نزدیک ناقابلِ تردید تھا۔ اس بنا پر انھیں عقولِ عشرہ ماننے پڑے۔ ان دونوں مسلمات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی نسبت جو یقین دلایا ہے وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہ سکتا۔

مثلاً قرآن کہتا ہے کہ خدا کے لئے مشیت ہے، ارادہ ہے اور اس سے جو افعال صادر ہوتے ہیں وہ اضطراراً نہیں بلکہ اختیار سے صادر ہوتے ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن فلسفۂ یونان کی اصطلاح کے مطابق اگر خدا کو عالم کے لئے علتِ تامہ کہا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا کے لئے نہ مشیت ہے اور نہ ارادہ ہے اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوا ہے اس میں خدا کے اختیار کو کوئی دخل نہیں بلکہ بالاضطرار ہوا ہے کیونکہ علتِ تامہ سے معلول کا صدور اختیار سے نہیں ہوتا پھر چونکہ علتِ تامہ اور معلول کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم اور تاخر نہیں ہوتا اس لئے فلاسفہ کو ماننا پڑا ہے کہ خدا کی طرح عقلِ اول بھی قدیم بالذات ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱) عقل سے جو بات دریافت ہوتی ہے اس کے لئے ادراک یا تعقل وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں بجائے عقل و فہم کے جس کا موضع سر ہے کافروں کے دلوں کا ذکر کرنا اور ان کو خالی از تفقہ بتانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ قرآن مجید جو یقین انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ انسان کی عقل کے بجائے اس کے ضمیر و وجدان سے اپیل کرتا ہے۔

اب خود غور فرمایئے کہ خدا کو عالم کی علتِ اولیٰ و مطلقہ قرار دیکر اگر اس کو مشیت، ارادہ اور اختیار سے محروم مان لیا جائے تو پھر اسلام تو درکنار کسی ایک مذہب کی عمارت بھی قائم رہ سکتی ہے ؟

وجود کی طرح خدا کی صفات کی نسبت بھی موشگافیاں کی گئیں اور اس سلسلہ میں عجیب عجیب طرح کی بحثیں پیدا ہوئیں۔ مثلاً پہلی بحث تو یہ تھی کہ صفات کا ذاتِ خداوندی کے ساتھ تعلق کیا ہے ؟ یعنی وہ عین ذات ہیں یا غیر ذات یا نہ عین ہیں اور نہ غیر پھر دوسری بحث یہ تھی کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے ؟ یعنی اگر علم بغیر معلوم کے نہیں ہو سکتا تو جب خدا کے سوا کوئی شے بھی موجود نہ تھی۔ اس وقت خدا کیونکر علیم ہوگا ؟ پھر خدا کی ذات و صفات سے قطع نظر دوسرے مسائل میں بھی اسی طرح کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کی گئی۔ مثلاً یہ کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے یا نہیں ؟ انسان مجبورِ محض ہے یا مختارِ مطلق یا نیم مجبور و نیم مختار۔ عقلی اعتبار سے تین احتمالات نکلتے تھے وہی تینوں احتمالات مستقلاً تین فرقوں کی بنیاد قرار پاگئے اور اس کا اثر عقیدۂ ثواب و عقاب پر ہوا۔

اسی سلسلہ میں قرآن کے متعلق بحثیں ہوئیں کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ اور اگر مخلوق ہے تو پھر وہ اللہ کا کلام کیونکر ہوا ؟ اور اگر غیر مخلوق ہے تو اس میں شانِ حدوث کیوں پائی جاتی ہے ؟ وحی کیونکر نازل ہوتی ہے ؟ خدا کے بولنے کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کا دیدار ممکن ہے یا ناممکن ؟ دوزخ کا عذاب ابدی ہے یا غیر ابدی۔ غرض یہ ہے کہ اس عہد میں شریعتِ اسلام کا کوئی نظری یا عملی مسئلہ ایسا نہیں تھا جس کو فلسفہ اور عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش نہ کی گئی ہو طبعی طور پر اس کا جو نتیجہ ہونا چاہئے تھا وہی ہوا مسلمانوں میں دماغی پراگندگی اور ذہنی انتشار پیدا ہوگیا، افکار و آراء کے مختلف اسکول قائم ہو گئے[1] اور عہدِ بنی امیہ میں چند در چند علمی کمزوریوں کے باوجود مسلمان اب تک جس مصیبتِ عظمیٰ سے محفوظ تھے یعنی عقیدہ و خیال کی کمزوری اور ابتری اب وہ اس کا بھی شکار ہو گئے۔ فلسفۂ یونان میں انہماک کے انھیں ہولناک نتائج کو دیکھکر علامہ جلال الدین سیوطی نے تو ایک مستقل کتاب ہی

---

[1] اگر آپ کو اس بحرانِ دماغی کی روداد معلوم کرنی ہو تو علامہ عبدالکریم شہرستانی اور ابنِ حزم ظاہری کی کتاب الفصل فی الملل والنحل اور الفرق بین الفرق مصنفہ ابو منصور عبدالقاہر بن طاہر بن محمد البغدادی المتوفی ۴۲۹ھ پڑھئے۔

یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی تھی کہ علومِ فلسفہ اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہے علامہ نے اس کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ تمام سلف کا اسی پر اجماع ہے [۵۱]

علمِ کلام فلسفہ اور مذہب کے امتزاج سے علمِ کلام کی بنیاد پڑی، جس کے معنیٰ یہ تھے کہ کسی شرعی حقیقت پر ایمان لانے کے لئے صرف قرآن اور حدیث کا بیان کافی نہیں ہے بلکہ وہ اس وقت تک درخورِ پذیرائی نہیں ہوگی جب تک کہ فلسفہ کی بارگاہ سے اس کی صحت کا فتویٰ صادر نہیں ہو جائیگا اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ لوگوں نے علم کے ذریعۂ اعلیٰ وحی و الہام کو چھوڑ کر اس کے ذریعہ ادنیٰ یعنی فلسفہ و استدلالِ منطقی کو اپنا ملجأ و ماویٰ بنا لیا۔ ایک یقین کی شاہراہ کو ترک کر کے ظن و گمان کے راستہ پر پڑ لینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی بنا پر شروع شروع میں علماءِ اسلام نے علمِ کلام کی شدید مخالفت کی اور اس کے پڑھنے پڑھانے کو ممنوع قرار دیا۔

چنانچہ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے تھے "اہلِ کلام کے بارہ میں میرا حکم یہ ہے کہ ان لوگوں کو کوڑوں اور جوتوں سے پٹوایا جائے اور قبیلوں اور محلوں میں ان کو ذلت کے ساتھ پھرایا جائے اور یہ اعلان ہوتا رہے کہ یہ سزا ہے اس شخص کی جس نے کتاب اور سنت کو چھوڑ کر اہلِ بدعت کے کلام پر توجہ کی"[۵۲] مگر جب انھوں نے دیکھا کہ دربارِ خلافت کی سرپرستی کے باعث یہ سیلاب رکتا نہیں، بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اسلامی عقائد و افکار کی بنیادیں متزلزل ہونے لگی ہیں تو اب انھیں مجبوراً ادھر کا رُخ کرنا پڑا۔ اس دور میں جن لوگوں نے دینی حقائق کی صحت کو معلوم کرنے کا ذریعہ فقط عقل کو بنایا ان کی مثال اس احمق کی سی ہے جو کسی گز سے سمندر کے پانی کو ناپنے کی کوشش کرتا ہے اور آخر کار سمندر کی وسعتوں اور پانی کی لہروں میں اپنے دیدۂ امتیاز کی صلاحیتوں کو گم کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اسی وجہ سے عارف رومی نے فرمایا ہے "پائے استدلالیاں چوبیں بود" یعنی دینِ قیم کی منزل وہ نہیں ہے جو اس مصنوعی پاؤں سے سر ہو سکے[۵۳]۔ اردو میں حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

---

[۵۱] شرح فقہ الاکبر ص ۳۔ [۵۳] حضرت علیؓ فرماتے تھے "اگر دین کا دارومدار قیاس (عقل) پر ہوتا تو (باقی صفحہ ۹۵ پر)

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک طرف امام غزالیؒ، ابن رشد اور امام رازی ایسے اجلّہ علماء اپنے مضبوط دلائل و براہین کے ذریعہ اور دوسری جانب متوکل باللہ عباسی اور سلطان سنجر جیسے بادشاہ جو فلسفہ کی اشاعت کو دینِ حق کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے اپنی طاقت و قوت سے فلسفہ کے ان فاسد اثرات کا تدارک نہ کرتے تو نہیں کہا جا سکتا کہ عہد بنی عباس کے دورِ زریں کا یہ شجر زہر اثر کیسے کیسے برگ و بار پیدا کرتا اور ان کے باعث اسلامی عقائد کو کتنا صدمۂ عظیم پہنچتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو گمراہیاں پیدا ہوئیں ان کا سرچشمہ دو ہی چیزیں ہیں، ایک حکومت و سلطنت کا فاسد نظام جس کی داغ بیل بنو امیہ کے ہاتھوں پڑی، دوسری چیز علوم و فنونِ عقلیہ کی گرم بازاری ہے جس کی سرپرستی کا شرف بنو عباس کو حاصل ہے اور جس کو اس دور کا سب سے بڑا قابلِ فخر کارنامہ کہا جاتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام علم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا یا علوم و فنون کی ترقی اسلام کی اسپرٹ کے منافی ہے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل چیز اسلامی وجدان ہے۔ اسلامی وجدان اگر زندہ ہے تو پھر خواہ کوئی علم حاصل کیا جائے (بشرطیکہ وہ وہم و سفسطہ میں مبتلا نہ کر دیتا ہو) کسی مسلمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا یہی وجہ ہے کہ جس فلسفہ نے الحاد و زندقہ عام کر دیا۔ اسی فلسفہ کی درسگاہ سے امام غزالیؒ۔ امام رازیؒ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) باطنِ خف (چرمی موزہ) پر مسح کرنا ظاہر خف پر مسح کرنے سے اولیٰ ہوتا" مولانا رومیؒ کا مشہور شعر ہے ؎

گر باستدلال کارِ دیں بدے فخر رازی رازدارِ دیں بدے

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو ایک مرتبہ سر سید احمد خاں نے لکھا "حضرت! دین کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔" مولانا نے جواب میں لکھا "آپ نے الٹا کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ عقل کی کوئی بات دین کے خلاف نہیں ہونی چاہئے" خلافت عباسیہ میں جو گمراہیاں پھیلیں ان کا سرچشمہ یہی تھا کہ اس دور میں علومِ عقلیہ کی گرم بازاری کے باعث دین کو عقل کے مطابق کرنے کی کوشش کی گئی۔ گویا یہ پہلے ہی تسلیم کر لیا گیا کہ عقل تو سراسر بے قصور اور بے خطا ہے۔ بنو امیہ کے دورِ آخر میں اس تحریک عقلیت کا آغاز ہو گیا تھا مگر اس کا عروج خلافتِ عباسیہ میں ہوا جبکہ فلسفہ کی شکل میں اس کا ایک بظاہر قوی مددگار پیدا ہو گیا۔

ابنِ رشد اور حافظ ابنِ تیمیہؒ وغیرہ ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، ان حضرات نے فلسفہ سے دین کی خدمت کا کام لیا، یہ نہیں کیا کہ دین کے لئے فلسفہ کو معیار بنا دیا ہو"

ہارون اور مامون رشید کے زمانہ میں یونانی علوم و فنون کے جو تراجم ہوئے ان میں زیادہ تر دخل یا تو غیر مسلموں کا تھا اور جن مسلمانوں کا دخل تھا ان میں اکثریت ایران سے تعلق رکھنے والوں کی تھی جن کے دلوں میں اسلامی عقائد اچھی طرح جانشین نہ ہوئے تھے اس بنا پر دراصل تباہی کا راز ہی یہ ہے کہ جو چیز دینی معلومات کے لئے اصل تھی یعنی قرآن و حدیث اس کو ثانوی حیثیت دیدی گئی اور جس چیز کو بعد میں رکھنا تھا اُسے پہلے درجہ میں رکھا گیا۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ عقلی علوم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جو اشیاءِ عالم کے خواص، ان کے نفع و ضرر اور ان کے طُرُقِ استعمال وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے علوم کے ساتھ اسلام کا کوئی تصادم نہیں ہوتا، ان کے علاوہ دوسرے علوم وہ ہیں جو حقائق مابعد الطبیعی سے بحث کرتے ہیں، ان علوم کی نسبت بے شبہ اسلام کا رجحان یہ ہے کہ آپ ان کو حاصل تو کر سکتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ انھیں حاصل کرنا چاہیے لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ آپ عقل کو اس کے اپنے دائرۂ عمل تک محدود رکھیں اور الٰہی تعلیمات کی نسبت آپ کا یقین ایسا قوی ہونا چاہیے کہ اگر ان دونوں میں تعارض نظر آئے تو آپ کو وحی و الہام پر شک و شبہ کرنے کے بجائے اپنی یا فلاسفہ کی عقل کا تخطیہ کرنے میں باک نہ ہو، غرض یہ ہے کہ اولاً ایک مسلمان بچہ کی تربیت اور تعلیم خالص اسلامی ہونی چاہیے اور جب اسلام کی تعلیمات اس کے دل اور دماغ پر چھا جائیں اور اس کا ذوقِ دینی پختہ تر ہو جائے تو اب وہ جو علم چاہے حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم علومِ مفیدہ کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہو"

اسلام پر صلیبی حملے

اسلام کا عروج یورپ کی نظر میں ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے اور اس بنا پر اسے جب کبھی موقع ملا ہے اس نے مسلمانوں کی سیاسی طاقت و قوت کا شیرازہ پراگندہ کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خلافتِ بنی عباس کے دورِ اول میں رومیوں نے بار بار حملے کئے مگر ہر دفعہ انھیں بڑی کامیابی سے پسپا کر دیا گیا۔

پانچویں صدی کے آخر میں خلافتِ عباسیہ کی حد درجہ کمزوری، اور انحطاط اور پھر مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں عالمِ اسلام کے تقسیم ہو جانے سے یورپ کو حوصلہ ہوا کہ اب پھر ایک نئی تنظیم کے ساتھ مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر اپنا تسلّط قائم کرنے کی جد و جہد شروع کرے چنانچہ ۴۷۸ھ میں اندلس کے علاقوں میں سے طلیطلہ اور دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ۴۸۲ھ میں جزیرۂ صقلیہ کا رخ کیا اور مسلمانوں کو اس سے بھی بے دخل کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے افریقہ کا ارادہ کیا اور اس کے بعض علاقوں پر بھی قابض ہو گئے۔ ۴۹۱ھ میں ان کے حوصلے یہاں تک بڑھے کہ خاص ملکِ شام پر جو مسلمانوں کی طاقت و قوت کا مرکز تھا۔ انھوں نے حملہ کر دیا[1]۔ اور انطاکیہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ مسلمان بڑے تزک و احتشام سے قوام الدولہ کربوقا کی زیرِ قیادت اہلِ فرنگ کے مقابلہ کے لئے مرج دابق میں جمع ہوئے۔ اس لشکر میں ترک اور عرب دونوں فوجیں شامل تھیں۔ مسلمانوں نے انطاکیہ پر پہنچکر حملہ کیا۔ شروع میں فرنگیوں کی حالت بہت نازک تھی۔ سامانِ حرب اور فوجیوں کی کمی کے علاوہ سامانِ رسد پہنچنے کے

---

[1] ملکِ شام پر فرنگیوں کے اس حملہ کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مصر میں علویوں کی حکومت تھی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ سلجوقیوں کی قوت و شوکت روز بروز بڑھ رہی ہے اور وہ غزہ تک شام میں آگھسے ہیں تو اب ان کو مصر کا خطرہ پیدا ہوا اور انھوں نے ہی اس خطرہ سے بچنے کے لئے اہلِ فرنگ کو شام پر قبضہ کر لینے کی دعوت دی۔ (ابن اثیر الجزری ج ۱۰ ص ۹۳)۔

ذرائع بھی مسدود تھے، لیکن سوءِ تدبیر سے یکایک حالت ایسی منقلب ہوئی کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ ہزاروں علما اور مجاہدین سپرِ تیغ ہوگئے اور بے شمار سامان دشمنوں کے ہاتھ آیا۔

اب عیسائیوں نے معرۃ النعمان کا رخ کیا۔ یہاں کے باشندوں نے بڑی ہمت اور دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن یہاں بھی فرنگیوں کی چال کارگر ہوگئی اور وہ شہر میں داخل ہو کر تین دن تک مسلمانوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ مورخ ابنِ اثیر الجزری کا بیان ہے کہ اس قتل عام میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے اور جو مرد اور عورتیں گرفتار ہوئیں ان کا تو شمار ہی مشکل ہے[۱]

ان کامیابیوں کے نشہ میں سرشار ہو کر اب صلیبیوں نے چاہا کہ بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیا جائے چنانچہ ۴۹۲ھ میں انھوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ تقریباً چالیس روز تک جاری رہا آخر کار ۲۷ر شعبان المعظم کو اہلِ یورپ بیت المقدس میں داخل ہوگئے اور اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی قتل و قتال کا بازار اس درجہ گرم کیا کہ جو علما، مشائخِ طریقت اور عُباد و زہاد اپنے وطنوں کو چھوڑ کر اس بلدۂ مقدسہ میں گوشہ گیر ہوگئے تھے اور اس قتلِ عام میں خاص مسجدِ اقصیٰ میں کام آئے صرف ان کی تعداد ستر ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔[۲] اس کے علاوہ نہایت بیش قیمت سونے اور چاندی کی قندیلیں جو مسجد میں جابجا آویزاں تھیں وہ سب لوٹ لیں۔ ان کے سوا جو مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا اس کا کوئی شمار ہی نہیں۔ اب اہلِ یورپ نے انطاکیہ، رُہا اور بیت المقدس اپنی تین ریاستیں قائم کر دیں۔

اسی سال اہلِ فرنگ نے مصر کا رخ کیا۔ امیر جیوش افضل نے ان لوگوں کے مقابلہ کی تیاریاں بڑے پیمانہ پر کی تھیں، لیکن فرنگیوں نے اہلِ مصر پر اچانک حملہ کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا اور ان کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں میں اور بھی چھوٹے بڑے کئی معرکے ہوئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لائقِ ذکر

---

[۱] ابن اثیر الجزری ج ۱۰ ص ۹۶۔ [۲] ایضاً ج ۱۰ ص ۹۸۔

وہ یورش ہے جو اہلِ یورپ نے ۵۴۲ھ میں کی تھی۔ اس یورش کا سبب یہ تھا کہ سلطان نورالدین زنگی نے صلیبیوں کی شوریدہ سری دیکھکر ان پر پے بہ پے کامیاب حملے کئے اور رُہا کو جو ان کا بڑا مستقر تھا فتح کرلیا۔

اس شکست سے صلیبیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور انھوں نے پاپائے روم سے درخواست کی کہ وہ اہلِ یورپ کو امداد کے لئے آمادہ کرے۔ پاپائے روم نے تمام یورپین ممالک میں اعلان کردیا کہ تمام عیسائیوں کو مقدس کلیسا اور مسیحیت کی حفاظت و بقا کے لئے ایک محاذ پر جمع ہوجانا چاہیئے نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور انگلستان سے آآکر صلیبی فوج جوق در جوق جمع ہوکر روانہ ہوئی شاہِ فرانس لوئس سابع اور شاہِ جرمنی کونراڈ بھی ساتھ تھے۔ غرض یہ ہے کہ یہ وقت تھا جبکہ اسپین اور پرتگال کو چھوڑ کر تمام یورپ پاپائے روم کی آواز پر جمع ہوگیا تھا اور مقدس کلیسا کے نام پر اسلام کو تہ و بالا کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت و قوت کے ساتھ امنڈ پڑا تھا۔

صلیبی حملوں کا دندان شکن جواب

اس وقت خلافتِ عباسیہ بے دست و پا تھی اور مختلف صوبوں اور ملکوں میں جو حکومتیں قائم تھیں وہ خود آپس میں دست و گریباں تھیں لیکن چونکہ اسلام دینِ برحق ہے اور اسے قیامت تک کے لئے اس دنیا میں رہنا ہے اس لئے خدا نے بنو عباس کو دینِ قیم کی حمایت و نصرت کی توفیق سے محروم کرکے پہلے سلجوقیوں کو اتنی طاقت و قوت عطا فرمائی کہ وہ صلیبیوں کی شورشوں اور ان کے فتنوں کا سدباب کرسکیں۔ چنانچہ ۴۸۹ھ میں یورپ سے جو پہلی صلیبی فوج روانہ ہوئی تھی اور ہنگری اور بلغاریہ کے باشندوں سے لڑتی لڑاتی اور لوٹ مار مچاتی ہوئی ایشیاء کوچک پہنچی تھی تو یہاں سلطان قلیج ارسلان سلجوقی نے ہی اس فوج کا اس بہادری اور دلیری سے مقابلہ کیا کہ اُسے بالکل ختم کرکے رکھدیا۔

سلطان نورالدین زنگی

پھر جب سلجوقیوں میں آپس میں پھوٹ پڑگئی اور اندرونی اختلافات کے باعث ان کی حکومت میں اضمحلال پیدا ہوگیا تو اب خدا نے صلیبیوں کا زور توڑنے کے لئے سلطان نورالدین زنگی اور اس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کے دست و بازو میں وہ طاقت و قوت دی کہ

انھوں نے اہلِ یورپ کے دم خم ڈھیلے اوران کے حوصلے پست کردیے۔ چنانچہ اٹلی، فرانس، جرمنی اور آسٹریا اور انگلستان ان سب نے متفق ومتحد ہوہوکر کئی مرتبہ ایشیائے کوچک اور شام پر حملہ کیا لیکن نورالدین زنگی کی شمشیر خارا شگاف نے ہر بار ان کو شکستِ فاش دیکر بھگا دیا۔ سلطان نے صرف مدافعت نہیں کی بلکہ صلیبیوں کے خلاف پے بہ پے حملے کرکے اُن سے رُہا کو چھین لیا جو صلیبیوں کا ایک بڑا مستقر تھا۔ سلطان نورالدین زنگی کے جنگی کارناموں اور فتوحات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

سلطان صلاح الدین ایوبی | سلطان نورالدین زنگی نے ۵۶۹ھ میں وفات پائی تو اب سلطان صلاح الدین ایوبی کو استقلال نصیب ہوا۔ اور مصر کے علاوہ شام، حلب، رہا، سنجار اور موصل پر بھی اس کا قبضہ ہوگیا۔ مصر اور شام کے اندرونی خلفشار کو دور کرنے اور یہاں کے حالات سے مطمئن ہوجانے کے بعد غازی مرحوم نے اپنی پوری توجہ صلیبیوں کی بیخ کنی پر مبذول کردی۔ چنانچہ ۵۷۲ھ میں سلطان صلاح الدین نے اہلِ یورپ کے ساتھ جہاد شروع کیا اور متواتر چودہ سال تک لڑکر ایک ایک شہر اُن کے قبضہ سے نکال لیا۔ یہاں تک کہ ۵۸۳ھ میں حطین، عکا، طبریہ اور عسقلان اور اس کے مضافات کو فتح کرلینے کے بعد سلطان خلد آشیاں نے بیت المقدس کو بھی صلیبیوں کے ہاتھوں سے چھین لیا اور یہ بلدۂ مقدسہ پھر فرزندان توحید کے قبضہ میں آگیا۔

بیت المقدس کا ہاتھ سے نکل جانا کوئی ایسا زخم نہ تھا جس کو صلیبی آسانی سے فراموش کردیتے چنانچہ پاپائے روم اربانس ثالث نے اب پھر شور مچایا اور ایک اور صلیبی جنگ کے لئے سب عیسائیوں کو آمادہ کردیا۔ اس معرکہ میں فرانس کا بادشاہ فلپ آگسس اور شاہ انگلینڈ رچرڈ شیر دل۔ دونوں اپنی اپنی جرار فوجیں لئے ہوئے بڑھے۔ اسٹریا کا بادشاہ فریڈرک بھی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس مرتبہ پھر شریک تھا۔ پھر بحری راستہ سے یہ سب لوگ فلسطین پہنچے۔ لیکن صلاح الدین کے مقابلہ میں کیا جم سکتے تھے بالآخر شعبان ۵۸۸ھ میں صلیبیوں نے مجبور ہوکر صلح کی پیش کش کی۔ سلطان صلاح الدین نے اپنے مشیران خاص سے مشورہ کرنے کے بعد اس کو منظور فرمالیا۔ اس سلسلہ میں ایک حلف نامہ

لکھا گیا جس کی رو سے یہ لڑائی ساڑھے تین برس کے لئے ختم ہوگئی اور سلطان فتح وظفر کا پھریرہ اڑاتا ہوا دمشق آگیا۔ یہیں ۵۸۹ھ میں ۵۷ سال کی عمر میں اس عالمِ فانی کو الوداع کہا۔ [1]

مرض الموت سے چند روز پہلے سلطان صلاح الدین نے اپنے بیٹے افضل اور بھائی ملکِ عادل کو بلا کر کہا "اب ہم فرنگیوں کی طرف سے تو بالکل مطمئن ہوگئے ہیں، ان شہروں میں اب ہم کو ان کا کوئی خطرہ نہیں رہا ہے۔ اس طرف سے فارغ ہونے کے بعد غازی صلاح الدین کا ارادہ تھا کہ روم کی طرف متوجہ ہوں تاکہ عیسائی خشکی کے راستہ سے بھی مسلمانوں کی طرف نہ بڑھ سکیں لیکن افسوس ہے کہ موت نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔

سلطان کی وفات پر حکومت کی تقسیم اور صلیبیوں کے حملے

سلطان نے امراء کے مشورہ سے اپنی زندگی میں ہی سلطنت کو اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا مصر کی حکومت عماد الدین عثمان کو ملی، دمشق نور الدین کو جس کا لقب ملک افضل تھا ملا۔ اور غیاث الدین ابو الفتح غازی کو ملک ظاہر کا

[1] اس موقع پر یہ جاننا بھی فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سلطان نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی یہ دونوں جس طرح بہت بڑے مجاہد تھے کہ انھوں نے صلیبیوں کا زور توڑ کر اسلام کا کلمہ اونچا کر دیا۔ اسی طرح وہ بیحد متقی، متواضع، رقیق القلب، عدل گستر، نیکدل اور بامروت وحلیم بھی تھے۔ کتابیں ان کے مناقب وفضائل سے پُر ہیں۔ صلاح الدین کے سلطان ہونے سے پہلے مصر میں دولتِ فاطمیہ قائم تھی۔ یہ لوگ چونکہ غالی شیعہ تھے اس لئے انھوں نے مصر میں رفض وشیعیت کو بہت کچھ فروغ دیا تھا۔ جامع ازہر میں باقاعدہ اسماعیلیت کا درس ہوتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ موذن اذان میں "حی علی خیر العمل" پکارنے پر مجبور تھے۔ سلطان صلاح الدین نے صاحب افسر واورنگ ہوتے ہی ان تمام مفاسد کی اصلاح کی۔ اسماعیلیت کے شعائر وآثار کو مٹایا۔ اور رعایا پر جو ناجائز ٹیکس لگے ہوئے تھے انھیں یک قلم موقوف کر دیا مذاہبِ اربعہ کی تعلیم وتدریس کا انتظام کیا۔ علما اور مشائخ کے وظیفے مقرر کئے۔ مدارس اور شفاخانے بنوائے۔ ملک کی زراعت کو ترقی دی اور ہر طرح رعایا کو خوش وخرم اور مرفہ الحال رکھنے کی کوشش کی۔ سلطان نور الدین زنگی کا حال بھی یہی تھا۔ شب وروز اسلام کی فلاح وبہبود اور اس کی ترقی وعروج کی مساعی میں مصروف رہتا تھا۔ تقوی کا یہ عالم تھا کہ اپنے نام جو تھوڑی بہت جائداد تھی اس کی آمدنی سے گذر کرتا تھا۔ بیت المال کا ایک پیسہ اپنے ذاتی صرف میں نہیں لاتا تھا۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ قدرت نے اس عام طوائف الملوکی کے زمانہ میں کس طرح نور الدین اور صلاح الدین سے اسلام کی حمایت واعانت اور اس کی بقا ونصرت کا کام لیا۔

لقب دیکر عراق عجم کا بادشاہ بنادیا۔ ان کے علاوہ جو اور بیٹے تھے ان کو چھوٹے چھوٹے اقطاع دیکر مطمئن کر دیا۔

مصر کا بادشاہ عماد الدین عثمان جس کا لقب ملک عزیز تھا بعض ذاتی خوبیوں کے باوصف امورِ سلطنت کی انجام دہی میں سست تھا۔ ۵۹۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اب ملک عزیز کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا جس کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ یہ دیکھکر صلاح الدین کے بھائی ملک عادل ایک فوج لئے ہوئے آیا اور خود حکومت پر قابض ہو گیا۔

ادہر یورپ میں جب خبر پہنچی کہ سلطان صلاح الدین کا انتقال ہو چکا اور حکومت کے تین ٹکڑے ہو گئے ہیں تو اب پھر پاپائے روم کی دعوت پر یورپ میں صلیبی جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس جنگ میں فرانس اور انگلستان کے بادشاہ تو شریک نہ ہو سکے البتہ فریڈرک کا بیٹا ہنری جو شاہِ آسٹریا تھا ایک فوج لیکر روانہ ہوا لیکن یہ لشکر جزیرۂ صقلیہ (سسلی) سے آگے نہ بڑھ سکا۔

۵۹۹ھ میں پاپائے روم اینوشان سوئم کی دعوت پر یورپ نے پھر جنگِ صلیبی کا ارادہ کیا لیکن ابھی یہ فوج راستہ میں ہی تھی کہ رومی شہنشاہیت کے کسی شخص نے جو قیصر سے کسی بات پر ناراض ہو گیا تھا صلیبی فوج کے قائدین سے کہا کہ قسطنطنیہ بیت المقدس کی کنجی ہے اگر اس کو فتح کر لیا جائے تو بیت المقدس بہت آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ قائدینِ فوج کو یہ بات پسند آئی اور زبردستی قسطنطنیہ میں داخل ہو کر انھوں نے اس کی مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ غرض یہ ہے کہ یہ لوگ رومیوں سے ہی الجھے رہے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں آسکے۔ کلیسا کو اس کا علم ہوا تو انھیں بہت لعنت ملامت کی۔[۱]

قسطنطنیہ پر قبضہ کر لینے کے بعد اب عیسائیوں کے لئے شام جانا نسبتہً سہل ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے ۶۰۰ھ میں بیت المقدس کو فتح کر لینے کے ارادہ سے ایک فوجِ عظیم کے ساتھ کوچ کیا اور عکا میں آکر ڈیرے ڈالدیئے اور اطراف واکناف کی اسلامی آبادیوں پر لوٹ مار مچانا شروع کر دیا۔ سلطان صلاح الدین کا بھائی ملک عادل دمشق میں تھا وہ شام اور مصر کی فوجیں جمع کر کے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے

---

[۱] ابن اثیر ج ۱۲ ص ۳، ۴۷، ۴۸ پر اس واقعہ کو مفصل لکھا ہے۔

بڑھا اور عکہ کے قریب ایک مقام پر لشکر انداز ہوا۔ امرا نے ہر چند کہا کہ آپ عیسائیوں کے ملک پر حملہ کیجئے لیکن ملکِ عادل اس وقت اس تجویز کو مصلحت کے خلاف سمجھکر خاموش رہا یہاں تک کہ ۶۰۱ھ میں ملک عادل اور اہلِ فرنگ دونوں کے درمیان صلح ہو گئی۔

۶۱۳ھ میں صلیبیوں نے پھر حملہ کیا اور اس مرتبہ چونکہ ان کی کثرت تھی اور ساز و سامان بھی بہت زیادہ تھا اس لئے انھوں شام کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا اور یہاں سے فارغ ہو کر ۶۱۵ھ میں مصر کی طرف بڑھے اور دمیاط پر قابض ہو گئے۔ اسی اثنار میں ملک عادل کی وفات ہو گئی اور اس کا بیٹا ملک کامل سریر آرائے سلطنت ہوا اس نے صلیبیوں کو دمیاط سے نکال باہر کیا۔

۶۳۵ھ میں ملک کامل کی وفات پر ملک سیف الدین ابو بکر جس کا لقب ملک عادل اصغر تھا تخت نشین ہوا، لیکن لہو و لعب میں وقت گذاری اور اپنے بھائی ملک صالح نجم الدین سے سخت نااتفاقی کے باعث ۶۳۷ھ میں قتل کر دیا گیا۔

اب ملک عادل اصغر کا بھائی ملک صالح تخت نشین ہوا، اسی کے عہد میں فرانس کے بادشاہ لوئس نہم نے دمیاط پر حملہ کیا ملک صالح بیمار تھا مگر اسی حالت میں مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار اسی اثنار میں انتقال ہو گیا۔ اس کی بیوی شجرۃ الدر نہایت عاقلہ تھی اس نے بادشاہ کی موت کو مخفی رکھا اور تمام فرامین پر خود اس کی طرف سے دستخط کرتی رہی۔ شجرۃ الدر کا بیٹا توران شاہ بلادِ کرد میں تھا۔ اب اس نے صلیب پرستوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بیٹے کو اپنے پاس بلا لیا۔ توران شاہ نے یہاں آکر اس بہادری اور دلیری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ لوئس نہم کو گرفتار کر لیا مگر بعد میں خود توران شاہ مارا گیا اور اب عنانِ حکومت شجرۃ الدر نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور فدیہ کی رقم خطیر کے بدلہ میں لوئس کو آزاد کر دیا۔

صفحاتِ بالا میں صلیبی لڑائیوں کا جو اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوا ہو گا کہ یہ وقت جبکہ تمام یورپ اسلام کی طاقت و سطوت کو ختم کرنے کے لئے امنڈ آیا تھا مسلمانوں کے لئے کس درجہ نازک اور خطرناک تھا۔ اس وقت اسلام کی مدافعت کا فرض سب سے پہلے خلفار بنو عباس پر عائد ہوتا تھا لیکن ان کی حیثیت صرف اتنی ہی رہ گئی تھی کہ دور بیٹھے ہوئے ان واقعات کا

نظارہ کرتے رہیں۔ خود عملی شرکت کرنے کے لائق نہ تھے۔ بغداد سے قطع نظر مصر میں جو دولتِ فاطمیہ قائم تھی اس کی حالت خلافتِ بغداد سے بھی گئی گذری تھی۔ فائز بنصر اللہ المتوفی ۵۵۶ھ کے عہد میں تو حالت یہ ہوگئی تھی کہ ہر سال صلیبیوں کو ایک بڑی رقم اس لئے بھیجنی پڑتی تھی کہ وہ مصر پر حملہ آور نہ ہوں۔

پس کوئی شبہ نہیں کہ ان حالات میں سلطان نورالدین زنگی، سلطان صلاح الدین ایوبی اوران کے بھائی اور بھتیجہ ملک عادل و کامل نے جس بہادری، جوش و خروش، ثبات و استقلال اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ صلیبیوں کا مقابلہ کرکے اسلام کی حمایت و نصرت کا فرض انجام دیا ہے وہ تاریخِ اسلام کا ایسا روشن باب ہے کہ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

سلاجقہ ان سلاطین کی طرح سلاجقہ نے بھی رومیوں کا زور توڑ کر اور خاص قونیہ کو اپنی حکومت کا مستقر بنا کر اسلام کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے اس موقع پر اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں سلطان الپ ارسلان کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ سلطان الپ ارسلان نے رومیوں کے ساتھ کئی معرکے کئے اوران میں کامیابی حاصل کی۔ آخر کار ۴۶۳ھ میں روم کے بادشاہ ارمانوس نے بڑی شاندار تیاریاں کیں اور دو لاکھ سپاہ کے ساتھ مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے کی نیت سے بڑھا جب بلادِ کرد پہنچا تو سلطان الپ ارسلان کو اس کی اطلاع ہوئی، الپ ارسلان اس وقت آذربیجان کے کسی علاقہ میں مقیم تھا۔ جہاں اس کے پاس صرف پندرہ ہزار سواروں کا ایک لشکر تھا۔ ادھر دشمن قریب تھا اور حلب وغیرہ سے کوئی کمک پہنچ نہیں سکتی تھی، چار و ناچار خدا کا نام لیکر شاہِ روم سے مقابلہ کے لئے بڑھا۔ کہاں دو لاکھ کا ایک لشکرِ جرار اور کہاں پندرہ ہزار سواروں کی ایک قلیل فوج۔

جنگ شروع ہونے سے قبل سلطان الپ ارسلان نے شاہِ روم کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ لیکن شاہِ روم کو اپنی کثرتِ سپاہ پر ناز تھا اس نے کہلا بھیجا "صلح تو اب "رے" میں ہوگی"۔ سلطان یہ جواب سنکر برافروختہ ہوگیا اور جنگ کی تیاری شروع کردی۔ عسکرِ شاہی کے امام اور فقیہ ابو نصر محمد بن عبد الملک البخاری الحنفی نے سلطان سے کہا "آپ اس دین (اسلام) کی حمایت و اعانت کے لئے لڑنے

جارہے ہیں جس کی فتح و کامرانی کا ذمہ اللہ نے لے لیا ہے اس بنا پر مجھکو قوی امید ہے کہ خدا نے آپ کے نام پر فتح لکھدی ہے۔ اب آپ یہ کیجئے کہ جمعہ کی نماز کے بعد دشمن کے مقابلہ میں روانہ ہوجائیے تاکہ نمازی نماز کے بعد مجاہدینِ اسلام کے لئے دعائیں مانگیں"۔

امام صاحب کے مشورہ کے مطابق سلطان الپ ارسلان نے یہی کیا، اگلے دن جمعہ تھا، پہلے سب مسلمانوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی۔ پھر بارگاہِ ایزدی میں اس عاجزی اور الحاح وزاری سے فتح وظفر کے لئے دعا مانگی کہ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ سلطان کے ساتھ تمام نمازی بھی اسی طرح زاروقطار روتے تھے۔ اس کے بعد سلطان نے کہا "جو شخص واپس جانا چاہتا ہے وہ بخوشی واپس چلا جائے۔ یہاں اب کوئی ایسا سلطان نہیں ہے جو امرونہی کرتا ہو، یہ کہکر سلطان نے تیروکمان الگ کردیئے اور تلوار وسنان زیب تن کرکے گھوڑے کی دم اپنے ہاتھ سے باندھی۔ پھر سپید کپڑے پہنے ان پر خوشبو لگائی اور کہا کہ اگر قتل کردیا جاؤں تو بس یہی سپید کپڑے میرا کفن ہوں گے۔ اب رومی اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوگئے۔ سلطان نے پہلے گھوڑے پر سوار ہوکر دشمن پر اس زور کا حملہ کیا کہ رومیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بیشمار آدمی مارے گئے خود شاہِ روم گرفتار کرلیا گیا۔ سلطان الپ ارسلان کے سامنے پیش ہوا تو کچھ گفتگو کے بعد ایک بہت بڑی رقم فدیہ لیکر متعدد شرطوں کے ساتھ اسے رہا کردیا گیا۔

اس جنگ میں بیشمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا جو عمدہ نسل کے گھوڑوں اور بہترین ہتھیاروں اور دوسرے قسم کے سازوسامان پر مشتمل تھا۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومیوں کے حوصلے پست ہوگئے اور مسلمانوں کی فوجی طاقت اس قدر مضبوط ہوگئی کہ رومیوں کو اس کے بعد پھر کبھی آذربیجان اور آرمینیہ پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ فتوحات کے علاوہ سلطان الپ ارسلان کو تعمیری کاموں سے بھی بڑا شغف تھا۔ چنانچہ اسی کے عہد میں وزیر نظام الملک نے بغداد میں مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد رکھی۔ ۴۶۵ھ میں چین کو فتح کرلینے کے ارادہ سے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ روانہ ہوا۔ لیکن ابھی دریائے جیحون کو ہی پار کیا تھا کہ موت کا پیغام آپہنچا۔

مورخینِ اسلام نے سلطان الپ ارسلان کے عہد کو اسلام کا دورِ ترقی و عروج کہا ہے اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ اخلاق و عادات، عمل و اعتقاد اور سیرت کے لحاظ سے سلطان نے اپنے بلند کیرکٹر کا جو نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ سلطان کی سلطنت میں خلافت کی جھلک نظر آتی تھی۔ سلطان کی مملکت بہت وسیع تھی علامہ ابنِ اثیر الجزری لکھتے ہیں۔

دان لہ العالم وبحق قیل لہ	عالم سلطان کا مطیع تھا اور اس کو "سلطانِ عالم"
سلطان العالم [1]	بجا طور پر کہا جاتا تھا

بنو حمدان ۳۳۰ھ میں حلب میں بنو حمدان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس خاندان کا گل سر سبد سیف الدولہ ابو الحسن علی بن ابی الہیجار تھا جس نے ابنِ خلکان کی روایت کے مطابق رومیوں سے چالیس مرتبہ جہاد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان غزوات میں میدانِ جنگ کا جو گرد و غبار اڑ کر سیف الدولہ کے چہرہ پر پڑتا تھا سیف الدولہ اس کو جمع کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ وفات کے وقت اس نے وصیت کی کہ جمع شدہ غبار سے ایک اینٹ بنائی جائے اور اسے لحد میں میرے سرہانے رکھ دیا جائے"۔

ابو الطیب متنبی سیف الدولہ کے دربار کا مشہور شاعر تھا اس نے اپنے قصائد میں کثرت سے سیف الدولہ اور قسطنطین ودمستق ملکِ روم کے حالاتِ جنگ کا ذکر کیا ہے اور رومیوں کی زبوں حالی اور پسپائی، قسطنطین کا قتل اور بطارقہ کی اسارت وغیرہ کا حال بیان کر کے سیف الدولہ کے غیر معمولی جذبۂ جہاد اور حیرت انگیز شجاعت و دلیری کی بڑی تعریف کی ہے۔

تاتاری حملے اور ان کا جواب صلیبیوں کی طرح ساتویں صدی ہجری کے وسط سے تاتاریوں نے ممالکِ اسلامیہ پر بڑے زور سے حملے شروع کر دیئے تھے یہاں تک کہ ۶۵۶ھ میں خلافتِ بغداد کا خاتمہ انھیں لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ بغداد کو تباہ کرنے کے بعد ان کے حوصلے دوچند ہو گئے اور انھوں نے دمشق اور سواحلِ شام پر قابض ہونے کے بعد اب مصر کا بھی ارادہ کیا۔

مصر میں دولتِ ایوبی کے خاتمہ کے بعد ۶۴۸ھ میں ممالیک بحریہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی،

[1] یہ تمام واقعات ابنِ اثیر الجزری ج ۱۰ - از ص ۲۲ تا ص ۲۶ سے ماخوذ ہیں۔

اس وقت اس خاندان کے پہلے فرمانروا معزجاشینگر کے قتل ہو جانے کے بعد اس کا پانزدہ سالہ لڑکا "ملک منصور نور الدین" تختِ سلطنت پر متمکن تھا اور سیف الدین محمود قطوزی جو بعد میں ملک مظفر سیف الدین کے لقب سے معروف ہوا، ملک منصور کی اتالیقی کرتا تھا، تاتاریوں کے سیلِ بلا نے جب دمشق اور سواحلِ شام میں نقل و حرکت شروع کی تو قطوزی نے ملک کے بڑے بڑے علما ارباب رائے اور امرا کو جمع کر کے کہا کہ "تاتاری مرکزِ خلافت کو تباہ کر چکے ہیں اب شام کی طرف آئے ہیں۔ یقین ہے کہ اس سے فارغ ہو کر مصر کا بھی رخ کریں گے۔ یہ وقت اسلامی سلطنتوں کے لئے بڑا سخت ہے۔ اس بنا پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مصر کے تخت پر ایک ناآزمودہ کار بچے کے بجائے ایسا تجربہ کار اور ہوشیار شخص بیٹھے جو وقت کی پیچیدگیوں کو سلجھا سکے۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور آخر کار ۶۵۷ھ میں ملک منصور کو تخت سے اتار کر خود قطوزی کو ہی مصر کا بادشاہ بنا دیا گیا جس نے ملک مظفر اپنا لقب رکھا

جو خطرہ تھا وہ ظہور میں آ کے رہا۔ ہلاکو نے دمشق اور سواحلِ شام پر قبضہ کر لینے کے بعد مصر کا رخ کیا۔ مگر حملہ آور ہونے سے پہلے ملک مظفر کو لکھا کہ تم اپنا ملک لڑے بغیر ہی میرے حوالہ کر دو، ورنہ اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو بغداد کا ہوا۔ مصری فوج نہایت بہادر تھی۔ کئی معرکوں میں صلیبیوں سے زور آزما کر انھیں شکست دے چکی تھی۔ اس لئے اس نے ہلاکو خاں کی دھمکی کی ذرا پرواہ نہ کی اور لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ ۶۵۸ھ کے ماہِ شوال میں عین الجالوت میں جو فلسطین کے مضافات میں سے ہے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ تاتاری فوج کا کمانڈر کتبغا قتل ہو گیا، اس کا بیٹا قید ہوا اور مصریوں کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔

اب ملک مظفر سیف الدین کے حکم سے رکن الدین بیبرس بندقداری تاتاریوں کے تعاقب میں روانہ ہوا اور آخر کار انھیں ملکِ شام کی سرحد سے نکال کر رہا۔

ملک ظاہر بیبرس ملک مظفر سیف الدین نے بیبرس بندقداری سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے تاتاریوں کو شام سے نکال دیا تو وہ اس کو حلب کا والی بنا دے گا۔ لیکن بیبرس جب کامیاب ہو کر واپس آیا، اور اس نے ولایتِ حلب کی شرط پوری کر دی تو ملک مظفر اپنے وعدہ سے منحرف ہو گیا۔ بیبرس نے

مشتعل ہوکر چند مالیک سے ساز باز کرلیا اور ملک مظفر کو جبکہ وہ سفر میں ہی تھا سپرد تیغ کردیا۔ اس کے بعد رکن الدین بیبرس خود ۶۵۸ھ میں تختِ سلطنت پر متمکن ہوا اور اپنے وزیر زین الدین کے ایمار سے اپنا لقب بجائے ملکِ قاہر کے ملک ظاہر رکھا۔ [1]

ملک ظاہر رکن الدین بیبرس بندقداری کا عہدِ سلطنت مصر کی اسلامی تاریخ میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے یہ اگرچہ ملک مظفر سیف الدین کا چاؤش تھا مگر نہایت بلند اخلاق، مدبر، بہترین سپہ سالار شریعت کا پابند اور عدل گستر و رحم دل تھا۔ اس نے اندرونی انتظامات میں ان تمام مفاسد کی اصلاح کی جو ملک مظفر سیف الدین کے عہدِ حکومت میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس سلسلہ میں اس نے تمام ناجائز ٹیکسوں اور محصولات کو بھی یکقلم موقوف کردیا جو اس کے تخت نشین ہونے سے پہلے سے چلے آرہے تھے۔

فرقہ باطنیہ کا استیصال | دولتِ فاطمیہ کے زمانہ میں فرقۂ باطنیہ نے بڑا فروغ پایا تھا اور اگرچہ ہلاکو نے ان کا زور بہت کچھ توڑ دیا تھا مگر ان کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ملک ظاہر کے عہد میں ان لوگوں نے پھر یورشیں برپا کرنی شروع کیں تو اس نے ان سب کو تہ تیغ کردیا اور ان کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ گمراہ ترین جماعت ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئی۔

تاتاریوں پر مسلسل فتحیابیاں | اندرونی انتظامات سے فارغ ہوکر سلطان رکن الدین بیبرس نے تاتاریوں کی طرف توجہ کی جنھوں نے عراق عجم اور شام و فلسطین کو اپنی فتنہ انگیزیوں کا میدان بنا رکھا تھا۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملک مظفر سیف الدین کے عہد میں جب تاتاریوں کو عین الجالوت میں شکست ہوئی تھی تو ملکِ ظاہر بندقداری نے ان لوگوں کا تعاقب کیا تھا اور شام کے حدود سے نکال دیا تھا، اب بندقداری کے عہدِ سلطنت میں تاتاریوں نے شام پر پھر یورش کی۔ ملک ظاہر نے ان کے مقابلہ کیلئے امیر قلاؤن کو بھیجا جس نے تاتاریوں کو متواتر شکستیں دیکر سرزمین شام کو ان کے وجود سے پاک کردیا۔

۶۷۵ھ میں تاتاریوں نے ہلاکو کے لڑکے اباقاخاں کی قیادت میں عراق عجم پر بڑے ساز و سامان اور شوکت و حشم کے ساتھ حملہ کیا۔ ملک ظاہر خود مقابلہ و مبارزہ کے لئے پہنچا، نہایت خونریز جنگ

---

[1] یہ سب واقعات حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و قاہرۃ ج ۲ ص ۳۶ سے ماخوذ ہیں۔

تھی۔طرفین سے بے شمار آدمی مارے گئے لیکن آخر میں فتح مسلمانوں کی رہی، تاتاری نہایت ذلیل ہوکر بھاگ گئے۔

صلیبی اگرچہ بہت کمزور ہوچکے تھے لیکن تاتاریوں کی طرح شورش برپا کرتے رہتے تھے، ملک ظاہر بیبرس نے اس سے بھی غفلت نہیں برتی چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد صلیبیوں نے شام کے جن علاقوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ملک ظاہر ۶۶۳ھ و ۶۶۴ھ میں دو سال تک برابر ان کے ساتھ لڑتا رہا اور آخر کار شام کے ایک ایک شہر سے ان کو نکال کر دم لیا۔

اس سے فارغ ہوکر مصر آیا۔یہاں پھر جنگی تیاریاں شروع کردیں اور جب وہ مکمل ہوگئیں تو ۶۶۶ھ میں فلسطین کے صلیبیوں پر حملہ کیا وہاں سے انطاکیہ بلکہ اس سے بھی آگے مقام مرقیہ تک فتح کرتا چلا گیا۔یہاں سے فارغ ہوکر اس نے بغداد کا رخ کیا اور آخر کار اسے بھی تاتاریوں کے قبضہ سے نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔قیساریہ جو کسی زمانہ میں آلِ سلجوق کا پایۂ تخت رہ چکا تھا اور اب آج کل وہ صلیبیوں کے قبضہ میں تھا جہاں سے یہ لوگ مسلمانوں پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ملک ظاہر بیبرس نے ۶۷۵ھ میں اس کو بھی فتح کرلیا۔

غرض یہ ہے کہ اندرونی انتظامات، عدل گستری وانصاف پروری اور فتوحات ان سب امور کے لحاظ سے ملک ظاہر بیبرس کا عہد حکومت مسلمانوں کی خوش بختی کا ایک روشن نشان ہے۔مصر کے دوسرے عباسی خلیفہ نے اپنے خطبہ میں بالکل صحیح کہا تھا کہ "جب دشمن (تاتاری) ہمارے گھروں میں گھس آئے تھے اور انھوں نے قیامت کے فتنے برپا کر رکھے تھے ایسے نازک وقت میں سلطان رکن الدین بیبرس اپنی چھوٹی سی سلطنت کے باوجود امتِ مسلمہ کی امداد و اعانت کے لئے اٹھے اور انھوں نے کفر کے لشکروں کو منتشر کرکے رکھدیا۔[۱]

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں "دوسری بڑی بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں ملک ظاہر کی حکومت ایسی ہے جیسے ایک سمندر کے سامنے کوئی نہر یا چھوٹا سا دریا، لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ دینِ

[۱] حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۴۸۔

حق میں جور ختنے پڑ گئے تھے اور مسلمانوں پر جو آفتیں اور مصیبتیں تو پر تو نازل ہو رہی تھیں اُن سب کا انسداد اسی چھوٹی سی حکومت کے ذریعہ ہوا۔" [۱]

ان کارناموں کے علاوہ ملک ظاہر کے ذاتی اخلاق و عادات سے متعلق مورخین نے جو واقعات نقل کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ملک ظاہر کہنے کو غلام تھا مگر درحقیقت اس پر عباسی خاندان کے کئی بڑے بڑے شریف النسب خلفاء قربان کئے جا سکتے تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے "۹ رجب ۶۶۰ھ کو ایک کنوئیں کے معاملہ میں رکن الدین بیبرس قاضی تاج الدین کے محکمہ عدالت میں آیا۔ اس وقت جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ قاضی نے بھی کھڑا ہونا چاہا مگر ملک ظاہر نے ہاتھ کے اشارہ سے انھیں منع کر دیا، اب عدالت میں باقاعدہ مقدمہ پیش ہوا، سلطان نے حکم شرعی کے مطابق مدعی ہونے کی حیثیت سے بینۂ عادلہ پیش کیا اور فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا۔ [۲]

۶۶۷ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوا تو تمام کعبہ کو خود اپنے ہاتھ سے عرقِ گلاب سے دھویا پھر مدینہ طیبہ پہنچکر روضۂ اقدس کی زیارت کی۔ وہاں دیکھا کہ لوگ قبر نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بہت قریب آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اس میں یک گونہ گستاخی پائی جاتی تھی، ملک ظاہر نے قبر مبارک کے چاروں طرف ایک کٹہرا بنوا دیا جو اب تک موجود ہے۔

محکمہائے عدالت میں جدت یہ کی کہ ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک امام کے مسلک کا الگ الگ ایک قاضی مقرر کیا۔ صدقات و خیرات بہت کثرت سے کرتا تھا رمضان میں جگہ جگہ فقراء اور مساکین کے لئے بڑے بڑے مطبخ کھلوا دیتا تھا جہاں ان کے افطار و سحر کے لئے نوع بنوع کھانے تیار کئے جاتے تھے بڑی بڑی جائدادیں اس لئے وقف تھیں کہ ان سے غریبوں اور محتاجوں کی تکفین و تدفین کا انتظام ہو۔ [۳]

ملک ظاہر فتح قیساریہ کے بعد دمشق میں مقیم تھا کہ وہیں بیمار ہو کر محرم ۶۷۶ھ میں انتقال ہوا۔

---

[۱] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۶۷۔ [۲] ایضاً ۲۶ [۳] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۶۶

تاتاریوں کا اسلام ملک ظاہر کے بعد بھی تاتاریوں کی شورشیں برابر جاری رہیں چنانچہ ۶۸۰ھ میں ہلاکو کے دو بیٹوں اباقاخاں اور منگو تیمور نے شام پر پھر بڑے زور شور سے لشکر کشی کی، فوج کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف منگو تیمور کی قیادت میں جو لشکر تھا اسی ہزار سواروں پر مشتمل تھا، ممالیکِ بحریہ کے سلسلہ کا پانچواں فرمانروا الملک منصور سیف الدین قلاوون اس زمانہ میں مصر کا بادشاہ تھا، اس نے یہ خبر سنکر اپنی فوج مرتب کی اور مقابلہ کے لئے بڑھا حمص کے قریب ۱۴ ر رجب المرجب کو نہایت گھمسان کا رن پڑا جس میں منگو تیمور مارا گیا اور اباقاخان شکست کھا کر ہمدان چلا گیا۔ یہاں اس کے بھائی نیکودار اوغلان نے اسے زہر دیکر مار ڈالا اور خود تختِ حکومت پر قابض ہو گیا پھر اسلام قبول کر کے اپنا نام احمد خاں رکھا، اور اب مصریوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ یہاں تک کہ دونوں میں باہمی تعاون و اشتراک کا ایک عہد نامہ بھی لکھا گیا۔

بادشاہ احمد خاں کے مسلمان ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے یہاں تک کہ قوبیلائے قاآن کے پوتے انندہ سلطان جو ختا کا حاکم تھا اس نے بھی اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے ساتھ اسلام قبول کر لیا اور شب و روز عبادت میں بسر کرنے لگا۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

غور کیجئے کیا یہ امر اسلام کے قیامت تک باقی رہنے کی دلیل نہیں ہے کہ جو تاتاری پچاس سال تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے شدید ترین وبالِ جان بنے رہے اور جنھوں نے اسلامی حکومتوں اور مسلمان آبادیوں کو تباہ و برباد کر دینے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ اب وہ خود اسلام کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں اور اب ان کی تمام جنگی اور انتظامی صلاحیتیں اسلام کی سربلندی و سرفرازی کی کوششوں میں صرف ہوتی ہیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے ✧ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

خلافتِ عباسیہ بغداد کا ہیرو کون تھا؟ بغداد کی خلافتِ بنی عباس پر گفتگو کے آخر میں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک اس خلافت کا ہیرو کون تھا، تاکہ آپ کو بوضاحت معلوم ہو سکے کہ ہمیں ایک خلیفہ یا سلطان کو کس معیار پر جانچنا چاہئے اور کون شخص اسلامی نقطۂ نظر سے کسی سلطنت

یا خلافت کا ہیرو بن سکتا ہے۔

عام مورخینِ اسلام مامون رشید کو خلافتِ بنی عباس کا ہیرو کہتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ اس شرف کا جامہ اگر خلفاء بنی عباس میں سے کسی کے قامتِ موزوں پر راست آتا ہے تو وہ دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور ہے۔ اگرچہ سفاح کی طرح اس کے مزاج میں بھی تشدد اور سخت گیری کا غلبہ تھا۔ چنانچہ اس نے علویہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس معاملہ سے کم نہیں تھا جو سفاح نے بنو امیہ کے ساتھ کیا تھا۔ تاہم اس کی ذہنیت بڑی حد تک اسلامی تھی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ ایک خلیفۂ اسلام کا فرض محض علوم و فنون کی اشاعت نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر اس کا اہم اور ضروری فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اعمال و اخلاق کی نگرانی کرے، بدعقیدتی سے ان کو بچائے، ان کے لئے کسب و اکلِ حلال کے وسائل و ذرائع مہیا کرے، سوسائٹی کو برے رسوم و عادات سے محفوظ رکھے اور سیاسی طاقت و قوت کو اتنا مضبوط بنا دے کہ دشمنوں کو اس پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہو سکے۔

منصور کے عہد میں اخلاقِ اسلامی کی نگرانی

اس احساسِ فرض کے باعث منصور نے ایک طرف تو طرابلس الشام وغیرہ میں رومیوں نے جو شورشیں پیدا کر رکھی تھیں ان کو دبا دیا۔ اندرونِ ملک خراسانیوں کے بل بوتے پر جو لوگ اپنے اہوارِ فاسدہ کو بروئے کار لانا چاہتے تھے ان کی سرکوبی کی اور دوسری جانب اس نے اس بات کی سخت نگرانی رکھی کہ مسلمان لہو و لعب اور مخربِ اخلاق مشاغل سے مجتنب رہیں۔ خلیفہ ہونے کے باوجود خود اس کا یہ حال تھا کہ مورخ طبری[1] کے بیان کے مطابق محل شاہی میں ایک دن کے سوا لہو و لعب یا کوئی لغویات کبھی نہیں دیکھی گئی۔

ایک مرتبہ اسے محل میں کچھ شور سنائی دیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک جگہ گانا ہو رہا ہے، فوراً جوتہ پاؤں میں ڈال روانہ ہو گیا، موقع پر پہنچ کر دیکھا کہ ایک غلام طنبورہ بجا رہا ہے اور چند باندیاں جو اس کے اردگرد جمع ہیں ہنس ہنس کر داد دے رہی ہیں۔ منصور کو دیکھتے ہی یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ اب اس نے حکم دیا کہ طنبورہ غلام کے سر سے دے مارا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور طنبورہ

[1] طبری ج ۹ ص ۲۹۴۔

ٹوٹ گیا۔ اس واقعہ کے بعد منصور نے غلام کو اپنے پاس رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور اسے محل سے نکال کر فروخت کرا دیا۔

اس کے علاوہ منصور کو شراب نوشی سے بھی نفرت تھی خود تو پیتا ہی نہیں تھا، دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اپنے دسترخوان پر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بختیشوع طبیب مہمان شاہی ہوا اور اس کے سامنے منصور کے حکم سے کھانا رکھا گیا تو اس میں شراب نہیں تھی، بختیشوع چونکہ عیسائی تھا اور مذہباً اس کے لئے شراب جائز تھی اس لئے اس نے دسترخوان پر شراب کا مطالبہ کیا، جواب ملا "ان الشراب لا یشرب علی مائدۃ امیر المومنین" امیر المومنین کے دسترخوان پر شراب نہیں پی جا سکتی۔ بختیشوع بولا "تو پھر میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گا" منصور کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بختیشوع کی کوئی پروا نہیں کی اور کہنے لگا "اچھا وہ کھانا شراب کے بغیر نہیں کھا سکتا تو نہ کھائے۔"

یہ واقعہ صبح کے کھانے کے وقت پیش آیا تھا شام کو جب کھانا آیا تو بختیشوع نے پھر دسترخوان پر شراب کی خواہش ظاہر کی۔ اس مرتبہ پھر اس کو وہی جواب ملا مگر اب اس نے کھانا کھایا اور اس کے بعد دجلہ کا پانی پیا تو بولا "میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی چیز شراب کی قائم مقام بھی ہو سکتی ہے لیکن واقعی دجلہ کا پانی پی کر شراب پینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی" [۱]

منصور عام خلفاء بنی عباس کے برخلاف فضول خرچی اور اسراف و تبذیر سے بھی سخت پرہیز کرتا تھا۔ کسی شاعر کے کسی شعر سے اگر خوش ہوتا بھی تھا تو اُسے بہت معمولی سی رقم دیکر خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ بصرہ کے قاری ہیثم نے منصور کے سامنے آیت "ولا تبذر تبذیرا" پڑھی تو اس نے دعا مانگی "اے اللہ تو مجھکو اور میری اولاد کو ان چیزوں میں فضول خرچی کرنے سے بچا جو تو نے اپنے لطفِ خاص سے ہم کو مرحمت فرما رکھی ہیں۔" اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی ہر چیز میں کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں اور لینے دینے میں میانہ روی کو ملحوظ رکھتا تھا وہ سمجھتا تھا کہ خزانہ قوم کی امانت ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس امانت کو اپنے ذاتی حظِ نفس میں صرف کرے۔

[۱] طبری ج ۹ ص ۳۰۹۔

منصور کے سلیم الطبع ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی فعل و عمل پر کسی کی زبان سے نکتہ چینی سن کر چیں بجبیں نہیں ہوتا تھا، بلکہ اگر بات حق ہوتی تھی تو اسے فوراً قبول کر لیتا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ افریقہ کا ایک قاضی دربارِ خلافت میں حاضر ہوا جو طالب علمی میں منصور کا ساتھی رہ چکا تھا منصور نے اس سے پوچھا "تم کو میری حکومت اور بنو امیہ کی حکومت میں کیا فرق نظر آیا اور تم اس طویل سفر میں ہمارے جن جن علاقوں سے گذرتے ہوئے آئے ہو ان میں نظم و نسق کا کیا حال ہے؟ قاضی نے جواب دیا "اے امیر المومنین! میں نے اعمالِ بد اور ظلم و جور کی کثرت دیکھی ہے، پہلے تو میرا گمان یہ تھا کہ اس ظلم و جور کا سبب آپ کا ان علاقوں سے دور ہونا ہے لیکن میں جتنا قریب آتا گیا معاملہ اسی قدر نازک ہوتا گیا" خلیفہ منصور نے یہ سن کر اپنی گردن جھکا لی، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر کہا "مگر میں لوگوں کا کیا کروں؟" قاضی نے جواب دیا "کیا آپ کو معلوم نہیں ہے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے تھے "لوگ بادشاہِ وقت کے تابع ہوتے ہیں۔ بادشاہ اگر نیک ہو گا تو رعایا بھی نیک اور صالح ہو گی اور اگر بد ہے تو رعایا نیک نہیں ہو سکتی"

منصور کی عاقبت اندیشی، دور بینی، سیاسی مہارت و بصیرت اور نیک نیتی کا اندازہ اس وصیت نامہ سے ہو سکتا ہے جو اس نے وفات سے چند روز پہلے اپنے بیٹے مہدی کو دیا تھا، ابنِ جریر نے طبری میں اور ابنِ اثیر الجزری نے کامل میں اس وصیت نامہ کو بتمام و کمال نقل کیا ہے، الفاظ میں اختلاف ہے مگر دونوں کا حاصل ایک ہے ذیل میں اس کا خلاصہ نقل کرنا بے محل نہ ہو گا۔

"اے بیٹے! کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو میں نے تمہارے لئے ہموار اور مہیا نہ کر دی ہو، میں تم کو چند باتوں کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ میرا گمان ہے کہ تم ان میں سے ایک پر بھی عمل نہیں کرو گے" یہ کہکر منصور نے ایک صندوقچی منگوائی جس میں متعدد رجسٹر تھے، یہ صندوقچی مقفل رہتی تھی اور سوائے کسی ایک معزز شخص کے کوئی اور اس کو نہیں کھول سکتا تھا۔ منصور نے صندوقچی کھول اور اس میں سے رجسٹر نکال مہدی کے حوالے کئے اور کہا کہ تم ان کو بڑی حفاظت سے رکھنا، ان میں تمہارے

ؔ۱ طبری ج ۹ ص ۳۱۹

آبا کا علم محفوظ ہے۔ اگر کوئی اہم معاملہ پیش آجائے تو پہلے بڑے رجسٹر میں اس کا جواب تلاش کرنا اگر اس میں نہ ملے تو پھر دوسرا اور تیسرا رجسٹر دیکھنا اسی طرح ساتوں رجسٹر دیکھ جانا۔ اگر ان میں سے کسی میں بھی تمہارے سوال کا جواب نہ ملے تو پھر چھوٹا رجسٹر دیکھنا۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس میں تم کو اپنے معاملہ کے متعلق ضرور کوئی ہدایت ملے گی۔

اس کے بعد منصور نے بعض امور کی نسبت مہدی کو خاص خاص ہدایتیں کیں اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہو۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا

(۱) شہر بغداد کا خاص خیال رکھنا۔

(۲) میں نے بیت المال میں اس قدر روپیہ جمع کر دیا ہے کہ اگر دس برس تک بھی تم کو خراج کی رقم پوری وصول نہ ہو تو تمہیں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ تم اس روپیہ کو لشکریوں کی تنخواہوں، مستحقین کے وظائف و عطیات اور سرحدوں کے انتظامات پر خرچ کرنا۔

(۳) اہلِ خاندان اور اعزا و اقارب کے ساتھ صلہ رحمی اور ملاطفت کا معاملہ کرنا کہ انہی سے تمہاری عزت و آبرو ہے۔

(۴) ہر کام میں تقوٰی و طہارت اور عدل و انصاف کا خیال رکھنا کیونکہ جس بادشاہ میں یہ اوصاف نہیں ہیں درحقیقت وہ بادشاہ ہی نہیں۔

(۵) کسی معاملہ میں عورتوں کو مشیر کار نہ بنانا۔ اور جب تک کسی معاملہ میں خوب غور و خوض نہ کر لو اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرنا۔

منصور کو یقین تھا کہ اس نے جو وصیت لکھی تھی وہ اس کی موت کے بعد شرمندۂ عمل نہیں ہوگی، اسی لئے اس نے ہر جملہ کے بعد "وما اظنک تفعل" میرا گمان ہے کہ تم اسے نہیں کرو گے" کہا ہے۔

منصور کے بعد ۱۵۸ھ میں مہدی خلیفہ ہوا۔ اس نے اپنے عہدِ خلافت میں متعدد اچھے اور تعمیری کام کئے لیکن سب سے بڑا اور شاندار کارنامہ یہ ہے کہ اس نے زنادقہ کے اس فتنہ کا سختی کے ساتھ مقابلہ کیا جو متعدد اسباب و وجوہ سے مسلمانوں میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے

ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کا امیر عمر الکلواذی نام ایک شخص تھا اس محکمہ کے لوگوں کا کام یہ تھا کہ وہ ڈھونڈھ کر زندیقوں اور ملحدوں کو پکڑ کر لاتے تھے اور پھر ان کو قرار واقعی سزا ملتی تھی۔ بشار بن برد اس زمانہ کا ایک مشہور زندیق شاعر تھا۔ ایک مرتبہ مہدی بصرہ میں آیا اس کے ساتھ حمدویہ تھا جو زندیقوں کی جستجو اور ان کا کھوج لگانے کی خدمت پر مامور تھا یہاں کہیں بشار حمدویہ کے ہاتھ لگ گیا۔ مہدی کے سامنے اس کا معاملہ پیش ہوا تو اس نے حمدویہ کو حکم دیا کہ اسے سخت ترین سزا دی جائے۔

لیکن مہدی کا یہ اقدام وقتی اور ہنگامی طور پر تو مفید ہوا، زیادہ دیرپا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے یعنی یہ کہ زندقہ والحاد جن اسباب سے پیدا ہو رہا تھا ان کے استیصال کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ حرم شاہی میں غلمان وجواری کا عمل دخل بڑھ رہا تھا۔ دربار میں بدعقیدہ عجمیوں کے اثرات ترقی کر رہے تھے اور عام مجالس ومحافل میں ابونواس اور بشار بن برد ایسے مطلق العنان شاعر رندی وسیہ مستی کے جذبات پیدا کر رہے تھے۔ مدارس ومکاتب میں درس قرآن وحدیث کے بالمقابل فلسفہ و عقلیات نے اپنی ایک مستقل درسگاہ قائم کر لی تھی، سامانِ عیش وعشرت کی فراوانی نے عہدِ شباب کی لذت اندوزیوں کے ارمانوں کو دلوں میں بیدار کر دیا تھا۔ محتسب خود پیرِ مغاں کے دستِ کرم پر بیعت کر چکا ہو تو میخانہ کے دروازہ پر قفل کون لگائے؟

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا　　　فلا تلما: لاولاد فیہ علی الرقص

جب صاحبِ خانہ ہی طبل بجا رہا ہو تو گھر میں اولاد کو ناچنے پر ملامت نہ کرو۔

علامہ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ کی جلد اول کے شروع میں بعض محدثین اور علماءِ ربانیین کے وہ اقوال واشعار نقل کئے ہیں جو انھوں نے بغداد سے متعلق کہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ لہو ولعب اور عیش وطرب کی اس فضاءِ رنگین میں خدا کے ایسے پاک بندے بھی کثیر تعداد میں موجود تھے جو تقویٰ وطہارت اور ثقاہت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس صورتِ حال پر سخت مضطرب اور پریشان تھے لیکن ان بزرگوں کی حالت اس شعر کا مصداق تھی۔

دلم بپاکیِ دامانِ غنچہ می لرزد　　　کہ بلبلاں ہمہ مستند وباغباں تنہا

مصر میں خلافتِ عباسیہ کا دوبارہ قیام

فتنۂ تاتار کی بادِ صرصر سے بغداد میں خلافتِ بنی عباس کا چراغ گل ہو گیا تو ساڑھے تین سال تک (۱۴ صفر ۶۵۶ھ سے رجب ۶۵۹ھ تک) مسندِ خلافت بالکل خالی پڑا رہا۔ یہاں تک کہ ابو القاسم احمد جو ظاہر بامر اللہ کا بیٹا، خلیفہ مستعصم کا چچا اور مستنصر کا بھائی تھا اور جو بغداد میں مستعصم کے قتل کے وقت قید تھا کسی طرح رہا ہو کر چند لوگوں کی معیت میں عراق آیا پھر اس نے مصر کا ارادہ کیا۔ سلطان رکن الدین بیبرس نے قاضی تاج الدین اور وزرا و علما اور دیگر اعیان و امرا کے ساتھ آگے بڑھ کر استقبال کیا اور اس خوشی میں تمام شہر کی بڑے پیمانہ پر آئینہ بندی کرائی بروز دوشنبہ ۱۳ رجب المرجب خاص دیوانِ شاہی میں ایک بڑا شاندار اجتماع ہوا جس میں سلطان اور ابو القاسم احمد کے علاوہ تمام علما اور وزرا و امرا اپنے اپنے مدارج کے مطابق شریک تھے۔ اس اجتماع میں قاضی تاج الدین کے نزدیک جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ابو القاسم واقعی اپنے دعوئ نسب میں سچا ہے اور قاضی القضاۃ نے بھی کھڑے ہو کر اس کا اقرار کر لیا تو سب سے پہلے شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام نے ابو القاسم کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔ پھر سلطان رکن الدین نے اور سلطان کے بعد قاضی تاج الدین نے اور پھر تمام شرکائے اجتماع نے بیعت کر لی۔ اب اس نے اپنے بھائی کے لقب پر اپنا لقب بھی مستنصر باللہ رکھا اور خطبوں میں اور سکوں میں اسی کا نام رائج ہو گیا اس طرح مصر میں دوبارہ خلافتِ عباسیہ کا قیام ہوا۔

۱۷ رجب کو جمعہ کے دن خلیفہ اپنے خدم و حشم کے ساتھ ایک شاندار جلوس کی صورت میں جامع مسجد آیا۔ یہاں ایک خطبہ پڑھا جس میں بنو عباس کے شرف و مجد کا ذکر تھا اور سلطان رکن الدین بیبرس کے لئے دعائیں کی گئی تھیں۔ اس کے بعد منبر سے اتر کر نماز پڑھائی۔ مسلمان جو اس وقت یہاں موجود تھے اس منظر سے بڑے متاثر ہوئے پھر دوسرے مہینے یعنی ۴ شعبان المعظم کو قاہرہ کے باہر ایک میدان میں ڈیرے خیمے لگا دیئے گئے تھے خلیفہ اور سلطان وزرا اور اعیان دربار کے ساتھ یہاں مجتمع ہوئے اور یہیں خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے سیاہ خلعت اور سیاہ عمامہ سلطان کو پہنایا پھر تمام بلادِ اسلامیہ کے معاملات کا نظم و نسق سلطان کے حوالہ کر کے اسے "امیر المومنین" کے لقب سے مشرف کیا[1]

[1] حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۴۴ و ۴۵۔

اس میں شبہ نہیں کہ علمار کرام اور سلطان نے بڑی حد تک دینی جذبہ کے ماتحت ہی خلافت کا احیار کیا تھا وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ تمام مسلمانانِ عالم کو ایک مرکز سے وابستہ رکھنے کے لئے خلافت کا قیام کس درجہ ضروری ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ خلافت محض برائے نام ہی خلافت تھی اور اس سے وہ مقصد کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو اسلام کے خلیفۂ وقت سے حاصل ہونا چاہئے تھا جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے۔ خلیفہ کے اقتدار اور اس کی سیاسی طاقت وقوت کا یہ حال تھا کہ سلطان رکن الدین بیبرس، جس کے لطف وکرم سے اس کو خلافت کی مسند پر بیٹھنا نصیب ہوا تھا، اس کو خلیفہ از خود "امیر المومنین" کا لقب دیتا ہے حالانکہ یہ لقب خلیفہ کے سوا کسی اور کے لئے موزوں نہ تھا، اور پھر تمام بلادِ اسلامیہ کے معاملات کا انصرام وانتظام سلطان کے سپرد کر کے خود فارغ ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ گویا بحیثیت خلیفہ اس کو نہ اب کوئی کام کرنا ہے اور نہ اس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے۔

کہنے کو مستنصر باللہ خلیفہ تھا لیکن درحقیقت پورا اقتدار رکن الدین بیبرس کے ہاتھ میں تھا خلیفہ کی حیثیت محض ایک تبرک کے مانند تھی جس کے وجود کو پرانے زمانہ کی کسی رسمی یادگار کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا ہو۔ دوسرے ملوک وسلاطینِ اسلام پر تو اس خلافت کا کیا اثر ہوتا۔ خود مصر میں اس کا کوئی وقار نہیں تھا۔ سلطان رکن الدین چونکہ ذاتی طور پر نہایت بلند اخلاق کا مسلمان تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی میں خلافت کا قرار واقعی احترام باقی رکھا۔ لیکن ایک ہی نیام میں دو تلواریں آخر کب تک تصادم سے محفوظ رہ سکتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان بیبرس کے چند سال بعد ہی تیسرے خلیفۂ عباسی مستکفی باللہ اول (از ۷۰۱ھ تا ۷۴۰ھ) کو سلطان مصر محمد بن قلاؤون نے کسی بات پر ناراض ہو کر ۷۳۶ھ میں برجِ قصر میں نظر بند کر کے لوگوں کو اس سے ملنے جلنے سے منع کر دیا پھر ۷۳۷ھ میں اس کو مع اہل وعیال ودیگر متعلقین قاہرہ سے نکال کر مقام قوص میں بھیجدیا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ آئندہ سے کسی خطبہ میں مستکفی کا نام نہ لیا جائے۔ شعبان ۷۴۰ھ میں وفات پائی۔

مرتے وقت مستکفی نے وصیت کی تھی کہ اس کے بعد اس کے بیٹے احمد کو خلیفہ بنا دیا جائے، لیکن سلطان مصر نے اس کی بھی پروا نہیں کی اور حاکم بامر اللہ کے پوتے ابراہیم بن محمد کو واثق باللہ کا

لقب دیکر خلیفہ بنادیا۔لیکن اس کی خلافت بھی برائے نام ہی تھی خطبوں تک میں اس کا نام نہیں لیا جاتا تھا

محمد بن قلاؤن کے بعد اس کا بیٹا سیف الدین ابوبکر مصر کا سلطان ہوا، اس نے ۷۴۱ھ میں ایک دربار عام کیا اور اس میں قاضی القضاۃ سے مشورہ لینے کے بعد واثق باللہ کو معزول کرکے اس کی جگہ احمد بن مستکفی کو خلیفہ بنادیا۔

غرض یہ ہے کہ مصر کا عباسی خلیفہ سلطانِ مصر کے رحم و کرم پر جیتا تھا، وہ کسی سیاسی اقتدار کا مالک نہ تھا۔خلیفہ سلطان کے دستِ اقتدار میں بازیچۂ طفلاں سے کم نہ تھا۔ اس بنا پر بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز اور شرمناک واقعات بھی پیش آجاتے تھے۔ چنانچہ خلفاء عباسیہ مصر کے سلسلہ کے ساتویں خلیفہ متوکل علی اللہ کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ پیش آیا۔ ۷۶۳ھ میں متوکل خلیفہ بنایا گیا تھا۔لیکن سلطانِ مصر ایک بدگمانی کے باعث اس سے ناراض ہوگیا۔اس نے خلیفہ کو نظر بند کرکے قوص بھیجدیا اور اس کی جگہ ذکریا بن واثق کو خلیفہ بناکر معتصم کا لقب دیدیا۔لیکن یہ خلافت عجیب قسم کی تھی کہ نہ تو خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور نہ اجماع ہوا، آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ پندرہ دن کے بعد پھر متوکل کو بحیثیتِ خلیفہ قاہرہ میں بلالیا گیا۔

آٹھواں خلیفہ مستعین باللہ چونکہ بڑا عالی حوصلہ، خوددار اور صاحب ہمت بلند تھا۔اس لئے اس نے جرأت سے کام لیکر قدم آگے بڑھایا اور سلطانِ مصر ناصر زین الدین بن برقوق کو گرفتار کراکے قتل کرادیا جس کی وجہ سے سلطنتِ مصر کا تخت بھی اب اسی کے قبضہ میں آگیا۔جو مسلمان خلافت کی بے دست و پائی پر دل ہی دل میں گھٹتے اور افسوس کرتے تھے ان کو اب طبعی طور پر خوشی ہونی چاہئے تھی، لیکن افسوس ہے کہ یہ خوشی کچھ زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوسکی۔ایک امیر شیخ محمودی نے اتنا اقتدار حاصل کرلیا کہ مستعین کو خلافت اور سلطنت دونوں سے معزول کرکے ایک قلعہ میں نظر بند کردیا اور اس کے بھائی داؤد بن متوکل کو خلیفہ بناکر خود سلطانِ مصر بن بیٹھا۔

مستعین باللہ کے بعد بھی بعض خلفاء نے سلطنتِ مصر پر قبضہ کرنا چاہا لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے یہ سلسلہ اسی طرح یوں ہی چلتا رہا یہاں تک کہ ۹۲۳ھ میں سلطان سلیم اول نے مصر کو فتح کیا اور سلطنت کے

ساتھ ساتھ خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا اور خود خلیفہ بن گیا۔ اس دن سے خلافت بنو عباس کے قبضہ سے نکل کر آلِ عثمان کے پاس چلی آئی۔

بغداد اور مصر کی خلافت عباسیہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام چونکہ خدا کا آخری دین ہے اور اس کو قیامت تک دنیا میں رہنا ہے اس بنا پر جب کبھی اس میں کسی ایک طرف سے ضعف اور اضمحلال پیدا ہوا تو جلد یا بدیر کسی اور جہت سے اس کی تلافی ہو گئی۔ چنانچہ جب خلافت بیجان ہو گئی اور وہ اسلام کی سیاسی مرکزیت کو سنبھالنے کے قابل نہ رہی تو خدا نے اس کی اس کمزوری کا تدارک کرنے کے لئے اسی خلافت کے "سایۂ عاطفت" میں چند اور دوسری حکومتیں اور سلطنتیں پیدا کر دیں جنھوں نے اس فرض کو باحسن وجوہ انجام دیا جو درحقیقت اولاً خلافت پر عائد ہوتا تھا۔ چنانچہ افریقہ کے اغالبہ نے جس کا ہیرو زیادۃ اللہ اغلبی ہے بحر روم کے مشہور اور اہم جزیرہ سائپرس کو فتح کیا۔ سلجوقیوں نے ایشیاء کوچک کی عیسائی حکومت کو شکست دیکر اس پر قبضہ جما لیا۔ ایوبی خاندان کے بہادروں نے صلیبیوں کو بیت المقدس اور شام وغیرہ سے بے دخل کیا۔ غزنویوں اور غوریوں نے ہندوستانی ممالک پر تسلط حاصل کیا۔ پھر جب خلافت مصر میں چلی گئی تو ممالیکِ بحریہ نے تاتاریوں کے فتنۂ جہاں آشوب کو فنا کرنے میں غیر معمولی ہمت و حوصلہ اور عزم و جسارت کا ثبوت دیا اور تقریباً ڈھائی سو سال تک مرکزِ اسلام کے مغربی دروازہ کی پاسبانی کرتے رہے۔

آلِ عثمان

جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے سلطان سلیم اول نے ۹۲۳ھ میں مصر فتح کیا اور وہاں سے خلافت اور سلطنت دونوں کا خاتمہ کر کے خلافت کو آلِ عثمان کی طرف منتقل کر لیا۔ آل عثمان کی حکومت کی بنیاد ۶۹۹ھ میں پڑی تھی جبکہ ارطغرل نامی ایک ترکستانی امیر کے بڑے بیٹے عثمان خان اول نے دولتِ سلجوقیہ کے دارالسلطنت قونیہ میں آخری سلجوقی تاجدار علاء الدین ثانی کے مارے جانے کے بعد افسرِ شاہی سر پر رکھا۔ اس طرح گویا دولتِ سلجوقی کے کھنڈروں پر آلِ عثمان کی سلطنت کا قصرِ رفیع الشان تعمیر ہوا۔ ابتدائً یہ سلطنت ایک چھوٹی سی ریاست تھی اور اس کے اطراف وجوانب میں تیرہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ایشیائے کوچک میں پھیلی ہوئی تھیں۔

عثمان خاں اول کا کیرکٹر عثمان خان اول نہایت شجاع، عالی حوصلہ، نیک عمل اور اسلام کا سچا شیدائی تھا اس نے تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے ہی ایشیائے کوچک کے رومی امراء کو کہلا بھیجا کہ اسلام قبول کرو، ورنہ جزیہ دو اور اگر یہ بھی منظور نہیں ہے تو جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، اس کے جواب میں بعض امراء تو واقعی مسلمان ہو گئے۔ بعضوں نے جزیہ دینا قبول کر لیا اور اکثر ایسے تھے جو جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے، عثمان خان نے اپنے بیٹے اور خاں کی قیادت میں ایک لشکرِ جرار ان امراء سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا۔ دشمنوں کو تاتاریوں سے بڑی امداد پہنچی تھی مگر اس کے باوجود ان لوگوں کو پے بہ پے شکستیں ہوئیں، لیکن عثمان خان اول کے کارناموں میں یہ فتوحات ضمنی حیثیت رکھتی ہیں اس کی توجہ کا اصل مرکز بازنطینی سلطنت تھی جس سے کامل دس بارہ سال تک وہ جنگ وپیکار میں مصروف رہا اور آخر کار اس نے بازنطینی سلطنت کے اہم قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر کے اپنی فتوحات کا دائرہ بحرِ اسود کے ساحل تک پھیلا دیا اور شہر نیق پر قبضہ کر کے اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔

۷۱۷ھ میں شہر بروصہ کا محاصرہ کیا جو ایشیاء کوچک میں سلطنت بازنطینی کا نہایت اہم شہر تھا، یہ محاصرہ دس سال تک جاری رہا۔ بالآخر ۷۲۷ھ میں اہلِ قلعہ قیصرِ روم کے حکم سے ایک رات موقع پاکر نکل بھاگے اور ترکی فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ عثمان خاں نے اس فتح کا مژدۂ جانفزا بسترِ مرگ پر سُنا۔ اورخاں جب یہ خوشخبری لیکر باپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو باپ نے بیٹے کی ہمت و شجاعت کی داد دیکر اس کو اپنا قائم مقام بنایا اور وصیت کی کہ "ظاہر و باطن ایک رکھنا، ہر کام میں خوفِ خدا اور مرضیِ مولا کا لحاظ رکھنا، لوگوں پر رحم کرنا، اداحقوق کے معاملہ میں زور آور اور کمزور و ناتواں دونوں کو ایک نگاہ سے دیکھنا، کتاب و سنت کو اپنا دستور العمل بنائے رکھنا۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں جدوجہد کرنا اور احکامِ شریعت سے کبھی سرتابی نہ کرنا، اس کے بعد ہدایت کی کہ مجھکو بروصہ میں ہی دفن کیا جائے۔ چنانچہ وصیت کے مطابق انتقال کے بعد بروصہ میں ہی دفن کیا گیا اور ایک شاندار مقبرہ اس پر تعمیر ہوا۔

آلِ عثمان کی حکومت ۶۹۶ھ سے ۱۳۴۲ھ تک جبکہ اس خاندان کے آخری فرمانروا سلطان عبدالمجید ثانی کو معزول کرکے خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا چھ سو تینتالیس سال رہی۔ اس طویل مدت میں ۳۷ فرمانروا ہوئے جن میں سے سلطان بایزید ثانی (۸۸۶ھ تا ۹۱۸ھ) تک آٹھ فرمانروا سلاطین کہلائے پھر سلطان سلیم اول نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تو اب یہ خود اور اس کے بعد کے تمام فرمانروایانِ عثمانی خلیفہ کہلانے لگے۔

مسلسل فتوحات اور اسلام کا یورپ میں داخلہ

عثمان خاں کی وفات کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ رکا نہیں بلکہ اس نے بازنطینی حکومت کو ختم کرکے اسلام کو یورپ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل کرنے کی جو مہم شروع کی تھی اس کے لائق جانشینوں نے اس کے بعد بھی اس کو برابر کامیابی کے ساتھ جاری رکھا اور آخر کار انھیں اپنے مقاصد میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ عثمان خاں کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا اورخاں تختِ سلطنت پر بیٹھا تو اس نے اندرونی انتظامات و اصلاحات کے علاوہ اپنی توجہ یورپ کی طرف بھی مرکوز رکھی۔ اس بنا پر موقع پاتے ہی اس نے گیلی پولی پر قبضہ کر لیا

جو دردانیال کے ساحل پر ایک بڑا اہم قلعہ تھا۔ فتح سے قبل ایک سخت زلزلہ کے باعث گیلی پولی کی شہر پناہ بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ اورخاں نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کے ذریعہ اس کو درست کرایا اور پھر یہاں ترکی فوج کا ایک زبردست دستہ متعین کر دیا پھر تھریس کے چند اور مقامات بھی فتح کر لئے اور عربوں اور ترکوں کی کثیر آبادی کو ان مقبوضات میں لا کر آباد کر دیا۔

"دولتِ عثمانیہ" کے فاضل مصنف محمد عزیز صاحب ایم، اے کے بقول "گیلی پولی کی فتح سے ترکوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ۷۵۵ھ مطابق ۱۳۵۴ء میں انھوں نے پہلی بار فاتح کی حیثیت سے یورپ میں قدم رکھا اور مسیحی یورپ میں عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو دو صدیوں کے اندر گیلی پولی سے دیانا کی دیواروں تک پھیل گئی۔ قرونِ اولیٰ کے مجاہدوں نے دینِ حق کے پیغام سے مغربی یورپ کو بہرہ ور کیا تھا اور اپنے علوم کی روشنی اس کے ظلمت کدہ میں پہنچائی تھی لیکن مشرقی یورپ پر ہنوز تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کی سرزمین ایک مشعل ہدایت کی منتظر تھی، یہ سعادت عثمانیوں کے ہاتھوں کے لئے مقدر ہو چکی تھی، عرب مجاہدوں نے جس فرض کی تکمیل یورپ کے مغربی حصہ میں کی تھی، ترک مجاہدوں نے اسے مشرق میں پورا کیا۔"[1]

اورخاں نے اپنی فتوحات اور ملکی و فوجی انتظامات کے باعث بازنطینی حکومت کو اس درجہ مرعوب کر دیا تھا کہ قسطنطنیہ کی حکومت جو حضرت معاویہؓ کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں کی حریف رہی تھی اب اس کے قیصر کنٹاکوزین نے دولت عثمانیہ کے ساتھ اپنی دوستی مضبوط کرنے کی غرض سے اپنی نوجوان بیٹی تھیوڈورا کو اورخاں کے حبالۂ عقد میں دینے کی پیش کش کی۔ اورخاں نے اس کو منظور کر لیا اور شہزادی کو اپنے دین مسیحیت پر ہی قائم رہنے کی اجازت دی۔

اورخاں غیر معمولی اولو العزم بہادر اور حوصلہ مند ہونے کے علاوہ یوں بھی نہایت مدبر نیک اور شریعت کا پابند تھا، اس نے رفاہِ عام کے کاموں کے سلسلہ میں جو مساجد، مدارس، خانقاہیں، پل، لنگر خانے، رباط اور حمام وغیرہ بنوائے، ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے۔ ۷۶۱ھ میں جبکہ اس

[1] دولتِ عثمانیہ ج ۱ ص ۳۶ و ۳۷۔

کی عمر ۸۲ سال کی تھی وفات پائی۔

سلطان مراد اول اورخاں کا بڑا لڑکا سلیمان پاشا شکار میں گھوڑے سے گر کر باپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو چکا تھا۔ اس لئے اس کی وفات کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا سلطان مراد اول تخت نشین ہوا، اس نے بھی اپنے باپ اور دادا کی روایات کو باقی رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی چنانچہ اس نے اردگرد کے امرار کو جنھوں نے انگورہ کے امیر علاء الدین کے اکسانے پر آلِ عثمان کی طاقت کو کمزور کرنے کی غرض سے یورش کی تھی شکستِ فاش دی اور انگورہ پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد جزیرہ نمائے بلقان کی طرف توجہ کی اور اورنہ کو فتح کر کے اس کو اپنا دار السلطنت بنالیا۔

اس وقت اگرچہ سلطنتِ بازنطینی اور دوسری مسیحی حکومتیں باہمی خانہ جنگیوں میں مبتلا تھیں مگر اب سلطان مراد کی فتوحات اور اس کے فوجی و ملکی استحکامات کو دیکھکر ان سب کو خطرہ پیدا ہوا اور یہ سب طاقتیں پوپ کی دعوت پر جمع ہوگئیں اور صلیب و مسیحیت کے نام پر انھوں نے سلطان مراد سے جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مراد اس وقت شہر بیجا کا محاصرہ کئے ہوئے ایشیائے کوچک میں پڑا تھا، اتحادیوں کے ان منصوبوں کی اطلاع پاتے ہی وہ فوراً یورپ کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے قبل ہی اس کا بہادر جرنیل لالہ شاہین دریائے مرتضیٰ کے کنارہ پر پہنچکر اتحادی افواج پر جبکہ وہ شراب وکباب کی سرمستیوں میں سرشار تھیں ایک ایسا کامیاب شبخون مار چکا تھا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ جان بچا کر نکل بھاگے تھے۔

۱۳۸۰ء میں شاہِ سرویا، فرمانروائے بلغاریہ کو اپنے ساتھ متحد کر کے پھر سلطان مراد کی طاقت توڑنے کے لئے آیا، لیکن دونوں کو جلد ہی اپنی کمزوری کا یقین ہوگیا اور انھوں نے خراج کے طور پر سالانہ ایک بڑی رقم دینے کی شرط پر صلح کرلی۔ شاہِ بلغاریہ نے مزید یہ کیا کہ اپنی بہن بھی سلطان کے نکاح میں دیدی۔

۱۳۸۹ء میں اتحادیوں نے جن میں سرویا، بوسینا، بلغاریہ، البانیہ، ولاچیا، ہنگری اور پولینڈ، یہ سب ریاستیں شامل تھیں متحدہ و متفق ہو کر دو لاکھ فوج کے ساتھ ترکوں کو یورپ سے نکال باہر کرنے

کے ارادہ سے اقدام کیا۔ مراد اس وقت بروصہ میں مقیم تھا اور بہت بوڑھا ہو چکا تھا، تاہم مقابلہ کے لئے فوراً روانہ ہو گیا صحرائے کسووا میں نہایت گھمسان کا رن پڑا، لیکن اتحادیوں کو اس میں بھی شدید ناکامی ہوئی شاہ سرویا لازار گرفتار ہو کر سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اس نے بار بار کی غداری کے جرم میں اس کو قتل کرا دیا۔

اس جنگ کے بعد تھریس، مقدونیا اور جنوبی بلغاریہ کے تمام علاقے دولتِ عثمانیہ کے مقبوضات میں شامل ہو گئے اور سرویا اور سینا باج گذار ریاستیں بن گئیں۔

ابھی جنگ کسووا ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک نابکار سروی نے دھوکہ سے سلطان مراد پر خنجر کا ایسا کاری زخم لگایا کہ سلطان چند روز کی تکلیف کے بعد انتقال کر گیا اور اسی پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

سلطان بایزید ایلدرم | جنگِ کسووا میں سلطان مراد اول کے بڑے بیٹے بایزید نے غیر معمولی شجاعت و دلیری کا اظہار کیا تھا اور اسی وجہ سے اس کو "ایلدرم" (بجلی) کہا جاتا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد میدان کسووا میں ہی باتفاق امراء و ارکانِ سلطنت تخت نشین ہوا۔

سلطان بایزید ایلدرم نے تخت نشین ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چھوٹے بھائی یعقوب پاشا کو جس نے جنگِ کسووا میں غیر معمولی دلیری اور جاں بازی کا ثبوت دیا تھا محض اس گمان پر قتل کرا دیا کہ شہزادہ کو تختِ سلطانی حاصل کرنے کی آرزو ہے اور اس بنا پر اس کی طرف سے حکومت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آلِ عثمان میں بڑے بھائی کے ہاتھ سے محض تختِ سلطنت کی خاطر چھوٹے بھائی کا یہ پہلا قتل تھا جو ان کی پیشانی پر بدنامی کا داغ بن کر چمکا۔

اس ایک داغِ رسوائی سے قطع نظر سلطان ایلدرم نے فتوحات کے سلسلہ میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں وہ بے شبہ اسلام کی تاریخ فتوحات کا ایک روشن باب ہیں۔ اس نے سرویا کے مقتول بادشاہ کے بعد اس کے بیٹے کو جانشین کیا اور خراج کی رقم سالیانہ کے علاوہ شرط کی کہ شاہ سرویا پانچ ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ ہر وقت سلطان کی خدمت کے لئے وقف رکھیگا۔ شاہ سرویا نے اس شرط کو بھی منظور کر لیا اور مزید اعتماد حاصل کرنے کے لئے اپنی بہن شہزادی ڈیسپینا سلطان کے نکاح میں دیدی۔

سرویا سے اس طرح تعلق استوار کرنے کے بعد بایزید قسطنطنیہ کی طرف متوجہ ہوا اور آخر کار قیصر روم کو مجبور کیا کہ وہ ایک اور جدید عہد نامہ پر دستخط کرے جس سے قیصر کی رہی سہی حیثیت بھی خاک میں مل گئی۔ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سلطنت کا صرف ایک مقبوضہ قلعہ فلاڈلفیا رہ گیا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے وہ بھی بایزید کے قبضہ میں آگیا۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ انتہائی حیرت سے سنا جائے گا کہ قلعہ فلاڈلفیا معاہدہ کے رو سے بایزید کا ہو چکا تھا لیکن قلعہ کے یونانی افسر نے قیصر کا حکم ماننے اور بایزید کا اس پر قبضہ کرانے سے انکار کر دیا۔ بایزید نے قیصر سے کہا کہ تم خود اپنی فوج بھیج کر قلعہ فتح کرو اور پھر اسے ہمارے قبضہ میں دیدو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا قیصر روم نے اسے پہلے فتح کیا اور پھر اسے بایزید کے حوالے کر دیا۔ ظاہر ہے دولتِ عثمانیہ کے سامنے بازنطینی حکومت کی بے بسی اس سے بڑھکر اور کیا ہو سکتی تھی؟ پھر بایزید نے صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ خاص قسطنطنیہ کی نسبت قیصر روم سے عہد لیا کہ قسطنطنیہ کا ایک محلہ مسلمانوں کی آبادی کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا۔ ان کو شہر میں ایک جامع مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ہوگی اور ان کے معاملات و خصومات کا فیصلہ کرنے کے لئے ان کا ایک قاضی بھی الگ ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ شہر سے باہر جو انگور کے باغ اور ترکاریوں کے کھیت تھے ان کا دسواں حصہ (عشر) بھی عثمانی خزانہ میں داخل ہوتا تھا۔ کہتے ہیں اسی وقت سے عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو استنبول کہنا شروع کیا۔[1]

فتوحات اب تک بایزید نے بغیر لڑے ہی کامیابیاں حاصل کی تھیں، اب میدانِ جنگ میں بھی اپنی شمشیر خاراشگاف کے جوہر دکھانے کا موقع آگیا۔ سرویا اور قسطنطنیہ سے معاہدے کر لینے کے بعد بایزید نے ولاچیا کا رخ کیا اور اسے بھی اپنا باج گذار بنا لیا۔ اسی اثنا میں ہنگری کے بادشاہ سجمنڈ نے بایزید پر حملہ کرنے کے لئے بہت فوجیں جمع کر رکھی تھیں۔ ولاچیا سے فارغ ہو کر بایزید نے ہنگری کا رخ کیا، بوسنیا کی فوجیں بھی ہنگری کی افواج کے دوش بدوش تھیں۔ گھمسان کا رن پڑا اور انجام کار شاہِ ہنگری کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔

[1] ہربرٹ گبنس بحوالہ دولت عثمانیہ ج اص ۵۷

۷۹۵ھ میں بایزید نے اپنے بڑے لڑکے سلیمان پاشا کو بلغاریہ کی طرف روانہ کیا جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے اس کا جنوبی حصہ سلطان مراد کے زمانہ میں ہی دولتِ عثمانیہ میں شامل ہو چکا تھا۔ شمالی حصہ رہ گیا تھا۔ شاہ بلغاریا نے جم کر مقابلہ کیا لیکن تین ہفتوں کے محاصرہ کے بعد دارالسلطنت کا سقوط ہو گیا اور اب پورا ملک عثمانی مقبوضات میں داخل ہو گیا۔ بلغاریا کا شاہی خاندان ختم ہو گیا اور اسقفِ اعظم جلاوطن کر دیا گیا۔ یہاں کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا ان کی زمینیں انھیں کے قبضہ میں رہنے دی گئیں، باقی سارا علاقہ فوجی جاگیروں کی شکل میں ترکوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

صلیبی اتحاد بلغاریا کے فتح ہو جانے سے ترکوں کے لئے ہنگری کا راستہ کھل گیا۔ اس لئے اب شاہِ ہنگری سجسمنڈ کو شدید خطرہ لاحق ہوا۔ اس نے یورپ کے بادشاہوں کو اکسایا۔ ہنگری کلیسائے روما سے وابستہ تھا اس لئے پوپ نے بھی اس کی تائید کی اور ترکوں کے خلاف ایک فیصلہ کن صلیبی جنگ لڑنے کا اعلان کر دیا۔ سلطان مراد کے عہد میں مشرقی یورپ کی تمام سلطنتیں متحد ہو گئی تھیں لیکن مغربی یورپ کی ریاستوں نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس مرتبہ یہ ہوا کہ چونکہ کلیسائے یونان و روما دونوں متفق تھے اور ادھر فرانس اور انگلینڈ میں بھی صلح ہو چکی تھی اس لئے ترکوں کے خلاف اس صلیبی محاذ میں مشرقی اور مغربی یورپ دونوں کی سلطنتیں متحد ہو گئیں، ان صلیبی اتحادیوں کے منصوبے یہ تھے کہ ترکوں کو ہنگری کی سرحدوں سے نکالنے کے بعد قسطنطنیہ کی طرف بڑھیں اور پھر درۂ دانیال کو عبور کرتے ہوئے شام میں گھس کر ارضِ مقدس پر قبضہ کر لیں اور اس طرح سلطان صلاح الدین اور سلطان رکن الدین بیبرس کا انتقام لیں۔

ان منصوبوں کے ساتھ یہ اتحادی فوجیں جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ بیان کی جاتی ہے۔

بوواقع ہنگری میں جمع ہوئیں اور وہاں سے عثمانی مقبوضات کی طرف بڑھیں۔ سرویا کا بادشاہ بایزید کا باجگذار تھا ہی، وہ اب بھی دولتِ عثمانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری پر قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلیبی مجاہدوں نے اس غریب کے ملک میں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ پھر آگے بڑھ کر متعدد قلعے فتح کرتے ہوئے سجسمنڈ کی فوج نائکوپولس کی طرف بڑھیں اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ہر چند کہ محاصرہ بہت

سخت تھا لیکن یہاں کے بہادر رئیس یوعلان بک نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ سلطان بایزید اس شہر سے دست بردار نہیں ہو سکتا وہ ضرور اس کی مدد کو پہنچیگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔

بایزید کو اس محاصرہ کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنی منتخب فوج کے ساتھ روانہ ہو گیا اور محاصرہ کے سولہویں دن نائکوپولس پہنچکر دشمن فوجوں پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا۔

۲۳ ذیقعدہ ۷۹۸ھ کو مقابلہ ہوا جس میں اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی، ان کے ہزاروں سپاہیوں کے خون سے میدانِ جنگ لالہ زار بن گیا۔ دس ہزار کے قریب فوجی گرفتار ہوئے، شاہِ ہنگری چند سرداروں کے ساتھ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ سکا۔ اس جنگ میں بایزید کو سرویا کی فوج سے بڑی مدد ملی جو بایزید کی مدد کے لئے بڑی ہمت و پامردی سے لڑی تھی۔

اس عظیم الشان فتح کی نویدِ جانفزا اسلامی ممالک میں پہنچی تو ہر جگہ اس پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور مصر کے خلیفۂ عباسی متوکل علی اللہ نے بھی اس پر اپنی خوشنودی کا اظہار اس طرح کیا کہ بایزید کے نام تمام مفتوحہ علاقوں کا فرمان بھیجا۔ اس کے بعد بایزید نے آسٹریا اور ولاچیا جس نے مذکورہ بالا جنگ میں اتحادیوں کے ساتھ شریک ہو کر دولتِ عثمانیہ سے غداری کی تھی اور ہنگری، ان سب پر حملہ کرنے کے لئے فوج بھیجی جس نے ان ملکوں کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا مگر خود یونان کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی آسانی سے تھسلی۔ فوسیس، ڈورنیس اور لوکریس پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے دو سپہ سالاروں نے جن کا نام یعقوب اور افرینوس تھا خاکنائے کورنتھ کو طے کر کے جنوب کا رخ کیا اور تمام موریا کو فتح کر لیا۔ موریا کے تیس ہزار یونانی باشندے بایزید کے حکم سے ایشیائے کوچک میں منتقل کر دیئے گئے اور ان کی جگہ ترکوں کی نو آبادیاں قائم کر دی گئیں۔

یونان کی مہم سے فارغ ہوتے ہی بایزید کو خبر ملی کہ قیصر روم نے ان مسلمانوں کے ساتھ جو قسطنطنیہ میں آباد تھے ان پر سختیاں شروع کر دی ہیں۔ اس خبر کو سن کر بایزید نے قیصر سے مطالبہ کیا کہ وہ تخت سے دست بردار ہو جائے لیکن اس نے مسیحی حکومتوں کی امداد کی توقع پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ بایزید نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔

جنگِ انگورہ | لیکن اب یکایک حالات میں انقلاب پیدا ہوا یعنی بایزید ایلدرم اور تیمور لنگ میں زبردست معرکہ ہوا جس نے دولتِ عثمانیہ کی قسمت ہی پلٹ کر رکھدی۔ تاریخِ اسلام کے اس اہم ترین معرکہ کا اثر اسلام اور مسلمانوں پر کیا ہوا؟ اس سلسلہ میں ہم ہندوستان کے مشہور مورخ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے ایک قابل قدر مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو بارہ تیرہ سال ہوئے انقلاب لاہور کے سالگرہ عید نمبر میں شائع ہوا تھا۔

"۸۰۰ھ میں جب تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو یہاں تغلقوں کی حکومت جانکنی کی حالت میں تھی مگر اسلام اور اسلامی عظمت و اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اسپین کی اسلامی حکومت کو جس کا دارالحکومت غرناطہ تھا عیسائی بالکل مٹادینے پر آمادہ ہو چکے تھے لیکن کسوڈا کی جنگِ عظیم اور بایزید ایلدرم کی پرہیبت معرکہ آرائیوں کے خوف سے یورپ کے عیسائی کچھ سہم سے گئے تھے اور ان کو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسپین میں مسلمانوں کا وجود تقریباً ڈیڑھ سو برس تک کے لئے اور باقی رہ گیا۔ تیمور ہندوستان میں مشرق کی جانب ہردوار تک آیا۔ دہلی، ملتان اور دامن کوہِ کشمیر میں قتلِ عام سے خون کے دریا بہا کر اور ہندوستان کا ملک یہاں کے باہمت وذی حوصلہ مسلمان سرداروں کے لئے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

تیمور ہردوار میں تھا کہ اس کے پاس خبر پہنچی کہ بایزید ایلدرم کو یورپ میں فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی ہیں، اس خبر کے ساتھ ہی قیصر روم یعنی قسطنطنیہ کے عیسائی بادشاہ کا ایلچی مع خط پہنچا کہ "بایزید کے پاس آپ کے مفرور مجرم سلطان احمد اور قرا یوسف ترکمان راحت و آرام اور عزت و احترام کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں آپ کی بڑی بے عزتی ہے، بایزید نے ہماری قدیم سلطنتوں اور عزتوں کو پارہ پارہ کر دیا ہے حالانکہ ہارون رشید اور معتصم باللہ عباسی خلفانے بھی ہماری سلطنت کو مٹانا نہیں چاہا اور مسلمانوں نے ہمیشہ ہماری سلطنت و حکومت کو عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ نیز بایزید نے اپنی فوجیں داغستان میں بھی جمع کی ہیں وہ بہت جلد آذربائیجان وغیرہ پر قبضہ کیا چاہتا ہے۔ آپ اس طرف آئیں، اپنی سرحدوں کو بچائیں اور ہم کو بھی اس مصیبت سے

نجات دلائیں۔

تیمور سے توقع تھی کہ وہ قیصر کی اس درخواست کا ایسا مایوس کن اور مسکت جواب دیتا جیسا کہ ساڑھے سات سو برس پہلے حضرت امیر معاویہؓ نے قیصر روم کو خط لکھا تھا کہ اگر تیرے مقابلہ کے لئے حضرت علیؓ کے لشکر کو حرکت کرنی پڑی تو سب سے پہلا سردار جو حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے تجھ پر حملہ آور ہوگا وہ معاویہؓ ہوگا۔ لیکن تیمور جذبۂ رقابت پر غالب نہ آسکا۔ نیز سلطان احمد جلائر اور قرا یوسف ترکمان کے بایزید کی پناہ میں چلے جانے کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ ہندوستان سے فوراً چل دیا۔ راستہ میں ایک لاکھ ہندوستانی قیدیوں کو جو بارِ خاطر یا گراں باریِ سفر کا موجب تھے بجائے اس کے کہ آزاد کردیتا قتل کر ڈالا۔ ہندوستان سے افغانستان ہوتا ہوا سمرقند پہنچا۔ وہاں سے تیاری کرکے ایران ہوتا ہوا اپنے ملک کی مغربی اور بایزیدی قلمرو کی مشرقی سرحد پر پہنچکر بایزید کو جو قسطنطنیہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا ایک تہدیدی خط لکھا کہ ہمارے مفرور مجرموں کو فوراً ہمارے پاس بھیجدو۔ بایزید نے پناہ گزینوں کے دینے سے صاف انکار کیا۔

اس باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۰۳ھ میں تیمور نے آرمینا کی طرف سے بایزیدی علاقوں میں داخل ہوکر سیواس کا محاصرہ کرلیا۔ یہاں بایزید کا بڑا لڑکا ارطغرل صوبہ دار تھا اس نے سخت مقاومت کی لیکن آخر مارا گیا اور سیواس فتح ہوگیا۔ تیمور نے اس جنگ کے چار ہزار ترک قیدیوں کے ساتھ یہ انسانیت سوز برتاؤ کیا کہ انھیں زندہ دفن کرادیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سنگدلی اور وحشت و بربریت کا ایک ایسا ہولناک مظاہرہ تھا جس کی نظیر خود تاتاریوں کے مظالم میں بھی نہیں مل سکتی۔

یہ اطلاع ملتے ہی بایزید ایک لاکھ بیس ہزار فوج لیکر تیمور کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا تیمور اب سیواس کے میدان کو اپنے لئے تنگ پاکر انگورہ آچکا تھا۔ اسی مقام پر دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ تیمور کی فوج تعداد میں سات آٹھ لاکھ تھی یعنی بایزید کی فوج سے سات گنی زیادہ، پھر بھی بایزید نے نہایت بے جگری اور اپنی شہرۂ آفاق بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ لیکن تعداد میں بہت

کم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مشکل یہ پیش آگئی کہ بایزید کی فوج کے بعض تاتاری دستے غداری کرکے تیمور سے جاملے۔ اس بنا پر بایزید کو اس جنگ میں شکستِ فاش ہوئی اور وہ اپنے بیٹے موسیٰ کے ساتھ گرفتار ہوگیا آٹھ مہینے تیمور کی اسارت میں رہنے کے بعد اس کو قیدِ ہستی و زندانِ آہنی دونوں سے بیک وقت رہائی ملی۔

تیمور نے بایزید کو شکست دیکر اسے گرفتار کرلینے اور اس طرح اپنی آتشِ انتقام و جذبۂ رقابت کو بجھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ان تمام ترکی امیروں کو جن کی ریاستیں سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلی گئی تھیں آزاد کرکے اور ان کی حکومتوں کو دوبارہ بحال کرکے ایشیائے کوچک سے دولتِ عثمانیہ کے اقتدار کا خاتمہ ہی کردیا۔ آہ افسوس!

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینہ کے داغ سے　　اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

جنگِ انگورہ کا اسلام پر اثر

دولتِ عثمانیہ پر اس اثر کے باعث خود اسلام کے عروج و ترقی اور یورپ میں اس کی پیشقدمیوں کو جو صدمۂ عظیم پہنچا شاید موجودہ حالات میں اس کا تصور بھی مشکل ہے مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی لکھتے ہیں۔

> "بایزید کے مغلوب و اسیر ہونے سے یورپ میں اسلام کے روزافزوں اقتدار و ترقی کو سخت نقصان پہنچا لیکن اگر تیمور شکست پاکر اسیر یا مقتول ہوجاتا تو صرف خاندانِ تیموری کو نقصان پہنچتا مگر اسلام کو براعظم ایشیا میں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لڑائی میں بایزید کی حد سے بڑھی ہوئی بہادری اور کسی قدر ناعاقبت اندیشی کو ضرور ملزم ٹھیرایا جاسکتا ہے اس کے سوا اس عثمانی سلطان پر اور کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ جنگِ انگورہ نے تمام یورپ کو مسلمانوں کا محکوم و مغلوب ہونے سے بچالیا۔ انگورہ کا معرکہ اگر برپا نہ ہوتا تو جاپان سے انگلستان تک تمام دنیا ایک مرتبہ پرچمِ اسلام کے سایہ میں آچکی ہوتی۔"

سلطنتِ عثمانیہ کی نشاۃِ ثانیہ

تیمور لنگ کا حملہ اور اس کی کامیابی دولتِ عثمانیہ کے جسم پر ایسا زخم کاری تھا کہ بہ ظاہر اس کے مندمل ہونے کی توقع نہیں تھی۔ ایشیائے کوچک میں عثمانی سلطنت

کی زبوں حالی دیکھکر یورپین مقبوضات میں بھی اس کے خلاف بغاوت کے شرارے بھڑکنے لگے لیکن ابھی قدرت کو اس حکومت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے عظیم الشان کام لینے تھے۔ اس لئے اس کے تنِ مردہ میں پھر جان پڑ گئی اور اس نے جلد ہی دس گیارہ سال کے اندر اندر اپنی قوت و عظمتِ رفتہ واپس لے لی۔

سلطان بایزید یلدرم کے پانچ لڑکے تھے جن میں سے ایک ارطغرل جنگ سیواس میں مارا گیا تھا باقی چار لڑکوں نے باپ کی وفات کے بعد مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی، محمد ان سب میں چھوٹا اور سب سے زیادہ عقلمند، مدبر اور بہادر تھا۔ آخر میں وہ سب پر غالب آیا اور ۸۱۶ھ میں تن تنہا سلطنتِ عثمانیہ کا مالک ہو گیا۔ بحیثیتِ سلطان اس کی مدتِ حکومت صرف آٹھ سال (از ۸۱۶ھ تا ۸۲۴ھ) ہے اور اس تمام مدت میں وہ اگرچہ اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح کوئی قابلِ ذکر فتح حاصل نہیں کر سکا لیکن اس کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ اس نے دولتِ عثمانیہ کے جسمِ ناتواں میں پھر از سرِ نو ایک روحِ تازہ پیدا کر دی اور ایشیا اور یورپ میں اس کا اقتدار اتنا ہی مضبوط کر دیا جتنا کہ تیمور کے حملہ سے پہلے تھا۔

ذاتی اوصاف کے لحاظ سے بھی محمد نہایت رحمدل، عادل اور حلیم و بردبار تھا۔ ۸۲۴ھ میں انتقال ہوا۔

سلطان مراد ثانی سلطان محمد اول کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا مراد ثانی تخت نشین ہوا۔ دولتِ عثمانیہ کا دوبارہ استحکام محمد اول کے عہد میں ہی ہو چکا تھا۔ ایشیائے کوچک کے بعض امراء جو اب بھی سرکشی سے باز نہیں آئے تھے سلطان مراد ثانی نے پہلے ان کو مطیع اور اپنا وفادار بنا لیا۔ پھر وہ یورپ کی طرف متوجہ ہوا۔ شاہِ ہنگری نے خائف ہو کر دریائے ڈینیوب کے تمام شمالی علاقے سلطان کے حوالہ کر دیئے، سالونیکا جو بازنطینی سلطنت کا ایک مشہور اور نہایت اہم شہر تھا جو گذشتہ سو سال کی مدت میں تین مرتبہ ترکوں کے قبضہ میں آیا اور پھر ان کے ہاتھ سے نکل کر یونانیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا اسے فتح کیا۔ سرویا کو پھر ترکی حکومت کا مطیع و وفادار بنایا۔ قسطنطنیہ کا بھی محاصرہ کیا لیکن اس شہر کو فتح کرنے کے لئے قدرت کسی اور کے دست و بازو کو ہی بروئے کار لانے والی تھی۔

سلطان مراد ثانی سلطنت کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھکر زندگی کا حقیقی سکون واطمینان حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ وہ اپنے لڑکے محمد کے حق میں دست بردار ہوکر سلطنت وحکومت سے کنارہ کش ہوگیا۔ صلیبی اتحادیوں نے یہ سمجھکر کہ محمد نو عمر ہے اور ناتجربہ کار پھر ایک مرتبہ متفق ومتحد ہوکر دولت عثمانیہ کے اقتدار کو یورپ سے ختم کردینے کی جدوجہد شروع کی۔ یہ دیکھ کر سلطان مراد ثانی کو گوشۂ عزلت سے نکل کر میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔ کسووا کے میدان میں ہی ان افواج کا اجتماع ہوا لیکن اتحادیوں کو جن میں ہنگری، جرمنی، پولینڈ، بوسینا اور ولاچیا سب شریک تھے شکستِ فاش ہوئی اور وہ مایوس وناکام ہوکر واپس چلے آئے۔

ان طاقتوں کو سب سے بڑا ناز ہنگری فوج کے ایک سپہ سالار ہونیاڈے پر تھا جس نے اپنی شجاعت کا جوہر دکھاکر مغربی یورپ میں اپنی دھاک بٹھادی تھی۔ یہ سپہ سالار تقریباً بیس سال تک ترکوں سے جنگ کرتا رہا اور کئی مرتبہ اس کو فتوحات بھی حاصل ہوئیں جن سے اس کا اور اتحادیوں کا حوصلہ دوچند ہوگیا۔ لیکن آخر کار جنگ وارنا میں اس کو ترکوں کے ہاتھ سے زبردست شکست ہوئی۔ جس میں عیسائیوں کے متعدد بادشاہ اور امراء واعیان بھی کام آئے ۱۵ محرم الحرام ۸۵۵ھ کو وفات پائی۔

سلطان محمد فاتح اور فتح قسطنطنیہ

سلطان مراد ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمد تخت نشین ہوا اس کے آباؤ اجداد قسطنطنیہ کے اطراف واکناف میں جو بلاد وامصار تھے ان کو فتح کرکے بازنطینی سلطنت کے اس اہم دارالسلطنت کو تسخیر کرلینے کی راہ کھول ہی چکے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھاکر اس نے تاریخ اسلام کی اس شاندار مہم کی تیاریاں شروع کردیں۔ اس سلسلہ میں اس نے باسفورس کے یورپی ساحل پر ایک حصار تعمیر کرایا جو قسطنطنیہ سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر تھا۔ پھر محاصرہ کا کل سامان تیار کرایا۔ ہنگری کے ایک صناع سے بڑی توپیں بنوائیں جن کے کھینچنے کے لئے ساٹھ ساٹھ جوڑ بیل لگتے تھے۔ جب یہ سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ادرنہ سے خود نوے ہزار فوج لیکر روانہ ہوا۔ اور دوسری جانب ایک امیر کی قیادت میں جنگی کشتیاں روانہ کیں اور اس طرح بری اور بحری دونوں جانبوں سے قسطنطنیہ کا

محاصرہ کرلیا۔

۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۵۷ھ کا دن حملہ کے لئے مقرر تھا، اس رات تمام لشکر دعا اور عبادت میں مشغول رہا، ہر طرف سے تسبیح و تہلیل کی صدائیں آتی تھیں۔ دن نکلتے ہی نماز فجر ادا کرنے کے بعد مسلمان فصیل کی طرف بڑھے۔ رومیوں نے نہایت ہمت و پامردی سے مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ قیصر روم قسطنطین اسی جنگ میں مارا گیا۔ دوپہر تک جنگ ہوتی رہی اور رومی اسلامی فوج کے پے در پے حملوں کے سامنے ایک ناقابلِ جنبش دیوار استقامت بنے کھڑے رہے لیکن ادھر محمد بھی عزم و ثبات کا پیکر تھا اس نے جدید توپوں سے فصیل پر گولہ باری کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور پھر آخر میں اپنی فوج کا ایک خاص دستہ لیکر آگے بڑھا۔ رومی اس وقت لڑتے لڑتے بالکل خستہ ہو چکے تھے، ان میں اس جدید حملہ کی تاب نہ تھی اور ادھر مسلسل اور بے پناہ گولہ باری سے فصیل کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دیوار ٹوٹی اور سپاہیوں کا ایک دستہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اور دوسرے دستے بھی شہر میں داخل ہو کر اس پر قابض ہو گئے اور اس طرح آج اسلام کی ایک دیرینہ تمنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی دولتِ عثمانیہ کے ساتویں فرمانروا کی کوششوں سے پوری ہوئی۔ سقوطِ قسطنطنیہ کا یہ واقعہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں پیش آیا۔

ظہر کے وقت سلطان محمد فاتح بھی اپنے وزراء و اعیان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، مشہور گرجا ایا صوفیا کے دروازہ پر پہنچکر اذان دلوائی اور ظہر کی نماز پڑھی جس کے بعد یہ کنیسہ جامع مسجد میں تبدیل ہو گیا۔

اس فتح عظیم کی خوشی میں تمام عالم اسلام میں جگہ جگہ مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا اور ہر طرف سے ملوک و سلاطین اور علماء و شعراء نے سلطان کو پیغامہائے تہنیت ارسال کئے "بلدۃ طیبۃ" قرآن مجید کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے وہ اس فتح کی تاریخ ہے۔ اس دن سے سلطان کا لقب فاتح پڑا۔ سلطان نے اب اسی کو اپنا دار الخلافہ بنایا۔ یہ پہلا دن تھا کہ جو شہر ایک ہزار برس تک روم کا پایۂ تخت بنا رہا اب اسے ایک اسلامی حکومت کے پایۂ تخت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ فتح کے تین دن بعد ہی حضرت ابو ایوب انصاری کی قبر کا پتہ چلا تو سلطان نے اس پر ایک جامع مسجد تعمیر کرادی جس میں

سلاطینِ عثمانیہ کی رسمِ تاجپوشی ادا کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں غالباً یہ بات دلچسپی سے سنی جائے گی کہ فتح قسطنطنیہ کے وقت سلطان کی عمر صرف ۲۶ سال کی تھی۔

دوسری فتوحات | قسطنطنیہ کی فتح کو مورخین نے تاریخ عالم کا ایک نہایت ہی غیر معمولی اور اہم واقعہ تسلیم کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ اب مشرقی رومن امپائر کا بالکل خاتمہ ہو گیا تھا جو خلفاءِ راشدین کے زمانہ سے اب تک ممالک اسلامیہ کے پہلو میں ایک کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی تھی۔ سلطان محمد نے اس کے بعد بھی اپنی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ چنانچہ اس نے ۸۶۳ھ میں البانیا کے متعدد قلعے فتح کئے۔ پھر ہنگری پر فوج کشی کی۔ ۸۸۴ھ میں بحر روم کے متعدد جزائر کو فتح کیا۔ جزیرہ روڈس پر بھی چڑھائی کی مگر وہ اس وقت فتح نہ ہو سکا ۴؍ ربیع الاول ۸۸۶ھ کو سلطان نے وفات پائی۔ اس کا عہد فتوحات کے علاوہ انتظامات اور رفاہِ عام کے متعدد کاموں کی وجہ سے بھی سلاطینِ عثمانی میں ممتاز ہے۔

سلطان محمد فاتح کے بعد اس کا بیٹا بایزید ثانی تخت نشین ہوا۔ اور اگرچہ اس کا عہد فتوحات کے اعتبار سے کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے تاہم یہی بسا غنیمت ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی وراثت کو سنبھالے بیٹھا رہا۔ ۹۱۸ھ میں اس نے اپنے بیٹے سلیم کو سلطان بنا کر خود گوشہ نشینی اختیار کر لی لیکن ابھی سفر میں ہی تھا کہ انتقال کر گیا۔

سلطان سلیم اول | اس کے بعد سلطان سلیم اول نے مستقلاً عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ سلطان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تو ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کے منصوبوں کی اطلاع پا کر چڑھائی کی اور ۹۲۰ھ میں بمقام چالدیران شاہ اسماعیل صفوی کو شکست دیکر تبریز، ہمدان، آذربیجان اور قفقاز پر قابض ہو گیا۔ پھر یکایک بلادِ عرب کی طرف متوجہ ہوا اور دیار بکر کو فتح کرتا اور مملکتِ ذوالقدریہ کو جو مرعش اور بستان کے اطراف و اکناف میں قائم تھی پامال کرتا ہوا شام پہنچا۔ ممالیک مصر کئی مرتبہ دولتِ عثمانیہ کے قلعوں پر حملے کر کے ان میں سے بعض پر قبضہ کر چکے تھے اور یوں بھی آئے دن ترکوں کو پریشان کرتے رہتے تھے اس لئے مرج دابق میں جو حلب کے

مضافات میں سے ہے سلطان سلیم نے مصر کے چرکسی بادشاہ غوری سے معرکہ آرائی کی، نہایت گھمسان کا رن پڑا لیکن فتح عثمانی بادشاہ کو ہوئی۔ غوری گھوڑے سے گر کر ہلاک ہوگیا۔ غوری کے بعد سلطان طومان بے مصر کا بادشاہ ہوا۔ اُدھر عثمانی فوجیں قاہرہ میں داخل ہو چکی تھیں، طومان بے نے شدید مقاومت کی لیکن بے سود۔ اس جنگ میں گرفتار ہوا اور چند روز کے بعد سولی لٹکا دیا گیا اس دن سے مصر بھی عثمانی قلمرو میں شامل ہوگیا۔

خلافت ۲۲ رجب ۹۲۳ھ کو قسطنطنیہ واپس پہنچا۔ مصر سے آخری عباسی خلیفہ متوکل علی اللہ کو اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جامع ایا صوفیہ میں داخل ہو کر خلیفہ نے خلافت کا منصب اور اس کے تبرکات یعنی تلوار، علم، اور ردائے نبوی سلطان سلیم کے حوالہ کی۔ اس دن سے خلافت بنو عباس سے منتقل ہو کر آلِ عثمان میں آگئی اور سلطان سلیم تمام عالمِ اسلام کا خلیفہ ہوگیا۔[1]

---

[1] عام طور پر مشہور تو یہی ہے کہ سلطان سلیم نے مصر کو فتح کرنے کے بعد خود خلافت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ لیکن محترمہ خالدہ ادیب خانم نے اپنی کتاب "کشمکش مشرق و مغرب ترکی میں" (Conflict of East and West in Turkey) کے صفحہ ۲۵ میں اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے بحث کی ہے ہم ذیل میں اس کا اقتباس پیش کرتے ہیں محترمہ لکھتی ہیں :-

"سلطان سلیم کی فتح (مصر) کی سب سے پہلی دستاویز وہ فتح نامہ ہے جو سلطان نے ۱۵۱۷ء میں اجنبی حکومتوں (ایران اور وینس) کے نام بھیجا تھا۔ اس فتح نامہ میں خلافت کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے حالانکہ اگر سلطان ایسے شخص کا مقصد خلیفہ بننا ہوتا تو وہ دنیا کو ضرور اس سے باخبر کر دیتا۔ اس سلسلہ میں ایک دوسری دستاویز جو تاریخی حیثیت رکھتی ہے وہ "حسن طولون کا لکھا ہوا مخطوطہ "فتح مصر" ہے۔ یہ مخطوطہ جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اور جس پر مصر کے ڈاکٹر عدنان نے کام کیا ہے۔ اس کا مصنف فتح مصر کے وقت خود موجود تھا اور اس نے تمام واقعات کا عینی مشاہدہ کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ حسن طولون تمام واقعات کا تو ذکر کرتا ہے لیکن مسئلہ خلافت سے متعلق وہ صرف اتنا لکھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ

"سلطان سلیم نے علمائے مصر کو جمع کر کے پوچھا کہ کیا کوئی سلطان خلیفۂ اسلام کی اجازت کے بغیر سیاسی اور ملکی معاملات میں قوتِ تنفیذ کا مالک نہیں ہو سکتا؟ علماء نے کہا، نہیں خلیفہ کی اجازت (باقی ص ۱۳۷ پر)

سلیم ابھی مصر میں ہی تھا کہ شریفِ مکہ کے بیٹے نے حاضر ہو کر اپنے باپ کی طرف سے حرمین شریفین کی کنجیاں بھی سلیم کے سپرد کر دیں۔ اس بنا پر آج سے ترک اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین بھی کہنے لگے۔

اس سلسلہ میں یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کا خطبہ پڑھتے ہوئے خطیب نے سلیم کے لئے "مالک الحرمین الشریفین" کے الفاظ کہدیئے تو سلیم فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور خطیب سے بولا میری یہ حیثیت نہیں ہے کہ میں حرمین شریفین کا مالک ہوں۔ میرے لئے یہی فخر کچھ کم نہیں ہے کہ میں "خادم الحرمین الشریفین" کہلاؤں۔ [سلہ]

مصر، شام اور حجاز پر قبضہ ہو جانے کے باعث دولتِ عثمانیہ کا رقبہ تقریباً دو چند ہو گیا اور اس کی طاقت اس قدر مضبوط ہو گئی کہ ہنگری، اسپین اور اٹلی کے بادشاہوں نے اپنے سفراء کے ذریعہ ہدایا اور طرح طرح کے تحفے بھیجکر دولتِ عثمانیہ کے ساتھ صلح و دوستی کے تعلقات کو مضبوط کرنے کی خواہش ظاہر

سلہ الاسلام والحضارة العربیہ ج ۲ ص ۴۹۱۔

(بقیہ ص ۱۳۶) اس کے لئے ضروری نہیں ہے۔ سلطان سلیم نے علماء کے اس جواب کے بعد گفتگو ختم کردی اور پھر خلیفہ سے ملاقات کے لئے نہیں گیا۔"

اس کے بعد ص ۲۶ پر محترمہ لکھتی ہیں۔

"خلیفہ کا استنبول لانا بھی بظاہر ایک من گھڑت افسانہ ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم عصر مورخین میں سے کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اگر آخری خلیفہ عباسی واقعی استنبول لایا گیا اور وہ وہیں مرگیا تھا تو اب سوال یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا باہر رہا اور جب مرگیا تو کہاں دفن ہوا؟ ہمیں کسی ذریعہ سے زندگی میں اس کی جائے رہائش اور مرنے کے بعد اس کے مدفن کا علم نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی تاریخیں خلیفہ اور خلافت کے بارے میں بالکل خاموش ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان سلیم نے اور اس کے بعد دوسرے عثمانی سلاطین نے ایک عرصہ تک اپنے لئے "خلیفہ" کا لقب اختیار نہیں کیا۔ صرف سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانہ میں خلافت کا چرچا سننے میں آتا ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس کے بالمقابل مشہور مستشرق پروفیسر آرنلڈ کا بیان یہ ہے کہ برٹش میوزیم میں سلاطینِ عثمانی کے جو سکے موجود ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سلاطین آلِ عثمان سلطان مراد اول کے زمانہ سے ہی اپنے آپ کو خلیفۂ اسلام کہتے تھے۔

کی، سلطان نے ہدایا کو بخوشی قبول کرکے اسلامی رواداری کا بیّن ثبوت پیش کیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ سلطان سلیم بیحد سخت گیر اور تشدد پسند تھا اور مزاج میں خودسری بھی زیادہ تھی جیسا کہ مصر و شام اور ایران کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس نے خلافت کو آلِ عثمان میں منتقل کر کے جس بیدار مغزی، ضرورتِ وقت کے احساس اور صحیح فرض شناسی کا جو عظیم ثبوت دیا ہے، اس کا اعتراف ہر مسلمان کو کرنا چاہئے۔ سلیم نے یہ محسوس کیا کہ خلافت کا اصل فرض دفاع و جہاد ہے اس کو سیاسی اعتبار سے اتنا مضبوط ہونا چاہئے کہ وہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت بآسانی کر سکے اور دنیائے اسلام کے لئے حقیقی معنیٰ میں ایک مرکز کا کام دے سکے یہاں اس کا برعکس تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ مصر و شام اور حجاز میں سیاسی اقتدار ممالیک کا تھا اور خلافت اس کے زیر سایہ زندگی کے سانس پورے کر رہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خلافت بزرگوں کی ہڈیوں کا صرف ایک ڈھانچ تھی اور اس کے بالمقابل آلِ عثمان ڈیڑھ سو برس سے اسلام کی حفاظت وحیات اور اس کی توسیع و اشاعت کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کی تلوار سے یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی حکومتیں لرزنے لگی تھیں۔ اس بنا پر خلافت کی قبا کو زیبِ تن کرنے کا استحقاق آلِ عثمان سے بڑھکر اور کسے ہو سکتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ مصر میں خلافت اور سلطنت دونوں کا ایک ساتھ وجود اسلام کے دامن پر ایک بدنما داغ تھا جسے ترکوں نے مٹا کر اسلام کے چہرہ کو پھر ایک بار روشن و تابناک بنا دیا اور اسلام کی رگوں میں زندگی کا پھر ایک نیا خون دوڑنے لگا۔

خدمتِ حرمین شریفین اس کے علاوہ سلطان سلیم نے اپنے لئے خادم الحرمین الشریفین کا جو لقب اختیار کیا تھا اور جو چار سو برس تک ترکوں کی دستارِ عظمت و احترام کا طرہ بنا رہا۔ اس سے اس کی دینی عقیدت و ارادت اور حسنِ نیت کا ثبوت ملتا ہے۔ سلیم کو اہلِ حرمین کی خدمت کا موقع صرف تین سال ملا۔ تاہم اس قلیل مدت میں بھی اس نے جو کچھ کیا اس کا اندازہ حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے جو دولتِ عثمانیہ ج، ص ۱۸۰ بحوالہ فتوحات اسلامیہ از مفتی دحلان سے ماخوذ ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:-

"سلاطین مملوک کی طرف سے شریفِ مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا سلیم نے اس میں پچیس دینار کا اضافہ

کردیا۔ اس نے ایک دفتر قائم کیا جس میں حرم محترم کے مجاوروں کے نام لکھے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کا وظیفہ سو دینار مقرر کیا گیا جو مصر کے خزانہ سے ادا کیا جاتا تھا۔ اس نے تیس آدمیوں کی ایک جماعت بھی مقرر کی جو روزانہ قرآن مجید کا ختم پڑھتی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی تنخواہ بارہ دینار مقرر کی۔ سلاطینِ مصر ہر سال بدوؤں اور فقراء کے لئے غلہ بھیجتے تھے سلیم نے اس دستور کو جاری رکھا اور حکم دیا کہ ہر سال سات ہزار اردب (کم و بیش من) غلہ اہلِ حرمین کے لئے بھیجا جائے اس سے پانچ ہزار اردب غلہ مکہ معظمہ والوں کو دیا جاتا تھا اور دو ہزار مدینہ والوں کو۔"

مفتی دحلان لکھتے ہیں۔

"سلیم کے بعد دوسرے سلاطینِ عثمانی غلہ کی مقدار میں اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کے لئے بارہ ہزار اردب اور مدینہ منورہ کے لئے سات ہزار اردب غلہ آنے لگا۔ سلیم نے حرم محترم میں مقامِ حنفی کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور مدینہ منورہ میں امیر مصلح کو بھیجکر بہت سے رفاہی کام انجام دیئے۔ اس کی داد و دہش اور امورِ خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں حرمین شریفین میں فارغ البالی پھیل گئی۔

شیخ قطبی جو مکہ کے ایک مشہور عالم اور سلیم کے معاصر تھے بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بچپن میں مطاف کو اکثر خالی پاتا تھا اور تنہا طواف کرتا تھا۔ بازار مسعی کو بھی چاشت کے وقت تک سنسان دیکھتا تھا اور اکثر یہ دیکھتا تھا کہ غلہ فروشوں کے قافلے آئے ہوئے ہیں مگر خریدنے والے بہت کم ہیں۔ لیکن اب دولتِ عثمانیہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہے۔ رزق وسیع ہے۔ خوش حالی اور فارغ البالی ہے اور لوگ اس سلطنت کے زیرِ سایہ امن و اطمینان میں ہیں اور اس کے انعام و اکرام کے دریا میں غوطے لگا رہے ہیں۔"

شریعتِ اسلام کا احترام

سلیم اگرچہ خودسر اور طبیعت کا ضدی تھا مگر اس کے باوجود اس کو جب کبھی متنبہ کیا جاتا تھا وہ فوراً سنبھل جاتا اور شرعی احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے ایرانیوں سے غایت درجہ تعصب رکھنے کی بنا پر اعلان عام کرا دیا کہ دولتِ عثمانیہ کا

کوئی تاجران لوگوں سے لین دین نہ رکھے۔ پھر معلوم ہوا کہ بعض تاجر خفیہ طور پر اس حکم کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو اس نے ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا لیکن جب شیخ الاسلام مفتی جمالی نے بتایا کہ یہ حکم ناجائز اور نادرست ہے تو اس نے فوراً اسے واپس لے لیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ تبلیغِ اسلام کے جوش میں اس نے حکم دیدیا کہ دولتِ عثمانیہ کے ممالکِ محروسہ میں جتنے عیسائی ہیں ان کو بجبر مسلمان بنالیا جائے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو انھیں سپردِ تیغ کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ فوراً سلیم کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر کوئی غیر مسلم جزیہ دیکر اسلامی ملک میں رہنا چاہتا ہے تو اس کو تبدیلِ مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں صاف طور پر ہے لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہو سکتا۔

ترکوں کی بحری طاقت ترکوں کی بری فوج جس قدر مضبوط تھی۔ سلیم نے چاہا کہ ان کی بحری طاقت بھی اتنی ہی مضبوط ہو جائے تاکہ بحرِ روم پر دولتِ عثمانیہ کا اقتدار قائم ہو سکے اور اس طرف سے ترکوں پر صلیبی حملہ کا خطرہ مسدود ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے عظیم الشان بحری بیڑہ تیار کرایا جو مختلف سائز کے ڈیڑھ سو جدید جہازوں پر مشتمل تھا ان کے علاوہ سو جہاز اور بھی تھے جو ہر وقت کسی مہم پر روانہ ہونے کی امید پر مسلح رہتے تھے۔ غالباً سلیم کا ارادہ جزیرۂ روڈس پر حملہ کرنے کا تھا مگر ابھی اس کے انتظامات مکمل نہیں ہوئے تھے کہ پیکِ اجل آپہنچا اور ۹ رشوال ۹۲۶ھ کو سلطان کا انتقال ہو گیا۔

سلیمانِ اعظم قانونی سلیم کے بعد اس کا بیٹا سلیمان تخت نشین ہوا جس کی مدتِ حکومت ۹۲۶ھ سے ۹۷۵ھ تک اڑتالیس سال ہے۔ اس کا دورِ حکومت دولتِ عثمانیہ کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، اس نے اپنے عہد میں یمن، حبشہ، عراق، طرابلس، برقہ، تیونس، الجزائر، صحرائے کبری اور سوڈان اور ان تمام ملکوں کو فتح کر کے دولتِ عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ اس طرح ایشیا اور افریقہ کے عربی ممالک دولتِ عثمانیہ کے دامن سے وابستہ ہوگئے اور دوسری جانب روم، ہنگری، سردیا، بلغاریا، بوسنیا، البانیا، ان سب کو مکمل طور پر فتح کر کے تمام جزیرہ نمائے بلقان پر قبضہ کر لیا جو ۱۸۲۹ء تک قائم رہا جبکہ بڑی بڑی

حکومتوں کی مدد سے انھیں آزادی نصیب ہوئی۔ ہنگری کا مشہور قلعہ بلغزاد سلطان محمد فاتح کے عہد میں بھی فتح نہیں ہو سکا تھا۔ اسی طرح جزیرۂ روڈس صلیبی مجاہدوں کا بڑا مرکز تھا۔ سلیمان نے ان دونوں کو بھی فتح کیا۔ کریٹ اور قبرص پہلے ہی مفتوح ہو چکے تھے۔ روڈس کے فتح ہو جانے سے بحرِ روم پر بھی ترکوں کا مکمل اقتدار ہو گیا اور اب سلطنتِ عثمانیہ اپنی بری اور بحری دونوں طاقتوں کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی طاقتور اور با اقتدار حکومت ہو گئی جس کے حدود بوڈولیا اور بودا سے مصر تک اور فرات سے جبرالٹر تک پھیلے ہوئے تھے۔ غرض یہ ہے کہ سلیمان یورپ، ایشیا اور افریقہ تین براعظموں کے بہت سے ممالک کا فرمانروا اور بحرِ روم و بحرِ احمر دو اہم بحروں کا بادشاہ تھا مورخین کا بیان ہے کہ سلیمان اعظم کی وسیع سلطنت میں بیس مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے، جن کی تعداد پانچ کروڑ بتائی جاتی ہے۔

حسنِ انتظام و عدالت ان فتوحات اور توسیعِ مملکت کی کوششوں کے علاوہ سلیمانِ اعظم حد درجہ انصاف پسند اور عدل گستر تھا، چنانچہ سلیم نے چھ سو مصریوں کو جبراً مصر سے قسطنطنیہ منتقل کر دیا تھا، سلیمان نے پھر ان کو اپنے وطن جانے کی اجازت دیدی اسی طرح سلیم نے ایران سے تجارتی تعلقات رکھنے کی پاداش میں بعض تاجروں کا مال ضبط کر لیا تھا۔ سلیمان نے ان کا مال واگذار کر دیا اور جن کو نقصان پہنچے تھے ان کو نقد روپیہ دیکر نقصان کی تلافی کردی۔ جن حکام پر بددیانتی اور غبن و خیانت کے الزام ثابت ہوتے تھے انھیں فوراً برطرف کر دیتا تھا۔ سلیمان کی اس جانچ پڑتال اور نگرانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ممالکِ محروسہ میں امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ اس نے تمام حکام اور سلطنت کے اعلیٰ عہدہ داروں کو تاکیدی احکام و فرامین کے ذریعہ خبردار کر دیا تھا کہ رعایا میں سے کسی کے ساتھ جبر و ظلم نہ کیا جائے۔ امیر و غریب کو ایک نظر سے دیکھا جائے اور انتظامی معاملات میں مسلم و غیر مسلم دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ قانون و آئین کی اس سخت پابندی کے باعث ہی سلیمان کا لقب قانونی پڑ گیا تھا۔

فوجی استحکامات سلیمان کا عہد وہ زمانہ تھا جبکہ یورپ قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں سے نکل کر ایک

نئے عہد میں داخل ہو رہا تھا اور اب یہاں علوم و فنون کی گرم بازاری ہونے لگی تھی۔ اس بنا پر ان لوگوں نے فنِ حرب میں بھی کافی ترقی کی تھی نئے نئے آلاتِ حرب ایجاد ہو چکے تھے اور جنگ کے طریقوں میں بھی بہت کچھ اصلاح ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود عثمانی فوجیں اپنی تنظیم اور ساز و سامان میں مسیحی فوجوں سے بہت آگے تھیں، توپخانوں کی تعداد اور قوت کے علاوہ قلعہ بندی و قلعہ سازی اور فوجی انجینئرنگ کی تمام شاخوں میں ترک یورپ کی سلطنتوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے تھے۔

کریسی لکھتا ہے "سلیمان اپنی فوجوں کے جسمانی آرام اور اخلاقی نگرانی پر جس قدر توجہ رکھتا تھا اس کو اس بے پروائی سے کوئی مناسبت نہیں تھی جو اس کے حریفوں کے لشکر میں پائی جاتی تھی"۔[۱]

رفاہِ عام کے کام ان انتظامات کے علاوہ سلیمان رفاہِ عام کے کاموں سے بھی غافل نہیں رہا، اس نے قسطنطنیہ میں ایک بڑی نہر بنوائی۔ مکہ معظمہ کی پرانی نہروں کی مرمت کرائی سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے اور پل تعمیر کرائے۔ بغداد کو فتح کرنے کے بعد وہاں امام ابو حنیفہؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات تعمیر کرائے اور چند روز کربلا اور دوسرے مقامات کی زیارت گاہوں میں گذارے۔ اہلِ حرمین کے لئے جو وظیفہ اور غلہ عثمانی حکومت کی طرف سے جاتا تھا اس کو دوچند کر دیا۔

سلیمان کا عہدِ حکومت نہ صرف تاریخ دولتِ عثمانیہ میں بلکہ عالم کی تاریخ میں گوناگوں فتوحات حسنِ انتظام، رفاہِ عام، ملکی امن و امان اور فوجی طاقت و قوت کے لحاظ سے ایک نمایاں مقام رکھتا ہے ۳۰ر صفر ۹۷۴ھ میں بعارضۂ درد نقرس جبکہ اس کی عمر ۷۴ سال تھی وفات پائی۔

دولتِ عثمانیہ کے دو دور خلافتِ بنی عباس کی طرح دولتِ عثمانیہ کے بھی دو دور ہیں ایک دورِ عروج اور دوسرا دورِ زوال۔ دورِ عروج عثمان خان اول بانیِ دولت کے استقلال ۷۰۰ھ سے شروع ہو کر سلیمانِ اعظم کی وفات ۹۷۴ھ پر ختم ہو جاتا ہے یعنی اس کی مدت کل ۲۷۴ پونے تین سو سال ہے۔ اس مدت کا مقابلہ اگر بنی عباس کے دورِ ترقی سے کیا جائے تو بڑا فرق نظر آئے گا۔

---

[۱] ج ۱ ص ۳۲۴۔

بنوعباس اور آلِ عثمان کا موازنہ

اس میں شک نہیں کہ بنو عباس کے عہد میں علوم و فنون کو جو ترقی ہوئی وہ آلِ عثمان کی سرپرستی میں نہ ہو سکی۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ جو فتوحات آلِ عثمان کے عہد میں ہوئیں بنو عباس کا دوران سے یکسر خالی ہے یہ زیادہ تر اندرونی خلفشار دور کرتے میں ہی مصروف رہے۔ فتح قسطنطنیہ جو اسلام کا دیرینہ خوابِ تمنا تھا بنو عباس کے عہد میں شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ قدرت نے یہ سعادت بھی آلِ عثمان کے مقدر میں ہی رکھی تھی۔ پھر صرف اسی پر بس نہیں بلکہ وسطِ یورپ میں ان کا اقدام ویانا کی فصیل تک پہنچا۔ پھر علوم و فنونِ یونان کی نشر و اشاعت سے عقیدہ و عمل کی جو گمراہیاں عباسی دور میں پیدا ہوئیں، آلِ عثمان کا دورِ حکومت ان سے بڑی حد تک محفوظ و مامون رہا۔ عثمانی سلاطین فقہ حنفی کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ترک چونکہ اصلاً بدوی تھے جفاکش اور محنتی تھے اس لئے ان میں دوسری تباہ شدہ اقوام کے عادات و خصائل نسبتہً بہت عرصہ کے بعد پیدا ہو سکے، سلاطین خود میدانِ جنگ میں پہنچکر افواج کی قیادت کرتے تھے اور فریضۂ جہاد کو ادا کرنا اپنے لئے سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

پھر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اسلام کی نشر و اشاعت کا جذبہ بھی بہت شدید تھا یہاں تک کہ سلیم اول نے تو ایک مرتبہ عیسائیوں کو بجبر مسلمان بنانے کا حکم دیدیا تھا جو شیخ الاسلام کی دراندازی سے بعد میں منسوخ کر دیا گیا اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں نسلی یا قومی عصبیت کا نام و نشان نہ تھا اور اس بنا پر بنو عباس کے عہد میں جو لڑائیاں اور ہنگامے ہوتے رہے دولتِ عثمانیہ کے عہد میں ان کا چرچا سننے میں نہیں آتا مسلم اور غیر مسلم، ترک اور غیر ترک سب کے ساتھ اسلامی قانون کے مطابق یکساں معاملہ کیا جاتا تھا اور غیر مسلموں کے حقوق کی نگرانی پورے طور پر ہوتی تھی، ان اسباب سے ممالکِ محروسہ میں امن و امان کا دور دورہ تھا، یہاں تک کہ بعض بلقانی ریاستوں کے باشندے اپنے اوطان کو چھوڑ چھوڑ کر دولتِ عثمانیہ کے زیرِ سایہ رہنے کو پسند کرتے تھے۔

علاوہ ازیں بنو عباس اور آلِ عثمان ان دونوں کی ذہنیتوں کا فرق اس طرح بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بنو عباس میں سے جو شخص سریر آرائے خلافت ہوتا تھا وہ اپنے لئے کوئی پرشکوہ لقب اختیار

کرتا تھا۔ مثلاً مقتدر باللہ۔ المعتصم باللہ وغیرہ اور اپنے آپ کو خلافتِ راشدہ کا جانشین و وارث قرار دیکر امیر المومنین اور "ظل اللہ فی الارض" کہلاتا تھا لیکن اس کے برعکس آل عثمان "خادم الحرمین الشریفین" کو اپنے لئے سب سے بڑا سرمایۂ فخر خطاب سمجھتے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے لئے جو خطاب پسند کیا تھا اس کا پورا پورا حق بھی ادا کیا۔ چنانچہ آج بھی بڈھے عربوں کے سامنے ترکوں کا ذکر آتا ہے تو ان کی آنکھوں میں ترکوں کے عہدِ گذشتہ اور ساکنانِ حرمین کے ساتھ ان کی قلبی محبت و ارادت کا نقشہ گھومنے لگتا ہے اور بیساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

ہاں! یہ درست ہے کہ ترکوں نے اپنے دورِ ترقی میں بھی مسلمانانِ عالم کی دماغی یا اجتماعی رہبری میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور نہ ان کی وحدت کا کوئی ذریعہ تلاش کیا۔ تاہم انھوں نے بحیثیتِ مجموعی اسلام کی مرکزیت کو سنبھالنے اور اسے از سر نو قائم کرنے کے سلسلے میں دینِ قیم کی جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہیں اور مسلمانانِ عالم پر ان کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کا اجر سوائے خداوند تعالیٰ کے اور کون دے سکتا ہے؟ بنو عباس کو قرشی اور خانوادۂ نبوت سے منتسب ہونے کا ایسا شرف ضرور حاصل تھا جس میں آلِ عثمان کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اسی بنا پر بعض لوگوں کو آخر دم تک ان کی خلافت کے تسلیم کرنے سے انکار رہا لیکن جس مذہب کا اصول "اندریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست" رہا ہو اور جس کی بارگاہِ قبولیت و پذیرائی میں نقد جان اور متاعِ عمل کی پرسش ہو نہ کہ نسبی فضیلت و برتری کی۔ اس کے پیروکاروں سے ترکوں کی خلافت کے تسلیم کرنے میں متامل ہونا سخت حیرت انگیز امر تھا۔ [1]

---

[1] مولانا شبلی نعمانی نے سلطان عبدالحمید کو خطاب کر کے کہا تھا ؎

تازگی بدر و حنین از تو ہست ۔۔۔ زیب و طراز حرمین از تو ہست
جز تو کہ ہست اے شہِ انجم پناہ ۔۔۔ آنکہ بود شرع نبی را پناہ
قرۂ دینِ نبوی از تو ہست ۔۔۔ بازوئے اسلام قوی از تو ہست
شرع بجاہ تو چو شد ارجمند ۔۔۔ باد بفرماں تو چرخ بلند

یہ اشعار سلطان عبدالحمید پر صادق آتے ہوں یا نہ آتے ہوں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ شروع کے دس سلاطین پر یہ اشعار ضرور صادق آتے ہیں۔ وکفی بہ فخراً۔

دولتِ عثمانیہ کا زوال | فطرت کا جو قانونِ عروج وزوال اقوامِ عالم میں شروع سے اب تک نافذ رہا ہے۔ دولتِ عثمانیہ اس سے کیونکر مستثنیٰ رہ سکتی تھی۔ انحطاط وزوالِ اقوام کو جسمانی امراض وعوارض پر قیاس کرنا چاہیے جس طرح کسی مضبوط اور تندرست جسم کو شروع شروع میں جب کوئی مرض لاحق ہوتا ہے اور اس کا احساس یا تو بالکل نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی طرف زیادہ اعتنا نہیں کیا جاتا اور آخر کار مریض اور اس کے بہی خواہوں کی بے توجہی مریض کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے ٹھیک یہی حال قومی زوال وانحطاط کا ہوتا ہے جب کسی بدعملی یا غفلت وسہل انگاری کے باعث کسی قوم یا حکومت کے جسم کو زوال وادبار کا مرض لاحق ہوتا ہے تو قدرتی طور پر اس پہ دو نتائج مرتب ہوتے ہیں اگر قوم کے دل ودماغ بیدار ہیں اور وہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو محسوس کر کے فوراً ہی ان کی تلافی کر لیتی ہے تو ادبار ٹل جاتا ہے اور اس کی اصلی اور پہلی شان جلد ہی عود کر آتی ہے لیکن اگر اس کے برعکس اس قوم کو اپنی غلطیوں، کوتاہیوں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اپنے گناہوں اور جرموں پر تنبہ نہیں ہوتا تو اب ادبار اس قوم اور حکومت کے جسم کو گھن کی طرح لگ جاتا ہے اور ممکن کیا بلکہ اغلب ہے کہ ابتدا میں اس کا پتہ نہ چلے یا کسی اور پہلو سے تھوڑی بہت تلافی ہوتے رہنے کے باعث اس کا ہر وقت ادراک واحساس نہ ہو لیکن ادبار کے یہ جراثیم اندر ہی اندر پرورش پاتے رہتے ہیں اور آخر کار ایک دن جسدِ حکومت کی شریانوں میں زہریلا مادہ پیدا کر کے اسے گلا سڑا کر تباہ کر دیتے ہیں۔

اسبابِ زوال | جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے سلیمانِ اعظم کا دورِ حکومت دولتِ عثمانیہ کا انتہائی نقطۂ عروج تھا جس کے بعد اس کا انحطاط شروع ہو گیا۔

لکلِ شئ اذا ما تمّ نقصانٗ   فلا یغرّ بطیب العیش انسانٗ[1]

بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ خود سلیمانِ اعظم کے آخری دورِ حکومت میں ہی دولتِ عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا اور بہ قول محترمہ ادیب خانم کے اس کا اولین سبب یہ ہوا کہ اگرچہ سلیمان تین براعظموں اور دو بحروں پر حکومت کر رہا تھا اور اس کی فوج بھی اتنی مضبوط تھی کہ یورپ کی دولِ متحدہ کو بری

[1] ہر شے جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس میں نقصان شروع ہو جاتا ہے آدمی کو چاہیے کہ زندگی کے ناز و نعم پر مغرور نہ ہو۔

اور بحری دونوں قسم کی لڑائیوں میں بیک وقت شکست فاش دیکھتی تھی۔ لیکن در اصل وہ خود محکوم تھا اور اس کے اقلیم قلب و دماغ میں اس کی روسی بیگم جس کو اہلِ مغرب روکسلین (Roxalane.) کہتے ہیں اس کی حکومت و بادشاہت کا سکہ چل رہا تھا۔" ؎

اس روسی بیگم کے بطن سے سلیمانِ اعظم کا ایک لڑکا تھا جو نہایت آوارہ، بدچلن اور شراب خوار تھا۔ بیگم کی خواہش تھی کہ سلیمان کے بعد اس کا یہ بیٹا ہی تخت نشین ہو۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سلطان کا ایک اور لڑکا مصطفیٰ جو کسی اور بیوی سے تھا، ولی عہد قرار پا چکا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ مصطفیٰ اپنی فوجی اور دماغی و انتظامی قابلیت کے لحاظ سے بجا طور پر اس کا مستحق بھی تھا۔ اس بنا پر اب حرم سلطان (روسی بیگم) نے ایک سازش کی اور آخر کار سلیمان کو مصطفیٰ کی طرف سے بدگمان کر کر کے یہ باور کرا دیا کہ مصطفیٰ خود سلیمان کی زندگی میں ہی تخت و تاج کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے چنانچہ ۱۵۵۳ء میں جب ایران سے جنگ کرنے کے لئے مصطفیٰ اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ سلیمان نے اس کو اپنے خیمہ میں طلب کیا اور اپنے سامنے ہی گلا گھونٹ کر مروا ڈالا۔

مصطفیٰ کی طرح اس کے دوسرے بھائی بایزید غریب کا حشر بھی یہی ہوا۔ مصطفیٰ کے قتل کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب خود اس کی جان کی بھی خیر نہیں ہے۔ بعض ہواخواہوں نے مشورہ دیا کہ اسے اپنی حفاظت کے لئے سلیم (حرم سلطان روسی بیگم کے لڑکے کا نام) کے خلاف تلوار اٹھانی چاہیے۔ بایزید کو یہ مشورہ مناسب معلوم ہوا اور اس نے سلیم کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا لیکن سلیمان کی طاقت سلیم کے شامل حال تھی۔ اس بنا پر بایزید شکست کھا گیا اور اسے ایران کے شاہ طہماسپ کے دامنِ عطوفت میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن جب سلیمان نے شاہِ ایران کو جنگ کی دھمکی دی اور چار لاکھ اشرفیوں کا وعدہ بھی کیا تو اس نے مجبوراً شہزادۂ بایزید اور اس کے چاروں بیٹوں کو سلیم کے سفیر کے حوالہ کر دیا جس نے ان سب کو فوراً قتل کر ڈالا۔

شہزادہ مصطفیٰ اور بایزید کے قتل ہو جانے کے بعد اب سلیم ثانی کے لئے راستہ بالکل صاف تھا

؎ Conflict of East and West in Turkey P.36.

چنانچہ ۹۷۴ھ میں سلیمانِ اعظم کے انتقال کے بعد ہی افسر و اورنگ کا مالک ہوا۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے۔ سلیم ثانی انتہا درجہ نااہل اور نالائق تھا۔ اسے بادہ پرستی اور عیش کوشی کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہ تھا، تمام امورِ سلطنت صدرِ اعظم کے ہاتھ میں تھے وہ چونکہ سلیمانِ اعظم کے عہد کا تربیت یافتہ تھا اس لئے سلیم ثانی کے ابتدائی دورِ حکومت میں جب تک صدرِ اعظم کا اقتدار رہا حکومت میں زوال کے آثار نمایاں نہیں ہوئے لیکن اربابِ نظر کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ اب دولتِ عثمانیہ کی عمارت میں تزلزل پیدا ہونے لگا ہے۔

پھر جیسا کہ محترمہ خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں" سلیمان نے حرمِ سلطان کے اثر سے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنا جانشین ایک نہایت ہی نااہل اور نالائق شہزادہ کو بنایا۔ اگر معاملہ یہیں تک محدود رہتا تو سلیم کا سلطان بننا غالباً ایسے برے نتائج کا موجب نہ ہوتا کیونکہ کسی سلطنت کا نظام مستحکم ہوتا ہے تو بادشاہ کی نالائقی کا تدارک اچھے کارکنوں کے حسنِ انتظام سے ہو جاتا ہے مگر حرمِ سلطان نے تو سلیمانِ اعظم کو اس پر بھی آمادہ کیا کہ وہ شہزادوں کو محل میں ہی بند رکھکر تعلیم و تربیت دلانے کا رواج ڈالدے۔ یہیں سے شاہی خاندان کا زوال شروع ہوتا ہے۔ شہزادوں کی تعلیم کے نصاب کے جسمانی تربیت اور علمی تجربے خارج کردیئے گئے، قدیم زبانوں اور مختلف علوم وفنون کی تعلیم ان کو اب بھی دیجاتی تھی۔ لیکن تخت نشینی کے وقت تک وہ قصرِ شاہی کے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے اس نئے رواج (Cage System.) کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایسے ایسے لوگ بادشاہ ہونے لگے جو بند محل میں تعلیم پاتے تھے۔ عیش وعشرت اور تن آسانی کے عادی تھے اور جنھیں کاروبارِ سلطنت سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔

سترہویں صدی میں اول سے آخر تک نااہل سلطانوں کا ایک سلسلہ بندھا ہوا نظر آتا ہے ان میں جو عیش پرست نہیں تھے وہ پرلے درجہ کے ظالم وجابر تھے اور جو حرم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے وہ انتہا سے زیادہ بداطوار تھے ان کی منظورِ نظر بیگمات سلطنت کے بڑے بڑے عہدے فروخت کرنے لگیں، ترکی زبان میں ایک کہاوت ہے" مچھلی سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے"

حرم اور بادشاہوں کا یہ رنگ دیکھکر عمّالِ عثمانی بھی اسی رنگ میں رنگے جانے لگے۔ یہاں تک کہ رشوت دیکر عہدے حاصل کرنا ایک معمولی بات ہوگئی۔ پہلے قابلیت ترقی کا معیار تھا مگر اب اس کی کوئی پرسش نہیں رہی۔ غرض یہ ہے کہ جو سلاطینِ عثمانی مردانہ شجاعت و بہادری میں قدیم رومی بادشاہوں سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے اب وہ بازنطینی حکمرانوں کی طرح (آرام پسند اور تن آسان) ہونے لگے، اس زمانہ کا عثمانی قصرِ شاہی بازنطینی محل شاہی کا جواب تھا۔

اس دورِ تنزل میں بہت کم سلطان ایسے ہوں گے جو طبعی موت سے مرے ہوں کیونکہ اس صدی میں فوجوں کی بغاوت اور فرماں رواؤں کی معزولی کا بازار گرم تھا اس بنا پر وہ اکثر قتل کردئیے جاتے تھے۔"[1] جیسا کہ محترمہ خالدہ ادیب خانم اور دوسرے مورخین کا خیال ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولتِ عثمانیہ کا زوال سلیمان اعظم کے بعد سے ہی شروع ہوا لیکن ہمارے خیال میں اس زوال کے جراثیم عہدِ سلیمانی سے بہت پہلے پیدا ہونے شروع ہوگئے تھے اور خود عثمان خاں غازی نے جس نظامِ حکومت کی بنیاد رکھی تھی وہ زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتا تھا۔

ولی عہدی | اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز ولی عہدی کا رواج ہے، اسلام نے بادشاہ یا خلیفہ کے لئے جو انتخابی طریقہ تجویز کیا ہے وہی حکومت کو مضبوط اور پائیدار بنانے کا کفیل ہوسکتا تھا۔ ولی عہدی کے رواج کا اثر جیسا کہ عہدِ بنی عباس میں بکثرت ہوا۔ ایک طرف تو یہ ہوتا ہے کہ چونکہ بادشاہِ وقت کا ہر بڑا لڑکا یہ یقین رکھتا ہے کہ باپ کے بعد وہ لازمًا تخت و تاج کا مالک ہوگا۔ اس بنا پر اس کو اس بات کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی کہ وہ شاہانہ عادات و خصائل پیدا کرکے اپنے تئیں اس منصبِ رفیع کا مستحق بھی ثابت کرے وہ سمجھتا ہے کہ حکمرانی کی عدم صلاحیت کے باوجود بہر حال وہی بادشاہ ہوگا۔ دوسری جانب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ کچھ اربابِ اغراض ولی عہد کے ارد گرد جمع ہوجاتے ہیں اور وہ ازراہِ تملق ولی عہد کے ہر کام کو سراہکر اور اس کی ہاں میں ہاں ملاکر ولی عہد کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرلیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ولی عہد کو اپنی کمزوریاں محسوس نہیں ہوتیں

[1] Confict of East and West in Turkey. P. 36. 37.

اور وہ عمر بھر بر خود غلط بنا رہتا ہے۔ پھر جب وہ ولی عہدی سے ترقی کر کے تخت نشینِ سلطنت ہوتا ہے تو اب بھی اربابِ اغراض اس کو اپنے مقاصد کا آلۂ کار بنا لیتے ہیں اور اس سے ملک میں طرح طرح کے فتنے اور ہنگامے پیدا ہوتے ہیں۔

ان مفاسد کے علاوہ ولی عہدی کے رواج کا سب سے زیادہ الم ناک اور ہلاکت انگیز نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قصرِ شاہی طرح طرح کی ناپاک سازشوں اور فریب کاریوں کا مرکز بن جاتا ہے اور ان کا ظہور بسا اوقات نہایت ہی دردناک قتل کی صورتوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سلطان بایزید یلدرم نے اپنے برادرِ خورد یعقوب چلپی کو جو شجاعت و دلیری میں اپنے بڑے بھائی سے کم نہ تھا محض اس خوف سے کہ سلطنت کا نزاع برپا نہ ہو اور سلطان سلیم اول نے اپنے دو بھائیوں احمد اور کرکود کو قتل کرایا۔ دولتِ عثمانیہ کا نامور تاجدار اور تاریخِ اسلام کا بلند مرتبت ہیرو سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی عظیم الشان فتح جس کی قبائے عظمت کا ایک تکمۂ زریں ہے اس نے بھی عنانِ سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دودھ پیتے بھائی کو جو سرویا کی شہزادی کے بطن سے تھا عین اس وقت جبکہ بچہ کی ماں سلطان کی خدمت میں تخت نشینی کا ہدیۂ تہنیت پیش کر رہی تھی حوض میں غرق کرا کر ہلاک کرا دیا۔[1] پھر محمد فاتح نے اپنے اس فعل پر نادم اور پشیمان ہونے کے بجائے بمصداق "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" یہ بھی کیا کہ "حکومت و سلطنت کے تحفظ کی خاطر بھائیوں کے قتل کو قانوناً جائز ہی قرار دیدیا" جسے مورخین عام طور پر "خونین قانون" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ نیا اجتہادی حکم کس حد تک شرعی اور اسلامی حکم کہلانے کا مستحق ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک شیر خوار بچہ سے بھی فاتح قسطنطنیہ کی حکومت کو فنا ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں ایک فاتح کی اندرونی ذہنیت بے نقاب ہو جاتی ہے اور یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ اس کی فتوحات کا مقصد کس حد تک خالص اسلامی اور دینی ہے۔ سلطان محمد فاتح کے اس ناجائز اور سراسر خونین قانون کا نتیجہ یہ ہوا کہ مراد ثالث نے اپنے پانچوں بھائیوں کو اور اس کے بیٹے محمد ثالث نے اپنے ۱۹ بھائیوں کو اسی قانون کی آڑ لیکر بے رحمی سے قتل کرا دیا۔

[1] دولتِ عثمانیہ ج اص ۱۲۵۔

غرض یہ ہے کہ ان تمام مفاسد اور خود غرضانہ سفاکیوں کا اصل منبع ولی عہدی کا رواج تھا ورنہ اگر اسلام کا دستور جمہوری انتخاب مروج رہتا تو ہر امیدوارِ سلطنت اپنی سیرت اور اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ پسندیدہ بنا کر جمہور کی رائے کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرتا۔ اور پھر جو شخص بھی بادشاہ ہو جاتا تو چونکہ رائے عامہ کی قوت اس کی پشت پر ہوتی اس لئے کسی کو اس کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

اجنبی عورتوں سے شادی

دوسرا سبب یہ ہے کہ عثمانی سلاطین شروع سے ہی شادی بیاہ کے معاملہ میں غیر محتاط تھے یعنی انھوں نے غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنے اور ان کو محل کے تمام معاملات میں دخیل بنا کر رکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ اورخاں نے کنتا کوزین کی لڑکی تھیوڈورا سے شادی کی اور اسے مذہبِ عیسوی پر ہی قائم رہ کر زندگی بسر کرنے کی اجازت دی۔ اورخاں کے بعد اس کے جانشین سلطان مراد اول نے بلغاریا کے بادشاہ سیسمان کی لڑکی سے شادی کی۔ سلطان بایزید ایلدرم نے سرویا کے بادشاہ کی بہن ڈیسپنیا سے نکاح کیا۔ پھر سلیمانِ اعظم کے نکاح میں جو روسی خاتون حرم سلطان تھی اور اس کی وجہ سے دولتِ عثمانیہ پر جو آفت آئی اس کا حال آپ ابھی گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے۔ یہ تو وہ شہزادیاں تھیں جو محلِ سلطانی میں بیگم بن کر رہتی تھیں اور اور جو سلطنت کے معاملات میں دخل دینا اپنا حق سمجھتی تھیں۔ ان کے علاوہ جو غیر مسلم باندیاں اور کنیزکیں محل میں عمل دخل رکھتی تھیں ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے چنانچہ استاذ کرد علی دولتِ عثمانیہ کے اسبابِ زوال پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ولعلہ یعد من الاسباب الجوہریۃ فی الانحطاط	آلِ عثمان کے انحطاط کا ایک جوہری
تغیر الدم السلطانی فی آل عثمان تغیرا	سبب یہ ہے کہ عیسائی باندیوں اور
کبیرا لکثرۃ ما اقتنوا من السراری و	کنیزکوں کی کثرت کی وجہ سے سلطانی
الجواری النصرانیات۔[1]	خون بہت زیادہ بدل گیا تھا۔

[1] الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۹۹۔

چنانچہ سلیم ثانی آدھا روسی تھا، کیونکہ اس کی ماں روس کی باشندہ تھی۔ محمد ثالث آدھا اطالوی تھا اس لئے کہ اس کی والدہ شہر وینس (Venice.) کی رہنے والی تھی۔ اسی طرح عثمان ثانی، مراد رابع اور ابراہیم اول نصف رومی تھے، ان سب کی مائیں رومی خواتین تھیں۔

غیر مسلم خواتین کی محل میں کثرت کا نتیجہ وہی ہوا جو بنو عباس کے عہد میں رونما ہو چکا تھا یعنی جب تک سلاطین جری، بہادر اور بیدار مغز پیدا ہوتے رہے، ان غیر مسلم خواتین کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے، لیکن جب سے سلیم ثانی، مراد ثالث اور مصطفیٰ اول جیسے عشرت پسند اور عیش کوش سلاطین تختِ حکومت پر قابض ہونے لگے تو عنانِ سلطنت بھی انھیں جواری وسراری کے ہاتھوں میں منتقل ہونے لگی، دولتِ عثمانیہ کے لائق مصنف لکھتے ہیں۔

مراد ثالث (۹۸۲ھ تا ۱۰۰۳ھ) کے عہد کے ابتدائی چار سال صوقوللی پاشا کی صدارت کے تھے۔ پھر بھی سلطان پر حرم کا اثر روز بروز زیادہ ہوتا جارہا تھا۔ حرم کی چار خاتونوں کا اثر خصوصیت کے ساتھ اس پر بہت زیادہ تھا اور امورِ سلطنت کا انصرام حقیقۃً ان ہی خواتین کے منشاء کے مطابق ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک سلطانہ والدہ نور بانو تھی، دوسری مراد کی محبوب سلطانہ صفیہ تھی جو وینس کے مشہور اور سر برآوردہ خاندان بفو (Baffo.) کی رئیس زادی تھی اور اپنے حسنِ صورت اور ذکاوت طبع کے باعث مراد پر حد درجہ حاوی تھی۔ صفیہ کو سلطنت کی جنگ و صلح میں خاص دخل تھا چنانچہ باوجود اس کے کہ وینس نے ایک سے زائد بار سلطان کو برانگیختہ کیا۔ محض صفیہ کی کوششوں سے جنگ کی نوبت نہ آئی۔ تیسری ایک ہنگری خاتون تھی جس نے کچھ دنوں کے لئے صفیہ کی محبوبیت کو زائل کر دیا تھا اور مراد کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ چوتھی خاتون جان فدا حرم سلطانی کی خاص مہتمم تھی اور وہ بھی اپنی لیاقت اور سلیقہ شعاری کی وجہ سے مراد کے مزاج میں بہت کچھ دخیل تھی، یہی چار خواتین سلطان کی مشیر کار اور انتظام حکومت کی حقیقی نگراں تھیں۔[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابیات یعنی عیسائی اور یہودی خواتین کے ساتھ ازدواجی تعلقات

---

[1] دولتِ عثمانیہ ج ۱ ص ۲۴۰۔

رکھنا اسلام میں حرام نہیں بلکہ جائز ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر اسلامی سوسائٹی میں یا محلِ سلطانی میں ان خواتین کا ثروا قتدار بڑھ جائے تو پھر یہ تباہ کن نتائج و اثرات کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حذیفہ بن الیمان نے مدائن میں ایک یہودی خاتون سے نکاح کر لیا تو حضرت عمرؓ نے ان کو بتاکید لکھا کہ تم اس عورت کو چھوڑ دو" حذیفہ نے پوچھا "کیا یہ حرام فعل ہے؟ حضرت عمرؓ نے پھر اس کے جواب میں تحریر فرمایا "میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ تم میرے خط کو پڑھکر اسے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی پہلے اس خاتون سے تعلق منقطع کر لو مجھکو اندیشہ ہے کہ کہیں مسلمان تمہاری پیروی کر کے ذمیوں کی خواتین سے ان کے حسن و جمال کی وجہ سے نکاح کرنا شروع نہ کر دیں، اگر ایسا ہوا تو مسلمان خواتین کے لیے یہی فتنہ کچھ کم نہیں ہوگا"[۱]

فوج کی سرکشی قصرِ شاہی کے ان ناگفتہ بہ حالات کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ فوج میں اطاعت اور فرماں برداری کا جذبہ باقی نہ رہے۔ طوائف الملوکی عام ہو جائے اور امراء اور وزراء کسی بات کا اندیشہ کئے بغیر جو چاہیں کر بیٹھیں۔ ینی چری ترکوں کی ایک نہایت ہی منتخب اور بہادر فوج تھی یہاں تک کہ اگر اس کو سلطنت کا دستِ راست بھی کہا جائے تو بجا ہے لیکن سلطان مراد ثالث کی عیش کوشی اور امورِ سلطنت کی طرف سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج سلطان سے باغی ہو گئی اور ۱۵۸۹ئہ میں اس نے قصرِ سلطنت کے سامنے عام مظاہرہ شروع کر دیا۔ سلطان کو اس وقت فوج کے سامنے جھکنا پڑا اور جو ان کا مطالبہ تھا وہ پورا کر دیا گیا۔ سلطان کے اس فعل سے فوج کو اس قدر جسارت ہو گئی کہ وہ جب چاہتی تھی اپنے کسی ایک مطالبہ کو منوانے کے لئے علمِ بغاوت بلند کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ صدرِ اعظم اور دوسرے بڑے بڑے عہدہ داروں کے تقررات بھی انھیں لوگوں کے منشا اور خواہش کے مطابق ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہانتک پہنچی کہ عہدِ آخر کے خلفاءِ عباسی کی طرح سلاطینِ عثمانی بھی ان کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح رہنے لگے۔ اور سلطنت ان لوگوں کی اغراض کا ایک بازیچہ بن گئی۔

---

[۱] کتاب الآثار امام محمد مطبوعہ ہند ص ٦٤

امرار اور وزرار کی خیانت و غداری

ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ چھوٹوں سے لیکر بڑوں تک کے اخلاق تباہ و برباد ہو گئے۔ نفسانیت اور غرض پرستی ہر ایک کا شیوہ بن گئی۔ امرار اور وزرار کی خیانت و غداری یہاں تک پہنچی کہ انھیں دولتِ عثمانیہ کے سخت ترین دشمنوں سے ساز باز کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا تھا اور عین جنگ کے مواقع پر اپنے ذاتی مفاد کے لئے ان سے مل جاتے تھے، دولتِ عثمانیہ کا سب سے زیادہ خطرناک دشمن روس تھا۔ سلطان احمد ثالث کے عہد میں روس کا شہنشاہ پیٹر اعظم قسطنطنیہ کی فتح کو اپنی زندگی کا اہم نصب العین بنا کر عثمانی علاقوں پر لشکر کشی کے ارادہ سے روانہ ہوا اور دریائے پرتھ کو عبور کرنے کے بعد ساحل پر اپنے ڈیرے خیمے نصب کر دیئے تو اس وقت اسے معلوم ہوا کہ ترکی کا صدر اعظم بلطہ جی محمد پاشا سامنے کی پہاڑیوں پر دو لاکھ کا لشکر عظیم لئے پڑا ہے، اس وقت جنگی اعتبار سے شہنشاہِ روس نہایت خطرناک پوزیشن میں تھا اس کی فوج تعداد میں ترکی فوج سے کم تھی۔ پھر ایک طرف دریا تھا اور دوسری جانب ایک وسیع دلدل اور سامنے ترکی کی فوجِ گراں تھی۔ اگر محمد پاشا چاہتا تو پیٹر اعظم کو قتل یا گرفتار کر سکتا تھا لیکن شہنشاہ کی ملکہ کیتھرائن نے جو حسن و جمال کے علاوہ ذہانت و ذکاوت میں ممتاز تھی تدبیر یہ کی کہ بہت کچھ مال و دولت اور زیورات بلطہ جی محمد پاشا کے نائب کے پاس بہ طور نذرانہ بھیجدیا اور نائب نے صدر اعظم محمد پاشا کو آمادہ کیا کہ وہ ایک معاہدہ کر کے اپنا محاصرہ اٹھا لے، چنانچہ یہی ہوا اور روس کی فوج سلامتی کے ساتھ واپس چلی گئی۔

ایسا ہی ایک واقعہ سلطان عبد المجید کے عہد میں ہوا۔ محمد علی پاشا خدیو مصر کے بیٹے ابراہیم پاشا نے ترکوں کو نصیبین میں شکست فاش دی جس سے اغلب یہ تھا کہ ابراہیم کا اقتدار ایشیائے کوچک میں بڑھ جائے گا۔ ایسے نازک موقع پر احمد پاشا قپودان نے سارا ترکی بیڑہ اسکندریہ میں لا کر خدیو مذکور کے حوالہ کر دیا اگر انگلستان بیچ میں نہ پڑتا تو بہت ممکن تھا کہ خدیو مصر قسطنطنیہ پر بھی قابض ہو جاتا اور ترکی سلطنت صفحۂ ہستی سے ہی مٹ جاتی۔

سلطان عبد الحمید ثانی کے عہد میں انگریز جزیرہ سائپرس کو لینا چاہتے تھے مگر سلطان اس

کے لئے تیار نہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جب صفوت پاشا صدر اعظم مقرر ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ جزیرہ مذکور کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔ اور سلطان کو یہ کہکر تسکین دیدی کہ انگریز برلن کانفرنس میں ہماری مدد کریں گے۔

یہ اسباب تو وہ ہیں جو اصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جزئی طور پر ان سے جو اور چند خرابیاں پیدا ہوئیں ان کو مختصراً نمبروار اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

اقتصادی تنزل ترک اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے نہایت جفاکش اور محنتی قوم ہے مشینری کے دور سے پہلے ان کی اقتصادی حالت بہت اچھی رہی کیونکہ اپنے ہاتھوں سے زراعت کرتے تھے اور صنعت و حرفت کے کاموں میں بھی دخل رکھتے اور انھیں بڑی محنت اور تن دہی سے انجام دیتے تھے، لیکن جب مشینری کا عہد شروع ہوا اور ہاتھ کی محنت و مشقت کے بجائے مشین سے کام لیا جانے لگا تو چونکہ حکومت کی جانب سے ترکوں کے لئے مشینوں سے کام کرنے کے مواقع بہم نہیں پہنچائے گئے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اقتصادی دوڑ میں ترک اپنی ہمسایہ قوموں کے حریف نہیں بن سکے اور ان کی حالت روز بروز ناگفتہ بہ ہونے لگی۔

علمار کا جمود اس قومی انحطاط و تنزل کا اثر علمار کرام کی جماعت پر بھی ہوا جو عوام و خواص پر بلکہ خود حکومت پر اپنا بڑا اثر و اقتدار رکھتے تھے۔ خالدہ ادیب خانم علمار کی اس غفلت شعاری کا ذکر ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

> "جب تک دنیا پر متکلمین کے فلسفہ کی حکومت رہی یہ (علمار) اپنا کام نہایت خوبی سے کرتے رہے مدرسہ سلیمانیہ اور مدرسۂ فاتح اس زمانہ میں تمام مروجہ علوم و فنون کے مرکز تھے مگر جب مغرب نے کلام کی زنجیروں کو توڑ کر نئی علم و حکمت کی بنا ڈالی جس نے دنیا کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تو علمار کی جماعت علمی کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ رہی یہ حضرات سمجھتے تھے کہ علم جس مقام پر تیرہویں صدی میں تھا وہاں سے اب تک آگے نہیں بڑھا ہے یہ طرز خیال انیسویں صدی کے وسط تک ان کے نظامِ تعلیم پر حاوی رہا۔ ترکی اور دوسرے اسلامی

ممالک کے علماء کا طرزِ خیال جذبۂ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا تھا۔" [1]

یہ علمار لکیر کے فقیر تھے اور کسی نئی اصلاح کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ چنانچہ جب سلطان سلیم ثالث (از ۱۲۰۳ھ تا ۱۲۲۲ھ) نے اپنی تعلیمی اور فوجی اصلاحات کی اسکیم کو نافذ کرنا چاہا جس کا مفاد یہ تھا کہ ترکی میں جدید علوم و فنون کے مدارس قائم کئے جائیں اور فوج کو جدید فنِ حرب سے واقف کر کے اسے جدید آلات و اسلحۂ حرب سے آراستہ کیا جائے تو اس اسکیم کی مخالفت سب سے زیادہ اسی جماعت کی طرف سے ہوئی۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیدیا کہ جدید قسم کا فوجی لباس پہننا شعائرِ اسلام کے خلاف ہے۔ ترکی مشہور فوج ینی چری اصلاحات کی مخالفت میں علمار کی ہم نوا تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس فوج نے سلطان کے خلاف بغاوت کردی اور جو جو وزرار اور اعیانِ مملکت اصلاحات کے معاملہ میں سلطان کے حامی تھے۔ ان سب کو چن چن کر آتت میدان میں لاتے تھے اور بے دردی سے قتل کردیتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ قتل کا یہ سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ سلطان سلیم نے فوج کی یہ خودسری اور شورش پسندی دیکھکر مجبوراً تمام اصلاحات کے منسوخ کرنے کا اعلان عام کردیا مگر ان فتنہ پردازوں کی آتشِ غیظ و غضب پھر بھی سرد نہیں ہوئی اور انھوں نے مفتیِ اعظم اور شیخ الاسلام سے شرعی جواز کی سند حاصل کر کے سلیم کو معزول کردیا۔

۱۲۹۳ھ میں جب سلطان عبدالحمید ثانی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی ملک کی اندرونی حالت کی غایت درجہ ابتری اور ممالکِ خارجہ کی ترقی سے متاثر ہو کر اصلاحات ملکی کی ایک اسکیم نافذ کرنی چاہی مگر اس غریب کا حشر بھی یہی ہوا کہ شریعتِ اسلام کے نام پر فوج کے بعض حصے دستورِ اصلاحات کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور آخر کار شیخ الاسلام سے فتویٰ حاصل کرنے کے بعد سلطان کو تخت سے اتار دیا گیا۔

ترکی کی حریف اقوام کی بیداری | ایک طرف ترکی کی یہ حالت تھی کہ جمود و بے حسی اور غفلت وجہالت کے تاریک بادلوں میں لپٹی ہوئی تھی اور دوسری جانب اس کا حریف یورپ دورِ جہالت و نادانی سے

[1] ترکی میں کشمکشِ مشرق و مغرب خطبۂ دوم

نکل کر علوم وفنون کے چمن زار میں سانس لے رہا تھا۔ فوجیں نئے نئے آلاتِ حرب سے مسلح ہو رہی تھیں اس بنا پر اب یورپین اقوام کے دل میں طبعی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ترکی کے حصے بخرے کر لئے جائیں اور اس "مردِ بیمار" کو ایسی ضرب کاری لگائی جائے کہ اس کا سانس اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جائے۔ یورپین اقوام کے ان منصوبوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، روس، یونان اور دوسری بلقانی ریاستوں نے انگلینڈ اور فرانس کے ساتھ ساز باز کر کے ترکی پر یورشیں شروع کر دیں اور اب عثمانی مقبوضات یکے بعد دیگرے ترکوں کے قبضہ سے نکلنے شروع ہو گئے۔ جنگِ پلونا کے بعد جنگِ بلقان اور عالمگیر جنگ کی یاد اب تک بہت سے لوگوں کے دلوں میں تازہ ہو گی۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ بحرِ روم کے مشہور جزائر کریٹ، قبرص اور مالٹا ترکوں کے قبضہ سے نکلے، پھر بغداد، شام، لبنان اور فلسطین سے موصل تک کا سارا علاقہ ان سے چھین لیا گیا۔ جو بلقانی ریاستیں ترکی کی باج گذار تھیں وہ آزاد ہو گئیں اور خود ایشیائے کوچک کے بھی حصے بخرے ہو گئے۔

عربوں کی بغاوت | جنگِ عالمگیر (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ جو ترک سلطان سلیم اول کے زمانہ سے اب تک اپنی چند در چند کوتاہیوں اور سیاسی زبوں حالیوں کے باوجود اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین کہلانے پر فخر کرتے آئے تھے ان کے ساتھ عربوں اور خصوصاً شریفِ مکہ نے نہایت غداری اور خدع و فریب کا معاملہ کیا۔ ان لوگوں کو "خود مختار عرب اسٹیٹ" کا ایک ایسا سبز باغ دکھایا گیا کہ انھوں نے اسلامی اخوت اور اپنے دینی فرض سے اغماضِ نظر کر کے ترکوں کے دشمنوں سے ساز باز کر لیا اور جو ترکی سپاہ حجاز میں تھی اسے نکال دیا۔ (مگر شکر کا مقام ہے کہ اب عربوں کو اپنی غلطی کا احساس پیدا ہو چلا ہے اور وہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں)۔

خلافت کا خاتمہ | بہر حال ٹرکی کے "مردِ بیمار" کا ضعف اس درجہ تک پہنچ گیا تھا کہ اگر مصطفیٰ کمال اور ان کے رفقا رایسے ارباب عزم، باہمت اور بلند حوصلہ نوجوان پیدا نہ ہوتے تو وہ زندگی کے آخری سانس لیکر ختم ہو چکا ہوتا۔ لیکن ترکی کو دشمنوں اور بدخواہوں کے علی الرغم ابھی دنیا میں ایک زندہ قوم کی طرح رہنا تھا اس لئے مصطفیٰ کمال کی مسیحا نفسی سے اس کے تنِ مردہ میں پھر ایک روحِ تازہ

پیدا ہوگئی اور آج وہ اس قابل ہے کہ مغرب کی بڑی سے بڑی حکومت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات چیت کر سکے۔

ٹرکی بے شبہ آج زندہ ہے اس کو اس سے چھنے ہوئے علاقے جن پر یونانی قبضہ کر بیٹھے تھے وہ بھی واپس مل گئے ہیں اور وہ صنعت و حرفت، تعلیم و معاشرت، فوجی تنظیم و تربیت وغیرہ کے لحاظ سے آج یورپ کی کسی قوم سے پیچھے نہیں، لیکن اب ٹرکی صرف اپنے لئے زندہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب کہ وہاں خلافت کا الغا کیا گیا۔ اس وقت سے اس کا تعلق عالمِ اسلام سے منقطع سا ہو چکا ہے اور اس کا فیصلہ ابھی نہیں بلکہ مستقبل میں ہوگا کہ ٹرکی کو مغربی اقوام کے ہمسر ہونے کے جذبہ میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے "المومنون اخوۃ" کا سبق بھی یاد رہا یا نہیں۔

حالتِ امروز | آج ہمارے بہت سے خوش خیال حضرات کہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کر رہے ہیں، ٹرکی کی طرح ایران اور مصر بھی ترقی کی شاہ راہ پر گامزن ہے اور افغانستان بھی جدید تہذیب تمدن کی روشنی سے جگمگا رہا ہے! ہاں یہ سب صحیح ہے لیکن یہ حقیقت بھی کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیئے کہ اگر ان سب اسلامی ملکوں کی یہ ترقی بحیثیت مسلمان ہونے کے اور اسلام کو سربلند و سرفراز کرنے کے لئے ہے تو ہم سے زیادہ کسی اور کو ان ترقیات پر خوش ہونے کا حق نہیں ہے لیکن اگر خدانخواستہ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ افغانستان کی ترقی افغانی قوم کے لئے ٹرکی عروج ترکوں کے واسطے اور ایران و مصر کی ترقی ایرانی اور مصری اقوام کے لئے ہے اور بس! تو کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ان ملکوں کو اس ترقی پر کوئی مبارکباد پیش نہیں کر سکتا۔

اندلس میں مسلمانوں کی حکومت اور اُس کا زوال

بنوامیہ نے فتوحات کے سلسلہ میں جو شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں، ان میں اسپین کی فتح ایک خاص اہمیت اور مقام رکھتی ہے۔ لیکن جس طرح اس جزیرہ نما کا فتح کرنا اور صدیوں تک اس پر حکمراں رہنا مسلمانوں کا ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے۔ اسی طرح اس ملک کو اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھنا اور نہایت ذلیل ہو کر یہاں سے نکلنا ان کے لئے ننگ و عار کا نہایت بدنما داغ ہے۔ ہم ذیل میں اس کی تاریخ مختصراً بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو عبرت ہو اور وہ اپنے ماضی سے مستقبل کے لئے کوئی سبق حاصل کر سکیں۔

اسپین جس کو ہسپانیہ یا اندلس کہتے ہیں۔ یورپ کے جنوب و مغرب میں ایک جزیرہ نما ہے جس کا رقبہ دو لاکھ میل مربع سے زیادہ اور آب و ہوا تمام یورپین ممالک سے زیادہ معتدل اور خوشگوار ہے۔ وادی الکبیر اور ٹیگسی دو مشہور دریا ہیں جو یہاں بہتے ہیں اور جنھوں نے چند اور چھوٹے چھوٹے دریاؤں کے ساتھ مل کر تمام ملک کو گلزار بنا دیا ہے۔

مسلمانوں کے حملہ سے پہلے یہاں صدیوں سے گاتھ خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کے فرمانروا راڈرک کے عہد میں اموی خلیفہ ولید بن عبد الملک کی اجازت سے شمالی افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر نے اس ملک کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔[1] چنانچہ پہلے پانچسو آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ

---

[1] ابن اثیر نے اپنی تاریخ الکامل ج ۴ ص ۲۶۹ مطبوعۂ المطبعۃ الازہریہ سنہ ۱۳۰۱ھ میں اس حملہ کی تقریب یہ بیان کی ہے کہ اندلس کے شاہی خاندان میں رسم یہ تھی کہ وہ اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو طلیطلہ بادشاہ کی خدمت میں (باقی ص ۱۵۸ پر)

بھیجکر یہاں کے اندرونی اور سیاسی حالات کا پتہ چلایا اور پھر ۹۲ھ میں اپنے آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد کی قیادت میں سات ہزار مجاہدینِ اسلام کا ایک لشکر روانہ کیا جس میں بربروں کی اکثریت تھی۔ یہ لشکر کشتیوں کے ذریعہ بارہ میل چوڑی آبنائے کو عبور کر کے اندلس میں داخل ہوا اور یہاں کی مشرقی ساحلی چٹان پر قبضہ کر لیا۔ یہی چٹان ہے جس کو طارق کے نام کی مناسبت سے جبلِ طارق اور انگریزی میں جبرالٹر کہتے ہیں۔ اب مسلمانوں نے یہاں سے شمال کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ پہاڑ سے اتر کر سحرا کی طرف آئے اور جزیرۃ خضرا فتح کر لیا۔ روڈرک اس وقت اپنی کسی اور جنگ میں مصروف تھا۔ اس نے مسلمانوں کے اس حملہ کی خبر سنی تو فوراً ایک لاکھ کا لشکر جرار لیکر بڑے ساز و سامان اور شوکت و حشم کے ساتھ اسلامی لشکر سے مقابلہ کے لئے بڑھا۔ طارق کی درخواست پر موسیٰ بن نصیر نے پانچ ہزار مجاہدین اسلام کا لشکر بطور امداد اور بھیجدیا تھا۔ اس طرح مسلمان کل مل ملاکر بارہ ہزار تھے اور دوسری جانب ایک لاکھ کا ٹڈی دل تھا۔ علاوہ بریں مسلمان اس ملک میں بالکل اجنبی تھے اور اندلس کے لشکر کا تو یہ اپنا وطن ہی تھا اس صورتِ حال کو دیکھکر طارق نے تمام کشتیاں برباد کر دیں اور اپنی فوج کو خطاب کر کے ایک نہایت پرجوش تقریر کی جس میں اس نے کہا:۔

"مسلمانو! سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن ہمارے سامنے اب ان دونوں میں سے کسی ایک صورت کو اختیار کر لو"

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۸) رہنے کے لئے بھیجدیتے تھے تاکہ وہ یہاں ادب حاصل کریں۔ اس رسم کے مطابق یولین نامی ایک ایک شخص نے بھی اپنی لڑکی بادشاہِ وقت راڈرک (جس کو ابنِ اثیر نے رذریق لکھا ہے) کی خدمت میں ادب اور تربیت حاصل کرنے کے لئے بھیجی۔ یہ لڑکی نہایت حسین تھی۔ راڈرک اس پر عاشق ہوگیا اور اسے بجبر اپنے تصرف میں لے آیا۔ لڑکی نے اصل واقعہ کی اطلاع اپنے باپ کو کی۔ وہ یہ معلوم کر کے سخت برہم ہوا اور اس نے موسیٰ بن نصیر کو اندلس پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ چنانچہ موسیٰ بن نصیر نے جو لشکر بھیجا تھا یولین اس کے لئے رہنما کا کام انجام دیتا تھا۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کی فوج میں انتشار پیدا ہو گیا یہ جنگ دریائے لکہ کے ساحل پر ہوئی تھی جو شذونہ کے مضافات میں سے تھا۔ راڈرک اس شکست سے سراسیمہ ہو کر ایسا فرار ہوا کہ پھر اس کا نام و نشان ہی نہ مل سکا۔

ابنِ اثیر اور بعض دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ دریا میں ڈوب مرا تھا۔ اہلِ اندلس کا خیال تھا کہ مسلمان آگے نہ بڑھیں گے اور لوٹ مار کر کے واپس چلے جائیں گے۔ اسی خیال کی بنا پر راڈرک چونکہ شاہی خاندان سے نہیں تھا اس لئے شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے اعیان و امرا نے راڈرک کی مدد دل سے نہیں کی۔ وہ چاہتے تھے کہ راڈرک کا اس جنگ میں صفایا ہو جائے۔ اور مسلمان اس کے بعد مالِ غنیمت لیکر واپس چلے جائیں تو اچھا ہے پھر اس کے بعد وہ خود شاہی خاندان کے کسی فرد کو اندلس کا بادشاہ بنا دیں گے۔ لیکن اسلامی فوج نے ان لوگوں کی توقعات کے برخلاف حضرار کی فتح کے بعد بھی اپنی پیشقدمی جاری رکھی اور صوبہ پر صوبہ فتح کرتے ہوئے آخر ایک سال میں ہی کوہ پیری نیز سے گذر کر اُس مقام تک پہنچ گئی جو آج فرانس کے حدود میں شامل ہے۔

اس اثنا میں طارق کی مسلسل فتوحات کا حال سن کر موسیٰ بھی ایک فوج لیکر یہاں پہنچ گیا تھا جس سے اسلامی فوج کی طاقت دوچند ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود متعدد اسباب کی بِنا پر اسلامی فوج فرانس کے حدود میں کوئی علاقہ فتح نہ کر سکی۔

موسیٰ بن نصیر اور طارق دونوں اندلس کی مہم سر کرنے میں مشغول تھے اور اس وجہ سے یہاں کی اطلاعات دربارِ خلافت کو جلد جلد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس بنا پر ولید بن عبد الملک کے دل میں موسیٰ بن نصیر کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ابنِ قتیبہ کا بیان ہے کہ ولید نے قاضی کو نماز کے بعد موسیٰ کے حق میں بددعا کرنے کا حکم کر دیا تھا اسی اثنا میں موسیٰ کا قاصد فتح کا مژدۂ جانفزا لیکر دمشق پہنچا اور یہاں مسجد میں اس نے موسیٰ کے حق میں بددعائیں ہوتی سنا تو اسے سخت اچنبھا اور افسوس ہوا۔ وہ بولا "لوگو! موسیٰ کے حق میں بددعا کرنے میں

خدا سے ڈرو۔ میں ابھی اس کے ہی پاس سے آرہا ہوں۔ اس نے نہ خلیفہ کی اطاعت سے سرتابی کی ہے اور نہ اس نے اسلامی جماعت کو چھوڑا ہے۔ وہ مشرکین کے ساتھ جہاد اور مسلمانوں کی عزت و حرمت کی طرف سے دفاع کرنے میں مشغول ہے۔ خدا نے اس کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو جو فتوحات اور اموالِ غنیمت عطا فرمائے ہیں تم ان کا حال سنو گے تو بیحد مسرور ہو گے۔ چنانچہ قاصد نے ولید بن عبدالملک کے دربار میں حاضر ہو کر اندلس کی فتوحات کا ماجرا بیان کیا تو ولید دربارِ ایزدی میں سجدہائے شکر بجالایا اور دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا۔ [1]

بہرحال ابھی اندلس کی مہم کامل طور پر سر نہیں ہوئی تھی کہ موسیٰ کے نام دربارِ خلافت کی طرف سے واپس ہو جانے کا تاکیدی حکم پہنچا اور وہ جلد اس سے فارغ ہو کر اپنے لڑکے عبدالعزیز کو اپنا قائم مقام مقرر کر کے ۹۴ھ میں شام چلا آیا۔

اندلس میں مسلمانوں کے کارنامے

اس تاریخ سے لیکر ۸۹۷ھ تک یعنی آٹھ سو سال تک مسلمان اس ملک کے حاکم رہے اس مدت میں زندگی اور عمران کے مختلف شعبوں میں انھوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ ان کی روشن یادگار کی حیثیت سے ثبت رہیں گے ان کی تفصیل سے ضخیم مجلدات پر ہیں۔ ہم ذیل میں مشہور مستشرق سدیو کی تاریخ سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے قارئینِ کرام کو ان کارناموں کا ایک مختصر سا اندازہ ہو سکے گا۔ [2] موصوف لکھتے ہیں۔

> "عرب چونکہ زراعت اور تجارت کے اصول سے خوب واقف تھے اور ان کا تجربہ رکھتے تھے۔ اس بنا پر انھوں نے اپنے اصول سے کام لیکر اندلس کے شہروں کو گل و گلزار بنا دیا اور ایک شہر کو دوسرے شہر سے تجارتی تعلقات کے ذریعہ اس طرح مربوط کر دیا کہ رفاہیت اور خوشحالی عام ہو گئی اور پہلے سے عربوں اور بربر میں جو منافرت تھی وہ بھی جاتی رہی۔

[1] کتاب الامامۃ والسیاسۃ ج ۲ ص ۱۱۹ - ۱۲۰ -

[2] اصل کتاب میرے سامنے نہیں ہے۔ میں نے یہ اقتباس دائرۃ المعارف فرید وجدی لفظ اندلس سے لیا ہے۔

اسپین کے عرب علوم و فنون میں، صنعت و حرفت میں اور اخلاق و عادات میں اہلِ فرنگ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ قسطیلہ کے شاہانِ فرنگ بھی عربوں کی کریم النفسی اور ان کی شرافت کا یقین رکھتے تھے۔ قرآن پر عامل ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کسی حسب و نسب پر اس کی ترقی کا دارو مدار نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ اس کے فضائل اور کمالات کو دیکھتے تھے۔

عربوں کو علوم و فنون، صنعت و حرفت اور خلافت وزراعت میں بڑی دستگاہ حاصل تھی، مرد تو مرد عورتیں تک منطق، طب، نحو، ہندسہ، جبر و مقابلہ، مبادی علم الطبیعی، کیمیا، تاریخ طبیعی وغیرہ ان فنون میں کمال رکھتی تھیں۔ ان کے کتب خانے قدیم علمائے یونان اور فلاسفۂ اسکندریہ کی کتابوں کے منقول نسخوں سے پر تھے۔ دسویں صدی کے آخر میں روم کے پاپا گوبرٹ نے ان کتب خانوں سے فائدہ اٹھا کر ایسے عجیب و غریب علوم و معارف اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش کئے کہ وہ دنگ رہ گئے اور انھوں نے پاپا کو جادوگری کی تہمت لگائی۔

علوم و فنون کے علاوہ صنعت و حرفت اور دستکاری میں بھی عربوں کا یہی حال تھا۔ انھوں نے رومیوں اور فنیقیوں کے اصول و فنون سے واقفیت حاصل کی۔ اور ان کے ذریعہ معادن کا پتہ چلایا اور بعض نئے معادن مثلاً پارہ کے اور یاقوت کے معادن کا سراغ نکالا۔ اندلس کے سواحل کے قریب مرجان اور طراغونہ کے قریب موتی نکالے۔ علاوہ بریں دباغت، روئی اور کتان کے بننے کی صنعت میں کمال پیدا کیا۔ ریشمی اور سوتی کپڑوں کے تیار کرنے کی دستکاری میں مہارت حاصل کی۔ مشرق اور افریقہ کے ساحلی مقامات کے لوگ یہی جانتے ہیں کہ تیر کے پھل یعنی سوفار بہترین قسم کے طلیطلہ میں تیار ہوتے ہیں۔ ریشم غرناطہ کا مشہور ہے۔ زینیں اور پوستین وغیرہ کا بہترین کام قرطبہ میں ہوتا ہے، یہ عرب اپنے مصنوعات مختلف مشرقی ممالک کے سوداگروں کو بھیجتے تھے اور ان کے بدلہ میں وہ عود، لونگ کافور، خراسانی سمور اور ایرانی قالین اور فرش و فروش لیتے تھے۔

بلنیشہ اور غرناطہ کی بنجر اور نشیبی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے عربوں نے ایک عجیب جدت سے

کام لیا۔ انھوں نے دو ہائے طونہ جو والنسہ کے قریب سمندر میں گرتا ہے۔ اس کے پانی کو سمندر سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک پشتہ باندھ کر روک دیا اور اس پانی سے سات نہریں کاٹ کر نکالیں، ان میں سے ہر نہر ہفتہ میں صرف ایک دن کھولی جاتی تھی تاکہ ضروری سطح تک اس کا پانی بلند ہو سکے۔ پھر ان سات نہروں میں سے ہر ایک نہر کو مختلف قسم کی چھوٹی چھوٹی شاخوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر شاخ کو اس وقت کھولا جاتا تھا جب پانی سطح ضروری و مناسب تک بلند ہو جاتا تھا۔ ان شاخوں کے ذریعہ پانی چھوٹے سے چھوٹے مربع قطعۂ زمین تک پہنچتا تھا۔ ہر نہر کی صورت مع اس کی شاخوں کے ایک پنکھے کے مانند تھی۔ ان نہروں اور ان کی شاخوں کے علاوہ مختلف قسم کے پانی کے حوض اور تالاب بھی بنائے گئے تھے جن سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ آبپاشی کی اس ترکیب و تدبیر سے عربوں نے ان بنجر اور بے کار افتادہ زمینوں کو درحقیقت اسپین کا گلزار بنا دیا۔

عربوں نے اسپین میں زراعت کے علمی طریقوں کو رواج دیکر اسے ایک مستقل فن بنا دیا۔ اور اسے اس حد تک ترقی دی کہ سال بھر میں ایک دن کے لئے بھی زمین خالی نہیں رہتی تھی۔ ایک فصل کاٹنے کے بعد وہ فوراً تخم پاشی کر دیتے تھے۔ اور اس طرح سال بھر میں وہ تین فصلیں کاٹتے تھے چاول۔ نیشکر۔ زعفران۔ کھجور۔ پستہ۔ کیلا۔ شفتالو۔ شہتوت۔ انار۔ آڑو۔ روئی اور قسم قسم کے پھول، پھلیاں اور ترکاریاں یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی خوش ذوق کوششوں نے اندلس کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیں اور پھر یہیں سے یہ تمام چیزیں یورپ گئیں "۔

علاوہ بریں اندلس کی شہری اور تمدنی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے مورخ سدیو لکھتا ہے۔

" اسپین کے جس حصہ پر مسلمان حکمراں تھے وہ چھ صوبوں، اسّی بڑے بڑے شہروں اور تین سو نسبتہً چھوٹے شہروں اور بیشمار قریوں، دیہاتوں اور گاؤں پر مشتمل تھا، صرف ایک قرطبہ میں دو لاکھ گھر، چھ سو مسجدیں، پچاس شفاخانے۔ اسّی پبلک کالج۔ نو سو حمام تھے۔ اور اس کی آبادی دس لاکھ تھی۔ خلفار کی آمدنی علاوہ اس پانچویں حصہ کے جو ان کو مالِ غنیمت سے یا یہودیوں اور عیسائیوں کے جزیہ سے ملتی تھی۔ ہمارے اندازہ کے مطابق ایک کروڑ بیس لاکھ پینتالیس ہزار دینار سالانہ تھی

اس سے عام ملک کی مرفہ الحالی اور تمول کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اندلس میں عربوں نے ایسی شاندار عمارتیں بنائیں جو دنیا میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں صرف ایک مسجد قرطبہ کو ہی لیجئے، جو اب تک باقی ہے اور اپنی عظمت کے لحاظ سے دمشق کی جامع اموی سے ہمسری کا دعویٰ کر رہی ہے اس مسجد کا طول ۶۰۰ اور عرض دو سو پچاس قدم تھا۔ اس کے دائیں جانب کے عرض میں ۳۸۔ اور بائیں جانب میں ۲۹ صحن تھے۔ ایکہزار ترانوے سنگِ مرمر کے ستون تھے۔ جنوب کی جانب ۱۹ دروازے تھے جو تانبہ کی چادروں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ درمیانی عمارت پر سونے کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں، اور اس کی چوٹی پر تین زریں گنبدیں تھیں۔ جن کے اوپر ہیرے کا ایک انار تھا۔ اس مسجد میں چار ہزار سات سو قندیلیں روشن ہوتی تھیں۔ جن میں سے ایک قندیل جو محراب میں جلتی تھی خالص سونے کی تھی۔ اس پر ہر سال چونتیس ہزار رطل زیتون اور ایک سو بیس رطل عنبر اور عود صرف ہوتا تھا۔"

مسجدِ قرطبہ کے علاوہ خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث نے قرطبہ سے چند میل کے فاصلہ پر اپنی محبوبہ عیسائی بیوی زہرہ کے لئے جو عالیشان محل بنوایا تھا وہ بھی اپنی خاص صنعت، کاریگری اور فنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک نادر روزگار عمارت تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس محل کے گنبد چار ہزار تین سو ستونوں پر قائم تھے۔ یہ ستون سنگِ مرمر کے مختلف اقسام وانواع سے بنے ہوئے تھے۔ اور ان پر طرح طرح کی گلکاری کی گئی تھی۔ ان ستونوں میں سے بعض ستون فرانس اور قسطنطنیہ کے بادشاہوں نے عبدالرحمٰن کو تحفۃً بھیجے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو مختلف انجنیروں کو افریقہ بھیجکر منگوائے گئے تھے۔ ستونوں کی طرح دیواریں اور چھتیں بھی نوع بنوع بیش قیمت پتھروں مثلاً عقیق یشب، یاقوت اور لاجورد وغیرہ سے مزین تھیں۔ چھتوں میں ان پتھروں کے علاوہ سونا بھی لگا ہوا تھا۔ محل کی وسعت کا اندازہ اسی ایک بات سے ہوسکتا ہے کہ اس کو بجائے "قصر الزہرہ" کے عام طور پر "مدینۃ الزہرہ" بھی کہا جاتا تھا۔ محل کی وسیع وفراخ عمارتوں میں جا بجا صاف وشفاف اور شیریں پانی کے حوض اور فوارے بنے ہوئے تھے۔ ایک سب سے بڑا فوارہ جو سونے کا معلوم ہوتا تھا اور جس پر نہایت خوشنما نقش ونگار تھے قسطنطنیہ سے اور ایک فوارہ سنگِ سبز کا شام سے منگوایا

گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ سنگِ سبز کے فوارہ میں ایک درجن چرند و پرند جانوروں کی صورتیں لگائی گئی تھیں جو مختلف قسم کے جواہرات اور سونے سے بنی تھیں ان میں سے ہر جانور کے منہ سے پانی کا فوارہ نکلتا تھا۔ اس محل کا ایک حصہ جو قصر الخلفار کہلاتا تھا اس کی چھت خالص سونے کی تھی اور دیواریں ایسی صاف شفاف سنگِ مرمر سے بنی ہوئی تھیں کہ ایک طرف کی چیز دوسری طرف نظر آتی تھی۔ قصر کے درمیان میں ایک خوبصورت مرصع فوارہ تھا جس کے اوپر ایک موتی جڑا ہوا تھا۔ یہ موتی شہنشاہِ یونان نے بطورِ تحفہ عبدالرحمٰن کی خدمت میں بھیجا تھا۔ علاوہ بریں ایک فوارہ نما طشت پارہ سے لبریز رکھا تھا۔ قصر کے اردگرد نہایت خوشنما آیئنے ہاتھی دانت کے چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لگائے گئے تھے۔ مختلف قسم کے لکڑیوں کے مرصع دروازے سنگِ مرمر اور بلوری چوکھٹوں پر نصب تھے۔ جس وقت یہ دروازے کھول دیئے جاتے اور آفتاب کی شعاع سے مکان روشن و منور ہوتا تو کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اس کی چھت اور دیواروں کی طرف نظر بھر کر دیکھ سکے۔ اس حالت میں اگر پارہ ہلا دیا جاتا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام مکان جنبش میں ہے جو لوگ اس بھید سے آگاہ نہ تھے انھیں اس وقت بڑا ڈر لگتا تھا۔

قصر الزہرہ کے انتظام اور نگرانی کے لئے تیرہ ہزار سات سو پچاس ملازم، تیرہ ہزار تین سو بیاسی غلام مقرر تھے۔ حرم سرا میں چھ ہزار عورتیں خدمت گذاری کے لئے حاضر رہتی تھیں حوضوں میں روزانہ بارہ ہزار روٹیاں علاوہ اور چیزوں کے مچھلیوں کی خوراک کے لئے ڈالی جاتی تھیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ قصر ہمارے زمانہ کے موجودہ رائج الوقت سکہ کے اعتبار سے بیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ کی لاگت میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اس کا طول چار میل اور عرض تقریباً تین میل تھا۔ ۳۲۵ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور بیس سال میں تکمیل کو پہنچی۔ [۱]

---

[۱] قصر الزہرہ کے متعلق مندرجہ بالا بیان کا بڑا حصہ عہدِ حاضر کے مشہور مورخ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے اس مقالہ سے ماخوذ ہے جو موصوف نے اپنے ماہوار رسالہ عبرت ج ۵ نمبر ۲ میں لکھا تھا۔

اندلس میں اسلامی حکومت کے مختلف دور

جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے، مسلمانوں نے اندلس کو خلیفۂ اموی سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں سنہ ۹۲ھ میں فتح کیا۔ اس وقت سے لیکر سنہ ۱۳۲ھ میں بنو امیہ کی خلافت کے اختتام تک اس کا تعلق برابر اموی دارالخلافت دمشق سے رہا اور یہاں کے حاکم وہیں سے مقرر ہو کر آتے رہے۔ اموی خلافت کے ختم پر بنو عباس کے خلیفۂ اول سفاح کے عہد میں بھی اس کا تعلق خلافت سے رہا۔ لیکن سفاح کے بعد منصور تختِ خلافت پر بیٹھا اور اس نے بنی امیہ کو جڑ بنیاد سے فنا کر دینے کے لئے انھیں بے تحاشا قتل کرنا شروع کر دیا تو خوش قسمتی سے عبدالملک بن مروان کے خاندان کا ایک فرد عبدالرحمٰن منصور کے عام دار و گیر سے بچکر نکل بھاگا اور عراق و شام و مصر و مراکش ہوتا ہوا اندلس پہنچا۔ یہاں کے بنو مروان نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور سنہ ۱۳۸ھ میں اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یوسف بن عبدالرحمٰن جو اندلس کا حاکم تھا وہ جنگ کے لئے نکلا لیکن عبدالرحمٰن کو فتح ہوئی اور سنہ ۱۴۱ھ میں اندلس کا باقاعدہ حاکم ہو گیا۔ عبدالرحمٰن نے تختِ خلافت پر مستقل ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ خطبہ سے خلیفۂ عباسی کا نام اڑا دیا۔ لیکن ساتھ ہی عقلمندی یہ کی کہ امیر المومنین کا لقب اپنے لئے بھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے بعد اس کے سات جانشین بھی اسی روش پر چلتے رہے۔ البتہ اٹھویں جانشین عبدالرحمٰن الناصر نے (جس کی مدتِ حکومت سنہ ۳۰۰ھ سے سنہ ۳۵۰ھ تک ہے) اپنے آپ کو امیر المومنین کہلوایا۔

سنہ ۱۴۶ھ میں علاء بن مغیث ابو جعفر منصور کی طرف سے داعیِ خلافت ہو کر افریقہ سے اندلس کی طرف بڑھا۔ ادھر عبدالرحمٰن مقابلہ کے لئے نکلا۔ اشبیلیہ کے اطراف و نواحی میں میدانِ جنگ گرم ہوا۔ چند روز کی جنگ کے بعد علاء بن مغیث کو شکستِ فاش ہوئی اور اپنی فوجِ گراں کے اکثر لوگوں کے ساتھ مارا گیا۔ عبدالرحمٰن نے ستم ظریفی یہ کی کہ اکثر مقتولین کے سر کاٹ کر قیروان اور مکہ بھجوا دیئے جہاں ان کو ان دونوں شہروں کے بازاروں میں رات کے وقت چپکے سے چھپا کر رکھ دیا گیا۔ ان سروں کے ساتھ سیاہ جھنڈا جو بنو عباس کا شعار تھا اور ایک پروانہ جو منصور نے

علار کو لکھکر دیا تھا یہ دونوں چیزیں بھی تھیں؛ منصور کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس پر دہشت طاری ہوگئی اور بولا "عبدالرحمٰن تو شیطان ہی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اور اس کے درمیان سمندر حائل کر دیا ہے۔" سلہ

عبدالرحمٰن الناصر کے عہد میں اسپین نے تہذیب و تمدن اور حضارت و ثقافت میں بہت ترقی کی۔ یہ نہایت بیدار مغز، عقلمند اور بہادر تھا۔ یہ تختِ خلافت پر بیٹھا تو اس وقت تمام ملک شر و فساد اور عصیان و بغاوت کے شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی باغیوں کی سرکوبی کی۔ مفسد اور فتنہ پرداز لوگوں کا قلع قمع کر کے ملک میں امن و امان بحال کیا۔ علامہ ابنِ خلدون کا بیان ہے۔

ووجد الاندلس مضطربة	عبدالرحمٰن الناصر نے اندلس کو دیکھا کہ مخالفوں کی وجہ
بالمخالفین مضطرمة بنیران	سے اس کے حالات مضطرب ہیں، غاصبین کی بھڑکائی
المتغلبین فاطفا تلك النیران و	ہوئی آگ میں جل رہا ہے تو اس نے اس آگ کو بجھایا اور
استنزل اهل العصیان فی استقامة	سرکش و نافرمان لوگوں کو رام کیا۔ اس کی حکومت
له الاندلس فی سائر جهاتها	کے کچھ کم بیس سال کی مدت میں اندلس تمام کا
بعد نیف وعشرین سنة من	تمام اس کا اپنا ہوگیا۔ اور اس کے حالات ٹھیک
ایامه سلہ	ہوگئے۔

ابنِ خلدون اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"عبدالرحمٰن الناصر نے تقریباً پچاس سال تک حکومت کی اور بنو امیہ کا اقتدار اس ملک میں پھر مستحکم ہوگیا۔ یہ بنفسِ نفیس جہاد کرنے کا بڑا شوقین تھا اور دارالحرب کی طرف پیش قدمی کر کر کے جنگ کرتا تھا۔ حکومت کے تیئسویں سال ایک جنگ میں شکست کھانے کے بعد سے خود جنگ میں شریک ہونا ترک کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی ٹولیاں یہ برابر بھیجتا رہتا

سلہ نفح الطیب ج ۱ ص ۱۶۵۔

تھا جو ہر سال بلادِ افرنگ میں حملے کرتی اور انھیں پامال کرتی تھیں۔ اب عیسائیوں نے اس کی طرف اطاعت و فرمانبرداری کا ہاتھ بڑھایا اور روم اور قسطنطنیہ سے اس کے پاس قسم قسم کے ہدایا آنے لگے۔ علاوہ بریں قشتالہ اور نبلونہ کے عیسائی فرمانروا بھی دربار میں آتے تھے اور خراج عقیدت وارادت پیش کرتے تھے۔ ان فتوحات کے علاوہ رعایا میں امن وسلامتی پیدا کرنے کے لئے اس نے تخت نشینی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ ٹیکسوں میں کمی کردی۔ انھیں اوصاف وخصائص کی بنا پر ابن عبدربہ نے اس کی مدح کرتے ہوئے کہا تھا۔

بدا الھلال جدیداً والملك غضّ جدیدٌ

(ترجمہ) چاند از سر نو نکلا ہے ملک از سر نو تر و تازہ ہوگیا ہے

عبدالرحمٰن الناصر نے ۳۵۰ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوگیا اور اطراف واکناف میں مختلف حکومتیں قائم ہوگئیں۔ چنانچہ اشبیلیہ میں ابنِ عباد نے اور ابن الافطس اور ابن ذی النون نے طلیطلہ میں اور ابن ابی عامر نے بلنسیہ میں اور ابنِ ہود نے سرقسطہ میں اپنی مستقل حکومتیں قائم کرلیں۔ یہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر کا ذکر ہے۔ اسی اثنار میں عبدالرحمٰن الناصر کا پوتا سلیمان ۲۰ شوال ۳۹۹ھ کو تخت نشین ہوا اور اپنا لقب "المستعین باللہ" رکھا۔ ۴۰۰ھ میں قرطبہ میں داخل ہوا اور اس لقب پر "الظافر بحول اللہ" کا اور اضافہ کرلیا۔ اسی سال کے اواخر میں قرطبہ سے روانہ ہوا اور بربریوں کو اپنے ساتھ لیکر تمام اندلس میں شر و فساد، لوٹ مار، اور قتل وغارتگری کا بازار گرم کردیا۔ ۴۰۳ھ میں وہ پھر قرطبہ میں داخل ہوا۔ اب بربری غلام سلیمان سے الگ ہوگئے اور بڑے بڑے شہروں پر قابض ہوکر قلعہ نشین ہو بیٹھے۔

سلیمان کی فوج میں امام حسنؓ کی اولاد میں سے دو بھائی تھے ایک کا نام قاسم تھا اور دوسرے کا علی۔ ان کے والد ماجد کا نام حمود تھا۔ اس علی بن حمود نے طوائف الملوکی کا یہ عالم دیکھا تو اس کو خود اندلس کی سلطنت کی طمع پیدا ہوئی۔ اس بنا پر علی بن حمود نے ان تمام لوگوں کو جو اپنی اپنی حکومتیں قائم کر بیٹھے اور قلعہ نشین ہوگئے تھے لکھا کہ "ہشام بن الحکم نے محاصرۂ قرطبہ کے دوران

میں مجھکو تحریراً اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تھا" سب نے اس کو منظور کیا اور ان سے بیعت کرلی۔ اب علی بن حمود اپنے بربری ہمراہیوں اور غلاموں کو لیکر قرطبہ کی طرف بڑھے۔ سلیمان نے مقابلہ کیا لیکن اسی شکستِ فاش ہوئی۔ آخر کار بروز یکشنبہ ۲۱ محرم الحرام ۴۰۷ھ کو علی بن حمود نے خود اپنے ہاتھ سے بڑی بے دردی کے ساتھ سلیمان کی گردن اڑادی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں کیا۔ بلکہ سلیمان کے بوڑھے اور ضعیف باپ الحکم کو بھی اسی دن قتل کر دیا۔

آخر کار جس طرح اس زمانہ میں خلافتِ بغداد ترک غلاموں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی کہ وہ جس کو چاہتے تھے تختِ خلافت پر بٹھا دیتے تھے اور جب اس سے ناراض ہو جاتے تھے تو کسی ترکیب سے خود ہی اس کا کام تمام کر دیتے تھے۔ اسی طرح اندلس میں بربری غلام بڑے مطلق العنان تھے۔ آپس کی خانہ جنگیوں نے ملک کا تمام شیرازۂ امن و امان منتشر اور پراگندہ کر رکھا تھا۔ حکومت کا رعب داب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس بنا پر علی بن حمود کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا جو اس نے سلیمان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ علی بن حمود نے دو مہینہ کم دو سال تک حکومت کی۔ اور اپنے لئے "الناصر" کا لقب تجویز کیا۔ لیکن اس قلیل مدت میں ہی اس کی سخت گیری اور درشت مزاجی کے باعث اس کے غلام بددل ہو گئے اور ۴۰۸ھ میں ایک حمام میں اس کی گردن اڑادی۔ علی نے اولادِ نرینہ میں سے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑے، ایک کا نام یحییٰ تھا اور دوسرا ادریس۔

قاسم بن حمود

علی کے بعد اس کا بھائی قاسم بن حمود تخت نشین ہوا۔ یہ طبیعت کے اعتبار سے رحمدل اور رعایا پرور تھا۔ اس لئے لوگ اس کی حکومت سے خوش تھے۔ لیکن چار سال کے بعد ۴۱۲ھ میں قاسم کے بھتیجے یحییٰ بن علی بن حمود نے مالقہ میں چچا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا جس کے باعث چچا کو قرطبہ سے بھاگ کر اشبیلیہ جانا پڑا۔ یحییٰ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جنگ و قتال کے بغیر قرطبہ میں داخل ہو گیا۔ اپنے آپ کو خلیفہ کہلایا اور المعتلی لقب رکھا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب قاسم کی حالت درست ہو گئی تو اس نے اہل بربر کی

مدد سے پھر قرطبہ پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ اب یحییٰ مالقہ کی طرف بھاگ گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے جزیرۂ خضرا پر قبضہ کر لیا جو ایک اہم مقام تھا اور جہاں قاسم کے متعلقین اور اس کے ذخائر رہتے تھے۔ دوسری طرف یحییٰ کے بھائی ادریس بن علی نے جو سبتہ کا گورنر تھا طنجہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس پر مزید یہ ہوا کہ اہلِ قرطبہ میں سے ایک جماعت بھی قاسم کے خلاف ہو گئی۔ اب قاسم نے اشبیلیہ کا رخ کیا جہاں اس کے دو بیٹے محمد اور حسن تھے۔ اشبیلیہ والوں کو اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے محمد اور حسن اور ان کے ساتھیوں کو شہر سے نکال دیا اور شہر پر قبضہ کر کے اس کا انتظام و انصرام تین آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ قاسم نے یہ صورتِ حال دیکھی تو شریش چلے گئے۔ بربریوں نے اب متفقہ طور پر یحییٰ بن علی کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ اور قاسم پر حملہ کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ شریش پہنچکر قاسم کا محاصرہ کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاسم گرفتار ہو گئے پہلے یحییٰ کی قید میں رہے۔ پھر کچھ دنوں ادریس کے ہاں بھی مقید رہے اور آخر کار اسی حالت میں ۴۳۱ھ میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ بعد میں نعش اس کے بیٹے محمد بن قاسم کے پاس بھجا دی گئی۔ قاسم کی حکومت کی مدت کل چھ برس ہے اور مدتِ امارت سولہ سال۔

قاسم کو گرفتار کرنے کے بعد یحییٰ کے لئے میدان صاف ہو گیا تھا۔ لیکن ملک میں جو عام طوائف الملوکی پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ سے اس کو بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ وہ اپنی فوج کو لئے ہوئے مارا مارا پھرتا رہا۔ اسی اثنار میں ایک دن جب کہ وہ اشبیلیہ کا محاصرہ کئے پڑا تھا، نشہ کی حالت میں چند سواروں کے مقابلہ کے لئے نکلا، ان لوگوں نے وہاں کمین گاہ بنا رکھی تھی، یحییٰ وہاں پہنچا تو اس کو پکڑ کر قتل کر ڈالا یہ واقعہ ۷ محرم ۴۲۷ھ کو پیش آیا۔

۱۳۸ھ سے ۴۰۰ھ تک یعنی تقریباً پونے تین سو سال خاندانِ بنو امیہ اندلس میں فرمانروائی کرتا رہا۔ لیکن جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے اس کے بعد ملک میں افراتفری پیدا ہو گئی ۔ بنو امیہ کے مقابلہ میں حسنی خاندان۔ جس کے افراد قاسم اور علی تھے ان کا حریف اور مقابل پیدا ہو گیا اور دونوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ یحییٰ کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے اور بھی دو تین

بادشاہ ہوئے۔ یہاں تک کہ ۴۲۵ھ میں آخری حسنی بادشاہ ادریس کا جب انتقال ہوگیا تو یہ خاندان بالکل کمزور ہوگیا۔ اور اب مالقہ جو اُن کا دارالحکومت رہا تھا وہاں کے لوگوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ حسینوں کو اندلس سے خارج کر کے سرحد کی طرف بھیجدیا جائے اور جو مقامات اُن کے قبضہ میں ہیں ان سے چھین کر اپنے حسب منشار حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جزیرۂ خضرا اور اس کے گردونواح کے قریہ جات سے لیکر تاکرونہ، مالقہ اور ان کے مضافات تک اور ادہر قلعۂ منکب، غرناطہ اور اس کے اعمال یہ سب بربریوں کے قبضہ میں تھے، ان کے علاوہ وہ اشبیلیہ کے بعض حصوں پر پہلے سے قابض تھے۔ یہ علاقے بھی انھیں کے قبضہ میں رہے اور اس طرح اندلس سے حسنی خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ سلہ

اندلس میں بنوامیہ کے آخری سانس

قرطبہ میں جب قاسم کو شکست ہوئی تھی تو اس وقت اہل قرطبہ نے ایک شخص عبدالرحمٰن بن ہشام کو جس کا لقب المستظہر باللہ تھا اور جو بنوامیہ میں سے تھا اپنا حاکم منتخب کرلیا تھا لیکن ابھی اس کی حکومت کو مشکل سے چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ اس کے خلاف بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی اور ۲۷ ماہ ذی القعدہ ۴۱۴ھ کو اسے قتل کردیا گیا۔

اس کے بعد محمد بن عبدالرحمٰن جس کا لقب المستکفی تھا تخت نشین ہوا، لیکن یہ نہایت بیوقوف اور کمزور تھا اس نے احمد بن خالد نامی ایک جولاہے کو اپنا وزیر بنا رکھا تھا ملک اور سلطنت کے اہم معاملات میں اسی سے مشورہ کرتا تھا۔ آخر کار ایک دن قرطبہ کے عوام وزیر کے مکان میں گھس گئے اور اسے اس بری طرح مارا کہ وہیں ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔ وزیر کو قتل کرنے کے ساتھ ہی ان لوگوں نے المستکفی سے خلع کرالیا اور تین دن اس کو اس طرح قید رکھا کہ اس کے پاس نہ پانی پہنچ سکتا تھا اور نہ کھانا۔ پھر اس کو قرطبہ سے خارج کردیا۔ وہ سرحد کی طرف چلا گیا اور آخر کار اپنے ایک ساتھی کے ہاتھوں زہر کھا کر مر گیا۔

مستکفی کے بعد یحیٰی بن علی یہاں کا حاکم ہوگیا تھا لیکن جب اس کی حکومت بھی

سلہ خلافت موحدین ص ۶۵، ۶۶۔

ختم ہوگئی تو وزیر ابو محمد جمہور بن محمد بن جمہور نے جو قرطبہ کا ایک نامور سردار تھا ہشام بن محمد سے بیعت کرلی، اس نے اپنا لقب معتمد رکھا تھا۔ یہ بیعت ماہ ربیع الاول ۴۱۸ھ کو ہوئی تھی۔ بیعت کے بعد بھی ہشام تین سال تک سرحدی علاقوں میں پھرتا رہا۔ کہیں ایک جگہ اطمینان سے ٹھہرنا نصیب نہیں ہوا۔ ادہر ملک میں طوائف الملوکی عام تھی ہی۔ رؤسا متغلبین ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ اس بنا پر ابنِ جہور کی رائے ہوئی کہ ہشام بن محمد کو قرطبہ آنا چاہیے۔ چنانچہ ۴۲۰ھ کے ماہ ذوالحجہ میں ہشام قرطبہ میں داخل ہوگیا۔ لیکن یہاں قیام کئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ افواج نے بغاوت کردی اور ہشام کو تخت چھوڑنا پڑا۔ اب ہشام لاردہ چلا گیا اور وہیں ۴۲۸ھ میں انتقال کیا۔ ہشام اندلس کے فرمانروا خاندانِ بنی امیہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ اب مشرق کے ساتھ مغرب سے بھی اس خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔

بنوامیہ کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد تمام ملک کی حالت یہ ہوگئی کہ اہلِ ملک عرب، بربر، اور موالی سب الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے اور جس کو جو علاقہ ملا اس پر قبضہ کر بیٹھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان سب نے خلافت کے القاب بھی آپس میں تقسیم کرلئے تھے چنانچہ کسی کا نام معتضد تھا اور کوئی مامون کہلاتا تھا۔ مستعین، مقتدر، معتصم، معتمد، متوکل اور متوقف وغیرہ اسی نوع کے القابِ خلافت تھے۔ ایک شاعر نے اس چھچھورہ پن کا مذاق اس طرح اڑایا ہے۔

مما یزھدنی فی ارضِ اندلس	سماعُ مقتدرٍ فیھا ومعتضدِ
القابُ مملکۃٍ فی غیرِ موضعھا	کالھر یحکی انتفاخاً سورۃ الاسدِ

ترجمہ۔ سرزمینِ اندلس سے میری نفرت اور اس کے ترک کا باعث جو چیز ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ میں وہاں معتدر اور معتضد وغیرہ القاب سنتا ہوں، یہ القاب بالکل بے محل ہیں اور ایسے ہی ہیں کہ جیسے بلی پھول کر شیر کی نقل اتارنے لگے۔

اس افراتفری سے مسلمانوں کی ہمسایہ عیسائی سلطنتوں نے خوب فائدہ اٹھایا وہ ایک مسلمان حاکم کی مدد کرکے اس کے حریف کو کمزور کردیتی تھیں اور پھر جب موقع ملتا تھا تو

خود اس شخص کے علاقہ پر قبضہ کرلیتی تھیں جس کی انھوں نے پہلے مدد کی تھی۔ مسلمان آپس کی خانہ جنگیوں میں اس درجہ اندھے ہوگئے تھے کہ دوست دشمن اور اپنے پرائے کی تمیز بالکل اٹھ گئی تھی اور ایک مسلمان کے مقابلہ میں اسلام کے پرانے دشمنوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہنے سے بھی انھیں عار نہیں آتی تھی۔

اس زمانہ میں مسلمان حکمرانوں کا دماغی تنزل کس حد تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ اس عہد کا سب سے بڑا فرمانروائے اندلس معتمد بن عباد تھا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی نے جس کا لقب اعتماد تھا۔ اشبیلیہ میں چند دیہقانی عورتوں کو دیکھا کہ وہ کیچڑ میں کھڑی ہوئی ہیں، پنڈلیاں کھول رکھی ہیں اور مشک میں دودھ فروخت کر رہی ہیں۔ بیگم کو یہ منظر کچھ اس قدر پسند آیا کہ اس نے بادشاہ سے کہا "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اور میری کنیزیں بھی ایسا ہی کریں" بادشاہ نے کہا یہ کونسی بڑی بات ہے فوراً حکم دیا اور قصرِ شاہی میں عنبر، مشک اور کافور کو عرقِ گلاب میں گوندھ کر کیچڑ بنائی گئی اور بیگم اپنی لونڈیوں کے ساتھ اس میں کھڑی ہوگئیں۔ دیہاتی عورتوں کی طرح ان سب کے ہاتھوں میں بھی مشکیں تھیں، لیکن فرق یہ تھا کہ ان مشکوں کی ڈوریاں ریشم سے بٹی ہوئی تھیں۔ [۱]

مرابطین سنہ ۴۲۸ھ سے ۴۸۵ھ تک یعنی کل ستاون برس کی قلیل مدت میں اندلس کے غربی اور شرقی علاقوں میں جو خاندان حکمراں رہے ان کے نام یہ ہیں، بنو جہور، بنو عباد، بنو رزین، بنو الضری، بنو ذی النون، بنو حمود، بنو افطس۔ آخر کار یہاں ایک اور خاندان کو جو عام طور پر مرابطین کے نام سے معروف ہے اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہوا اور ملک سے طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ خاندان مراکش (افریقیہ) کا رہنے والا تھا اور سنہ ۴۴۸ھ سے وہاں حکمرانی کر رہا تھا۔ اس خاندان کا سب سے پہلا بادشاہ جو اندلس کا مختار کل فرمانروا ہوا وہ یوسف بن تاشفین ہے۔ یہ بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ تمام افریقہ اس کے زیرِ نگیں تھا اور اس زمانہ کی بڑی بڑی

---

[۱] نفح الطیب جلد اول ص ۲۰۵۔

طاقتیں اس کا لوہا مانتی تھیں۔

یوسف بن تاشفین اور جنگِ زلاقہ

اندلس میں یوسف بن تاشفین کے آنے کی تقریب یہ ہوئی کہ معتمد ابن عباد جو اس طوائف الملوکی کے عہد میں اشبیلیہ کا بادشاہ تھا وہ ۴۷۹ھ میں سمندر پار کر کے یوسف بن تاشفین کے پاس مراکش پہنچا اور اہلِ فرنگ کے برخلاف اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اپنی مدد کی درخواست پیش کی۔ یوسف نے معتمد کے ساتھ بڑے اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا اور اہلِ فرنگ کے مقابلہ میں اس کی اعانت کرنے کا پختہ وعدہ کرلیا۔ چنانچہ اسی سال کے ماہِ جمادی الاولیٰ میں ایک لشکرِ جرار جمع کیا جس میں سات ہزار سوار اور کثیر تعداد میں پیدل سپاہی شامل تھے اور ان کو ہمراہ لیکر شہر سبتہ کے راستہ سے سمندر کو عبور کر کے اندلس کے مشہور شہر جزیرۂ خضرا میں فروکش ہوا۔ المعتمد اسی جگہ یوسف سے آکر ملا اور بڑے بڑے بیش قیمت تحف وہدایا نذر کے طور پر پیش کئے۔ پھر المعتمد نے کہا کہ "آپ میرے ساتھ اشبیلیہ چلئے تاکہ کچھ روز آرام کرنے اور سفر کی تکان دور کرنے کے بعد دشمنانِ اسلام کا مقابلہ تازہ دم ہو کر کر سکیں، لیکن یوسف نے انکار کیا اور کہا کہ "میں یہاں دشمن سے جہاد کرنے آیا ہوں جہاں کہیں دشمن ہوگا وہیں جاؤں گا"۔

ان دنوں الفانسو ششم جو قسطیلہ (کیسٹل) کا بادشاہ تھا مسلمانوں کے ایک قلعہ "حصن اللبیط" کا محاصرہ کئے پڑا تھا اس نے جب سنا کہ اہلِ بربر سمندر پار کر آئے ہیں تو وہ محاصرہ اٹھا کر اپنے بلاد کی طرف اس ارادہ سے لوٹا کہ ایک بڑی فوج جمع کر کے ان سے جنگ کرے گا۔ چنانچہ ایک طرف الفانسو نے اپنے باجگزاروں کو حکم بھیجا کہ ہر شخص جس قدر آدمی بہم پہنچا سکتا ہے وہ فوراً انھیں لیکر میدان میں پہنچ جائے۔ علاوہ بریں عیسائی پیشواؤں اور مبلغین نے اپنے ملک میں دیہات در دیہات کا دورہ کر کے اہلِ فرنگ کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی آگ بھڑکا دی۔ اور دوسری جانب معتمد اور یوسف کی مدد کے لئے تمام اقطار اندلس سے اسلامی فوجیں جمع ہونی شروع ہوگئیں۔

زلاقہ کے میدان میں جو اہلِ روم کی سرحد سے ملا ہوا تھا۔ یہ دونوں لشکر ۱۲ رمضان المبارک کو جمعرات کے دن ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئے۔ اب الفانسو نے مسلمانوں کو یہ پیغام بھیجا کہ جمعہ کا دن تمہارے نزدیک متبرک دن ہے اور اسی طرح ہفتہ اور اتوار یہودیوں اور عیسائیوں کے بابرکت دن ہیں اس بنا پر جنگ ان ایام کے بجائے دوشنبہ کو شروع کی جائے۔ الفانسو کا مقصد دراصل مسلمانوں کو دھوکا دینا تھا۔ چنانچہ معتمد نے اسے محسوس بھی کر لیا۔ لیکن یوسف بن تاشفین نے فرطِ خود اعتمادی کے باعث الفانسو کی یہ تجویز منظور کر لی۔ چنانچہ اگلے دن جبکہ یوسف بن تاشفین اپنی فوج کے ساتھ نمازِ جمعہ میں مصروف تھا۔ الفانسو کی فوج نے یکایک بے خبری میں دھاوا بول دیا۔ معتمد نے از راہِ دور اندیشی اس کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا، اب المرابطون بھی اسلحہ پوش اپنے گھوڑوں پر بیٹھکر میدانِ جنگ میں آ گئے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کی فوجوں میں سپاہیوں کی تعداد اور اسلحہ و ساز و سامان جنگ کے اعتبار سے اس وقت کتنا بڑا فرق تھا اس کو خود مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ کی زبان سے سنئے جس نے اپنی عادت کے مطابق اس موقع پر بھی مسلمانوں کی عموماً اور یوسف بن تاشفین اور بربریوں کی خصوصاً نہایت بھیانک تصویر پیش کی ہے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ امر کچھ بے وجہ نہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام فوج میں ایک فکر و اندیشہ پھیلا ہوا تھا اسی لڑائی کے نتیجہ پر ان کے جان و مال اور آزادی و مذہب کا انحصار تھا۔ امیدیں بہت ہی بری تھیں۔ دشمن کی فوج کو مسلمانوں پر از روئے تعداد و نظام و انتظام تفوق حاصل تھا۔ عیسائیوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی اور مسلمانوں کی کل بیس ہزار۔ یعنی تین عیسائیوں کے مقابلہ میں ایک مسلمان۔ اہالی قستالہ (عیسائیوں) کے گھوڑے مسلمانوں کے گھوڑوں سے زیادہ قوی تھے۔ ان کے ہتھیار زیادہ اچھے تھے زیادہ بوجھل تھے اور خوب صیقل شدہ تھے۔ انھیں فرانس کے امرا زیادہ ممتاز تھے جو سر تا پا فولاد میں غرق تھے ہر عیسائی سپاہی بہت سی لڑائیاں لڑ چکا تھا ان میں سے ہر شخص نہایت پرجوش تھا۔

پادری ہر روز ان کے جوش کو مشتعل کرتے رہتے تھے۔ ان کے فوج میں رہنے کا یہ نتیجہ تھا کہ اس جنگ نے صلیبی لڑائی کی سی تقدیس حاصل کرلی تھی۔ جنگ کے شروع ہونے سے پہلے یہ پادری اپنا لباس پہن کر تمام سپاہیوں کے سامنے نہایت پرجوش وعظ کہا کرتے تھے اور قدیم رسم زمانۂ وزیگاتھ کے موافق وہ خود ہتھیار لیکر لڑائی میں شامل ہوتے تھے۔ سپاہیوں کا دل بڑھاتے تھے۔ عاقبت کے ثواب کا امیدوار بناتے تھے۔" [1]

واقعہ یہ ہے کہ خود مسلمان یہ نہیں سمجھتے تھے کہ الفانسو اس موقع پر اس ساز و سامان اور اپنے تمام جھاڑ جھنکار کے ساتھ میدان میں آئے گا۔ چنانچہ یوسف بن تاشفین نے جب عیسائی فوجوں کا یہ تلاطم دیکھا تو اس نے خود حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن بہر حال جو قدم ایک مرتبہ اسلام کی سرفروشانہ حمایت و تائید کے لئے اٹھ چکا تھا وہ اب پیچھے نہیں لوٹ سکتا تھا۔ عیسائی فوج کا مقابلہ سب سے پہلے معتمد اور اس کے لشکر سے ہوا۔ عیسائی ٹڈی دل نے بے خبر اور قلیل التعداد مسلمانوں پر اچانک جو حملہ کیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نرغہ میں آگئے لیکن اس پر بھی انھوں نے شجاعت و بہادری اور دلیری و پامردی کا ایسا روشن ثبوت دیا کہ مسٹر اسکاٹ کو بھی آخر کار مجبور ہو کر یہ کہنا ہی پڑا کہ

"بادشاہِ اشبیلیہ اور ان کی فوج کی حالت اگرچہ نہایت خطرناک تھی مگر انھوں نے بے حد استقلال دکھایا اور باوجود عیسائیوں کے نہایت سخت حملہ کے وہ نہایت مستقل مزاجی سے لڑتے رہے۔ اس موقع پر خود معتمد نے وہ ہمت و استقلال دکھایا کہ اپنے خاندان کے تمام بدنامی کے دھبے کو دھو دیا اور خلافتِ مغربی کے بہادروں کے کارناموں کو یاد دلا دیا۔ گھمسان کی لڑائی میں وہ اس طرح میدان میں جمے رہے کہ گویا موت سے کھیل رہے ہیں اور شوقِ شہادت سے سرشار ہیں۔ ان کے دو زخم آئے۔ تین گھوڑے ان کی رانوں کے نیچے مرے۔ زرہ بکتر کے ٹکڑے اُڑ گئے

[1] اخبار الاندلس ج ۲ ص ۲۰۹۔

تلوار سے دشمنوں کا خون ٹپک رہا تھا مقتولین کی لاشوں کا ڈھیر جوان کے سامنے تھا وہ ان کی قوت وطاقت اور جوہر تیغ زنی کی بین شہادت تھا۔" [۵۱]

شاہِ اشبیلیہ دشمنوں کی فوج میں گھرا ہوا اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح مضبوطی سے جم کر اہلِ فرنگ کے پرخچے اڑا ہی رہا تھا اور زخم کھا کھا کر ان کے کشتوں کے پشتے لگا تا جاتا تھا کہ اتنے میں یوسف بن تاشفین بھی اپنی فوجِ گراں کے ساتھ آ پہنچا اور دشمن پر پیچھے کی جانب سے اس زور کا حملہ کیا کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے اور وہ بدحواس ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ نے اس وقت عیسائی افواج کی جو حالت تھی اسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں:-

"عیسائی اس وقت بالکل بے خبری میں نرغہ میں آ گئے۔ چھوٹے سے میدان میں گھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف سے تیر ونشتر کے ہدف بنے ہوئے تھے۔ ان کی کثرت بجائے اس کے کہ ان کی مددگار ہوتی اور بھی مصیبت شدید ہو گئی۔ کچھ ان کے گھوڑوں نے ان کو نقصان پہنچایا۔ رہی سہی صفیں اونٹوں نے الٹ دیں۔ پریشانی میں ایک نے دوسرے پر تلوار اٹھائی چونکہ میدان تنگ تھا صفیں ایک دوسرے سے اس طرح مل گئیں کہ تلوار چلانا مشکل تھا جو سپاہی کہ بربریوں کی زد میں تھے وہ نہ پسپا ہو سکتے تھے، نہ اپنی مدافعت کر سکتے تھے۔ . . . . یوسف کی فوج نہایت شدت سے لڑ رہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قسمت کا پانسہ پلٹ گیا۔ عیسائی آخر کب تک تذبذب کی حالت میں رہتے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر آگے کو بھاگے اور پیچھے سے ان کا قتلِ عام شروع ہوا" [۵۲]

علامہ مقری نے تو بعض مورخین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جنگ میں عیسائیوں کی تعداد تین لاکھ تھی اور ان میں سے بہت کم بچ کر جا سکے [۵۳] لیکن اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے

[۵۱] اخبار الاندلس ج ۲ ص ۲۱۲ [۵۲] ایضاً ج ۲ ص ۲۱۳ - [۵۳] نفح الطیب ج ۱ ص ۲۰۵۔

اسکاٹ کا بیان ہے کہ عیسائی ساٹھ ہزار تھے اور بیس ہزار سے زیادہ کھیت رہے۔ شاہِ الفانسو، یوسف بن تاشفین کی ایک ضرب سے شدید مجروح ہوا تھا لیکن بہرحال چند ساتھیوں کے ساتھ نکل بھاگنے میں کامیاب رہا۔

اس جنگ کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو اندلس کی بازیافت کے عیسائیوں کے جتنے منصوبے تھے وہ سب آن کی آن میں خاک میں مل گئے اور دوسری جانب اندلس کے مسلمان بادشاہوں میں جو باہمی خانہ جنگی تھی وہ ختم ہوگئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر المعتمد اور اس کی فوج نے غیر معمولی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیا تھا۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ جنگ کی فتح میں یوسف بن تاشفین اور اس کی بربری فوج کا بہت بڑا حصہ تھا۔ اس شاندار کامیابی نے اندلس کے ملوکِ طوائف پر یوسف کی ہیبت بٹھادی اور اس کو امیر المومنین کا لقب مل گیا۔

یوسف بن تاشفین کا اندلس پر قبضہ

مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ ایسے لوگ یوسف کو اگر "خادع" اور "غاصب" کہیں تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ حیرت اس پر ہے کہ علامہ عبدالواحد المراکشی ایسا مسلمان مورخ بھی یوسف بن تاشفین کی نیت کو بخیر قرار نہیں دیتا۔ انھوں نے اپنی کتاب المعجب میں کئی جگہ لکھا ہے کہ دراصل اندلس میں یوسف کے آنے کا مقصد پہلے سے ہی اس پر قبضہ کرلینا تھا۔ حالانکہ واقعات سے اس کی بالکل تائید نہیں ہوتی۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یوسف نے جنگِ زلاقہ میں فتح حاصل کرلینے کے بعد اس بات کا یقین کرلیا تھا کہ اندلس کے مسلمان بادشاہوں کی خانہ جنگی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر یہ ختم نہ ہوئی تو عیسائی طاقتیں مسلمانوں کا نام و نشان مٹا کر رکھدیں گی اور ان پر عرصۂ حیات تنگ ہوجائے گا۔

چنانچہ ابن خلکان اور عبدالواحد المراکشی دونوں نے لکھا ہے کہ یوسف بن تاشفین نے شروع شروع میں المعتمد بن عباد شاہ اشبیلیہ اور ابنِ رشیق حاکمِ مرسیہ ان دونوں میں بعض خاص شرائط پر صلح بھی کرائی تھی لیکن آپس کی عداوت و نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ جنگ کے زمانہ میں عارضی طور پر دب گئی تھی لیکن جنگ کے ختم ہوتے ہی پھر ابھر آئی اور اب یوسف بن تاشفین کیلئے

بجز اس کے کوئی اور چارۂ کار نہیں تھا کہ اندلس پر خود قبضہ کریں اور اپنی طاقت و قوت سے اندلس سے باہمی خانہ جنگی کا خاتمہ کردیں۔

یوسف بن تاشفین کی حسنِ نیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ علماء اور فقہاء کو بلا کر ان سے استفتا کیا۔ اور جب اُن سب کی متفقہ رائے سے یہ طے ہو گیا کہ یوسف کو اندلس پر قبضہ کر لینا چاہیے تو اس نے قبضہ کر لیا اور اس طرح ۴۸۵ھ میں اندلس شمالی افریقہ کے خاندان المرابطون کے زیرِ نگین آگیا۔ اب ملک سے طوائف الملوکی کا خاتمہ ہو گیا اور عیسائی حکومتیں مسلمانوں کو اندلس سے بے دخل کر دینے کا جو خواب دیکھ رہی تھیں وہ خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ صورتِ حال کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی۔ ۴۸۵ھ میں المرابطون کی حکومت قائم ہوئی تھی، ۵۲۳ھ سے پھر طوائف الملوکی شروع ہو گئی جو ۵۴۲ھ تک رہی۔

الموحدون | اسی اثناء میں موحدوں نے عبدالمومن کی زیرِ قیادت جو امیر المومنین کہلاتا تھا اور محمد بن تومرت[1] کا جانشین تھا، مراکش پر قبضہ کر کے وہاں سے المرابطون کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ۵۴۵ھ میں انھوں نے اندلس پر بھی قبضہ کر لیا اور المرابطون کی حکومت یہاں سے بھی ختم ہو گئی۔

الموحدون کی حکومت یہاں ۶۲۰ھ تک رہی۔ اس مدت میں ۵۹۵ھ میں جبکہ الناصر الدین اللہ کی حکومت کا زمانہ تھا، قسطیلہ کے بادشاہ الفانسو نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری

---

[1] محمد بن تومرت سوس کے باشندہ تھے۔ وہاں کے ایک گاؤں میں ان کی ولادت ہوئی۔ نہایت عالم و فاضل اور لائق و قابل تھے۔ امام غزالیؒ ایسے یگانۂ روزگار فاضل کے شاگرد تھے ۵۱۵ھ میں انھوں نے سوس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا اور اپنے معتقدین و مریدین کا ایک بڑا وسیع حلقہ قائم کر لیا۔ بعد میں مہدویت کے مدعی ہو گئے اور مرابطین کے خلاف افریقہ میں باقاعدہ فوج کشی کی۔ عبدالمومن انھیں کا معتقد اور مرید تھا جس کو محمد بن تومرت نے وفات سے پہلے خود اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔

بڑے زور شور سے کی۔ اس مقصد کے لئے اس نے پاپائے اعظم سے مدد مانگی اور فرانس وغیرہ کے لوگوں کو آمادۂ جنگ کرنے کے لئے مبلغین روانہ کردیئے۔ اس ساز و سامان اور جاہ و حشم کے ساتھ اس نے مسلمانانِ اندلس پر حملہ کیا۔ خلیفہ الناصر مقابلہ کے لئے بڑھا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ بدقسمتی سے مسلمان ہار گئے اور میدان چھوڑ کر بھاگے تو الفانسو کی فوج نے ان کا تعاقب کیا اور اس طرح جو کچھ لوٹ سکتے تھے وہ لوٹا اور جو لوگ ان کے ہاتھ آگئے انھیں گرفتار کرلیا۔ لیکن یہ فتح ان کے لئے چنداں خوش آیند اور خوشگوار ثابت نہ ہوسکی۔ ابھی اس کو کچھ زیادہ مدت نہ ہونے پائی تھی کہ الناصر لدین اللہ کے ہی ایک قائد لشکر نے جس کا نام زکریا بن ابی حفص تھا ۶۰۹ھ کے لگ بھگ ایک فوجِ کثیر جمع کرکے حملہ کیا اور اہلِ فرنگ کو شکستِ فاش دیکر انھیں ان کے بلاد کی طرف لوٹا دیا۔

اس کے بعد یعقوب الناصر بادشاہ ہوا۔ لیکن یہ لہو و لعب کا دلدادہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب پھر اہلِ فرنگ کو حوصلہ ہوا اور انھوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے ۶۱۴ھ میں بڑے زور کا حملہ کردیا۔ اس وقت مسلمانانِ اندلس کے حالات اختلال پذیر ہوچکے تھے اور خود الموحدون کی حکومت کا آفتاب بھی زرد پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ اس خاندان کی بربادی تک اندلس کا پایۂ تخت قرطبہ کا شہر ہی رہا جو جبل الطارق کے قلعہ سے سوا سو میل شمال کی جانب واقع ہے۔ عیسائیوں نے موجودہ صورتِ حال اور مسلمانوں کی کمزوری سے بہت فائدہ اٹھایا وہ آہستہ آہستہ ایک ایک علاقہ پر قبضہ کرتے اور مسلمانوں سے اسے چھینتے رہے۔

ابن ہود اندلس کے ملوکِ طوائف کے ذکر میں بنی ہود کا نام گذر چکا ہے۔ اسی خاندان سے اس وقت ایک شخص تھا جس کا نام محمد بن یوسف تھا اور عام طور سے ابنِ ہود کہلاتا تھا۔ اس نے ملک کی موجودہ اختلال پذیر صورتِ حال سے فائدہ اٹھاکر غرناطہ، مالقہ، المیریہ، قرطبہ جیان وغیرہ اکثر صوبوں پر قبضہ کرلیا جس سے جزیرہ نما کے ہر حصہ میں اس کا رعب داب قائم ہوگیا۔ مزید براں ابن ہود نے رعایا اور اکابرِ ملک کی نگاہ میں اپنا وقار بڑھانے کے لئے بغداد کی دولتِ عباسیہ کے خلیفہ المستنصر باللہ کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی کہ میں نے

اندلس کا تمام ملک امیر المومنین کے نام سے فتح کرلیا ہے۔ اب آپ میرے لئے اپنی طرف سے ولایت کا پروانہ بھیجدیں "۔ چنانچہ دربارِ خلافت کی طرف سے ابن ہود کے پاس ایک پروانہ اس کے حسب منشا آگیا۔ جو ۶۳۱ھ میں اسے غرناطہ میں ملا اور وہاں کی جامع مسجد میں ایک مجمعِ کثیر کے سامنے پڑھکر سنایا گیا۔ اس طرح پانچسو برس کے بعد یہ پہلا دن تھا جبکہ عباسیوں کی بہت جلد ختم ہونے والی خلافت کے دربار کو اندلس کے متعلق ایک فرمان لکھنے کا موقع ملا۔

لیکن خلافتِ بغداد کی عمارت میں رخنے پیدا ہو چکے تھے اور اب وہ مستقبل قریب میں منہدم ہونے والی ہی تھی اس بنا پر اس پروانہ ولایت کا اندلس کے لوگوں پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ ابن الاحمر یا نصر بن عمر نامی ایک شخص ابنِ ہود کے قوی حریف کی حیثیت سے اٹھ کھڑا ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ایک زمانہ تک باہم جنگ آزما رہے۔

بدقسمتی سے اس وقت مسلمانوں کی خود غرضی اور عاقبت نااندیشی کے باعث محمد بن یوسف (ابنِ ہود) اور ابن الاحمر دو بڑے سرداروں کے علاوہ اور بھی بہت سے سردار تھے جو مختلف صوبوں میں اپنی اپنی حکومت قائم کئے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ مثلاً صوبہ بلنسیہ میں مروان بن عبدالعزیز، صوبہ مرسیہ میں ابوعبداللہ، صوبۂ المیریہ میں ابن الرمیمی اور صوبۂ اشبیلیہ میں ابومروان۔ یہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر خود مختار حاکم تھے اور ان کی بے حمیتی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے مسلمان حریف کو شکست دینے کی غرض سے عیسائیوں سے بہت گر کر اور گھاٹے پر مصالحت کر لیتے اور ان کی امداد کے طالب ہوتے تھے۔ عیسائیوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ کبھی کسی ایک فریق کے طرفدار ہو جاتے اور اس کی مدد کے معاوضہ میں اس سے ایک علاقہ لے لیتے تھے پھر کسی دوسرے فریق کی طرفداری کرنے لگتے اور اس طرح اس سے کوئی اور علاقہ حاصل کر لیتے تھے۔ اس سلسلہ میں فرولند اول نے بہت نفع اٹھایا۔ اندلس کے شمالی پہاڑی علاقہ میں اس کی ریاست پہلے سے ہی قائم ہو گئی تھی۔ اب اس نے محمد بن یوسف اور نصر بن عمر

کی جنگ کے زمانہ میں ابنِ عمر سے صوبہ جیان جو جزیرہ نما کے تمام حصوں میں سب سے زیادہ اہم اور قدرتی حدود سے مستحکم شمالی صوبہ تھا، اعانت کے معاوضہ میں حاصل کر لیا۔ پھر ابنِ یوسف نے فرولند کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تو اس نے تیس قلعے طلب کئے۔ ابنِ یوسف نے فوراً ان کو حوالہ کر دیا۔ آخر کار جب فرولند نے دیکھا کہ اب مسلمان اچھی طرح کمزور ہو گئے ہیں تو اس نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا کہ اول ایک مسلمان کا طرفدار بن کر دوسرے کو تباہ کرا دیتا تھا۔ پھر جس کا طرفدار ہوا تھا خود اس سے لڑائی شروع کر دیتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں کو شمال سے جنوب کی طرف نکالتا ہوا چلا آیا۔ یہاں تک کہ اندلس کے سوا دو لاکھ میل مربع رقبہ میں سے صرف ساٹھ ہزار میل مربع رقبہ مسلمانوں کے قبضہ میں باقی رہ گیا۔

مسلمان آپس میں لڑتے اور اپنا ملک خود ہی عیسائی سردار کو جو اسپین کا عیسائی بادشاہ ہو گیا تھا سپرد کرتے رہے چنانچہ ۶۲۷ھ میں شہر مریدہ اور اس کے متعلقات پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا۔ ۶۲۸ھ میں جزیرہ میورقہ پر۔ ماہِ صفر ۶۳۶ھ میں صوبہ بلنسیہ پر۔ اور ماہِ شوال ۶۳۶ھ میں دارالخلافہ قرطبہ پر یہ لوگ قابض ہوئے۔ ۶۴۵ھ میں فرولند نے اشبیلیہ پر چڑھائی کی۔ اور آخر کار طویل محاصرہ کے بعد اسے بھی فتح کر لیا۔ اب تمام مسلمان سردار اور خود مختار صوبہ دار تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ صرف ایک نصر بن عمر بچ رہا تھا۔ اس کے قبضہ میں اندلس کا جنوبی حصہ یعنی صوبۂ غرناطہ رہ گیا تھا جس کا رقبہ اس زمانہ میں پچاس ساٹھ ہزار میل مربع ہو گا۔

مسلمانوں میں جب کوئی ابنِ عمر کا حریف اور مدِمقابل نہیں رہا اور دوسری طرف اس نے فرولند کی بڑھتی ہوئی طاقت و قوت کا جائزہ لیا تو اب اس کے لئے بجز اس کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ فرولند سے صلح کر لے۔ فرولند نے بھی وقتی طور پر اس کو غنیمت جانا اور دونوں میں صلح کا عہد و پیمان ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد سے اندلس میں مسلمانوں کا دارالحکومت قرطبہ کی بجائے غرناطہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس حیثیت سے یہاں تقریباً ڈھائی سو سال یعنی ۸۹۷ھ تک حکومت کی۔

اور یہیں سلاطینِ غرناطہ نے وہ عجیب و غریب محل بنوایا جو الحمرا کہلاتا اور عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا تھا۔

سلطنتِ غرناطہ | قرطبہ اور اشبیلیہ کی طرح غرناطہ کی سلطنت بھی بڑے جاہ وجلال اور شوکت و حشمت کی حکومت تھی۔ بنو احمر کے خاندان سے یہاں جو بادشاہ ہوئے ان میں سے پہلے دور کے بادشاہوں نے مرابطون اور موحدون کی طرح بڑے قابلِ قدر کارنامے انجام دیئے اور اس چھوٹی سی حکومت کو سیاسی، علمی اور تمدنی حیثیت سے اس زمانہ کی ایک شاندار حکومت بنانے میں کامیاب کوششیں کیں۔ جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ تاہم اجمالاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے یہاں شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ مساجد اور مدارس کا اہتمام کیا۔ پولیس اور فوج کا بہترین انتظام کیا۔ علوم وفنون کو ترقی دی۔ صنعت وحرفت کے ذریعہ لوگوں کی اقتصادی حالت بہتر بنائی اور ساتھ ہی آس پاس کی عیسائی سلطنتوں سے جنگ کرکے متعدد علاقے اُن سے واگذار کرالئے۔ لیکن آخرکار یہاں بھی وہی حالات رونما ہونے لگے جن کے باعث قرطبہ اور اشبیلیہ کی سلطنتیں تباہ ہوئی تھیں۔

۸۷۰ھ میں سلطان حسن غرناطہ کے تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ یہ اس جاہ وجلال کا بادشاہ تھا کہ ۸۸۰ھ میں قسطیلہ یا کیسٹل کے عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ نے نہایت مغرورانہ انداز میں سلطان حسن سے خراج کا مطالبہ کیا تو اس نے جواب میں لکھا "غرناطہ کی ٹکسال میں اب سونے چاندی کے سکوں کی جگہ فولادی تلواریں اور نیزے عیسائیوں کے جگر چاک کرنے کی غرض سے تیار کئے جاتے ہیں۔"

سلطان کا یہ جواب صرف زبانی جمع خرچ اور دھمکی نہ تھا بلکہ اس نے سچ مچ ۸۸۶ھ میں شاہ قسطیلہ کے قلعۂ صخرہ پر حملہ کیا۔ اور اگرچہ یہ نہایت مضبوط، مستحکم اور بلند وبالا قلعہ تھا سلطان نے ایک ہی شب میں اسے مسخر کرلیا اور اس کے بعد جنگ کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

۸۸۷ھ میں قلعۂ الحمراء کو مسلمان فوجیوں سے خالی پاکر شاہ کیسٹل نے اس پر حملہ کرکے قبضہ

کرلیا اور ہزاروں مسلمان مردوں، عورتوں اور ننھے ننھے بچوں کو بلا وجہ بیدردی کے ساتھ قتل کردیا۔ اسی سال کے ماہِ جمادی الاول میں سلطان حسن کو خبر پہنچی کہ شاہِ کیسٹل بذاتِ خود ایک فوجِ گراں کو ہمراہ لئے غرناطہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پھر ساتھ ہی اطلاع آئی کہ اس نے شہر لوشہ کا محاصرہ کرلیا ہے۔ سلطان نے یہ سنتے ہی اپنے گھوڑے کی باگ لوشہ کی طرف موڑ دی، ۲۷ تاریخ کو دونوں صف آرا ہوئے۔ شاہ کیسٹل نے شکست کھائی اور مسلمان اس کی فوج کے مال و اسباب پر قابض ہوگئے۔

لیکن اِدہر عیسائیوں کے ساتھ جنگ جاری تھی اور اِدہر مسلمان نہایت خطرناک قسم کی خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سلطان حسن کی ایک عیسائی جاریہ تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان کی جو بیوی تھی وہ خود اس کی چچازاد بہن یعنی عبد اللہ کی بیٹی تھی۔ بیوی اور جاریہ دونوں سے اولاد تھی۔ بیوی کے بطن سے دو لڑکے تھے جن کا نام ابو عبد اللہ اور یوسف تھا لیکن سلطان کو اپنی جاریہ سے زیادہ محبت تھی۔ اِس بنا پر ابو عبد اللہ اور یوسف دونوں کو خوف تھا کہ کہیں سلطان ان کو تاج و تخت سے محروم کرکے ان کے سوتیلے بھائی کو اپنا جانشین نہ بنا دے۔ اس اندیشہ کے باعث ٹھیک اس وقت جبکہ سلطان مقام لوشہ میں شاہ کیسٹل سے نبرد آزما تھا۔ ابو عبد اللہ اور یوسف نے موقع پاکر باپ کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردیا اور غرناطہ کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا۔ سلطان کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مقامِ مالقہ میں مقیم ہوکر اس بغاوت کو فرو کرنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ عیسائیوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور انھوں نے فوراً مالقہ پر حملہ کردیا۔ لیکن انھیں شکست فاش ہوئی۔ اور ان کے بڑے بڑے تجربہ کار سپہ سالار اور تقریباً دس ہزار سپاہی زندہ گرفتار ہوئے۔

اب ابو عبد اللہ نے باپ کے خلاف مالقہ پر حملہ کردیا۔ باپ بیٹے دونوں صف آرا ہوئے۔ ابو عبد اللہ کو شکست ہوئی اور وہ غرناطہ بھاگ آیا۔ اس کے بعد اس نے ماہ ربیع الاول ۸۸۸ھ میں شہر یوشینہ پر چڑھائی کردی۔ اس شہر کو لوٹ مار کرکے واپس آرہا تھا کہ کسی طرح

عیسائی فوجوں کے ہاتھ آگیا۔انھوں نے اس کو گرفتار کر کے شاہِ قسطیلہ کے پاس پہنچا دیا۔سلطان حسن کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ مالقہ سے غرناطہ آگئے لیکن بیٹوں کی باغیانہ سرگرمیوں کے باعث اب ان کا دل امورِ سلطنت وحکومت سے اس درجہ بیزار ہو گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی عبداللہ الزغل کے حق میں سلطنت سے دستبردار ہو گئے۔

۸۹۰ھ کے ماہِ ربیع الثانی میں عیسائیوں نے صوبۂ مالقہ پر پھر حملہ کیا اور سرحد کے چند قلعوں پر قبضہ کر لیا۔سلطان عبداللہ الزغل غرناطہ سے روانہ ہو کر ابھی ایک قلعہ میں فروکش تھا ہی کہ عیسائیوں کی ایک فوج نے بیخبری میں حملہ کر دیا۔مسلمان اگرچہ اس وقت بالکل غافل تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن کا صفایا ہو گیا۔

مسلمانوں کی اس فوجی طاقت وقوت سے فرڈیننڈ کو جو کیسٹل کا بادشاہ تھا یقین ہو گیا کہ اب لڑائی جیتنا مشکل ہے۔اس لئے اس نے چال یہ چلی کہ اس نے سلطان حسن کے بیٹے ابوعبداللہ کو جو اس کی قید میں تھا اپنے پاس بلایا اور اسے چچا (عبداللہ الزغل) کے برخلاف غرناطہ پر فوج کشی کرنے پر آمادہ کر دیا۔چنانچہ ابوعبداللہ فرڈیننڈ کی امداد پر بھروسہ اور اس سے بہت کچھ وعدہ وعید کر کے روانہ ہوا اور چچا کے خلاف صف آرا ہو گیا۔اس جنگ میں جتنے حصہ پر ابوعبداللہ کا قبضہ ہوتا رہا معاہدہ کے مطابق وہ اسے فرڈیننڈ کے حوالہ کرتا رہا۔

سلطان الزغل اس صورتِ حال کو دیکھ کر غرناطہ سے مالقہ کی جانب جہاں فرڈیننڈ نے مسلمانوں کا قتل عام کر رکھا تھا روانہ ہوا۔ابوعبداللہ نے یہ خبر سنی تو فوراً غرناطہ پہنچ اس پر قبضہ جما بیٹھا۔الزغل نے اب غرناطہ لوٹنا مناسب نہ سمجھا اور وادی آش میں مقیم ہو گیا۔ادھر شاہ کیسٹل غصہ میں بھرا ہوا تو تھا ہی اس نے مالقہ کے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنی برہنہ تلوار کو سیراب کیا اور ہزاروں کو پکڑ کر لونڈی غلام بنا لیا۔یہ ۸۹۲ھ کے واقعات ہیں۔

ابوعبداللہ غالباً اب تک یہ سمجھتا تھا کہ فرڈیننڈ نے اس کو الزغل کے خلاف جو امداد بہم پہنچائی ہے اور اس سلسلہ میں اس نے جو کچھ اس سے عہد وپیمان کیا ہے۔فرڈیننڈ اس کو

پورا کرے گا اور اس طرح غرناطہ کے خود مختار حاکم ہونے میں اس کی مدد کرے گا لیکن ۸۹۳ھ میں اس کو یہ بات صاف طور پر محسوس ہو گئی کہ درحقیقت یہ سب کچھ بھی فرڈینینڈ کی ایک خطرناک سیاسی چال تھی اور اس کا اصل مقصد مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مبتلا کر کے ان کی مرکزی طاقت کو کمزور کرنا اور موقع پا کر خود اس پر قابض ہو جانا تھا۔

چنانچہ ۸۹۴ھ میں فرڈینینڈ نے ابو عبداللہ کے خلاف فوج کشی کر دی۔ ابو عبداللہ نے مقابلہ کیا۔ لیکن انجام کار اس شرط پر صلح کر لی کہ صوبہ بسطہ فرڈینینڈ کے حوالہ کر دیا جائے گا اس صلحنامہ میں اس بات کی صاف شرط تھی کہ مسلمانوں کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ صلحنامہ کے مطابق بسطہ شاہ کیسٹل کی تحویل میں دیدیا گیا لیکن اس نے صلحنامہ کی شرائط کا ذرا لحاظ اور پاس نہ کیا اور یہاں کے مسلمانوں کے مال و اسباب پر زبردستی قبضہ کر لیا جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا ہے۔

سلطان الزغل غرناطہ پر ابو عبداللہ کی استیلا کی خبر سن کر وادی آش میں مقیم ہو گیا تھا اور وہاں کا بادشاہ بنا بیٹھا تھا۔ فرڈینینڈ نے کسی طرح دھوکہ دے دلا کر اور الزغل کو سبز باغ دکھا کر پہلے صوبہ المریہ اور پھر وادیِ آش پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب اس کے لئے صرف غرناطہ کی مہم کا سر کرنا باقی تھا۔ چنانچہ اس نے ابو عبداللہ کے پاس پیغام بھیجا کہ "جس طرح الزغل نے المریہ اور وادیِ آش دونوں خود بخود اپنی رضامندی سے ہمارے سپرد کر دیئے ہیں۔ غرناطہ کا قلعۂ الحمرا بھی تم ہمارے حوالہ کر دو۔ اس کے بدلہ میں جتنی دولت طلب کرو گے وہ دیدوں گا اور اس کے علاوہ اندلس کا جو صوبہ کہو گے اس پر تمہاری حکومت قائم کر دوں گا" بے غیرت ابو عبداللہ نے جواب دیا کہ مجھے تو آپ کا کہا کرنے میں پس و پیش نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ میری رعایا کسی طرح اس کو گوارا نہیں کر سکتی۔

ادھر فرڈینینڈ اور ابو عبداللہ میں نامہ و پیام کا سلسلہ جاری تھا اور اُدھر ابو عبداللہ نے مسلمانوں کے جوش اور ان کے مطالبہ سے متاثر و مجبور ہو کر عیسائیوں کے بعض قلعوں پر حملہ آور

ہوکر قبضہ کرلیا اب شاہ کیسٹل نے براہ راست غرناطہ پر فوج کشی کردی لیکن عین غرناطہ کی دیواروں کے سایہ میں مسلمانوں نے شجاعت وپامردی کا ایسا عجیب وغریب مظاہرہ کیا کہ شاہ کیسٹل کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ عیسائیوں کے پلٹتے ہی ابوعبداللہ نے البشرات کی پہاڑی پر موجودہ فوج کے ساتھ حملہ کردیا اور جو عیسائی افواج یہاں رہ گئی تھیں ان کو تہ تیغ کرکے پورے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔

یہ حقیقت کس درجہ المناک ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت تمام جزیرہ نمائے اندلس میں سمٹتے سمٹتے اب صرف غرناطہ کے چھوٹے سے رقبہ میں محدود ہوکر رہ گئی تھی اور عیسائی برابر صوبہ بصوبہ اور علاقہ بہ علاقہ قبضہ کرتے چلے آتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ روزِ بد انھیں اپنی خانہ جنگیوں اور باہمی نبرد آزمائیوں کی وجہ سے ہی دیکھنا پڑا ہے لیکن اب بھی ان کی آنکھ نہ کھلی۔ اور خود غرضی کے غلبہ نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اس خانماں برباد مصیبت سے اپنے تئیں محفوظ رکھ سکتے چنانچہ جب البشرات کے علاقہ پر ابوعبداللہ کا قبضہ ہوا ہے اس کا چچا الزغل اس کے آس پاس ہی کہیں مقیم تھا وہ البشرات پر ابوعبداللہ کے قبضہ کو گوارا نہ کرسکا اور یہاں پہنچکر فتنہ وفساد پھیلانے لگا۔ اس طرح چچا اور بھتیجہ دونوں پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہوگئے۔

شاہ کیسٹل نے اس موقع کو غنیمت جانا اور حملہ کرکے البشرات اور بعض اور قلعوں کو فتح کرلیا۔ اپنی عادت کے مطابق یہاں بھی اس نے مسلمانوں کو قتل کیا۔ جلاوطن کیا اور ان کے مال واسباب پر زبردستی قبضہ کربیٹھا۔ اب اس کو اس کی بھی ضرورت نہ رہی تھی کہ الزغل کو اپنا آلۂ کار بنائے، چنانچہ اس نے الزغل سے صاف صاف کہدیا کہ "تم اگر افریقہ جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ ہم تمہارے لئے اس کا انتظام کردیں گے" الزغل نے مجبور وبے بس ہوکر ایسا ہی کیا اور افریقہ چلا آیا یہاں مقام تلمسان میں سکونت اختیار کرلی یہیں جان بحق ہوگیا۔ اس کے بعد پورے جزیرہ نما میں ایک ابوعبداللہ رہ گیا تھا۔

فرڈیننڈ اپنی چالاک اور ہوشیار بیوی ازبلا کی تحریض وترغیب سے ۸۹۶ھ میں غرناطہ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ وہ بڑے سازوسامان اور جاہ وحشم کے ساتھ آیا تھا۔ غرناطہ کے سامنے خیمہ فگن

ہو کر ملکہ ازبلا نے ایک شہر کی بنیاد بھی رکھدی جو اس بات کی علامت تھی کہ اب فرڈمینڈ کی فوج غرناطہ کو فتح کیے بغیر واپس نہ ہوگی۔

یہ محاصرہ سات آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اہلِ غرناطہ نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ اسے انگیز کرتے رہے۔ لیکن جب سردی زیادہ شدید ہوئی اور برف باری کے باعث پہاڑی راستے جن سے ان کو سامانِ رسد پہنچتا تھا بند ہو گئے تو ان لوگوں نے سلطان ابو عبداللہ سے میدانِ جنگ میں جانے اور دشمن کے خلاف آخری رمقِ زندگی تک لڑتے رہنے کی اجازت طلب کی۔ لیکن ابو عبداللہ کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ ڈرتا تھا کہ بیس ہزار سے کم تعداد کی مسلمان فوج ایک لاکھ کے قریب عیسائی فوج سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی۔

محاصرہ کی سختی اور شدت سے تنگ آکر غرناطہ کے غریب مسلمانوں نے اخوّتِ اسلامی کے نام پر افریقہ اور قسطنطنیہ دونوں کی اسلامی حکومتوں کو مدد کے لئے لکھا اور ایسے رقت انگیز الفاظ میں لکھا کہ بقول مسٹر اسکاٹ کے "سنگدل کو بھی موم کر دیں" چنانچہ قسطنطنیہ کے بادشاہ بایزید ثانی کو انھوں نے جو خط لکھا تھا اس میں تحریر تھا کہ "صدیوں سے عیسائی ہم کو دباتے چلے آرہے ہیں۔ اب ہم ان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ ہم کو ہر طرح کا نقصان پہنچایا گیا ہے ہمیں ہر طرح کی قربانیاں کرنی پڑی ہیں۔ ہمارے بھائی غلام بنا لئے گئے ہیں۔ جن مشکلات اور مصائب میں ہم گرفتار ہیں ان کا آخری اور لازمی نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ مذہبِ اسلام کی ہستی اس ملک میں ختم ہو جائے اور کوئی مسلمان باقی نہ رہے۔"

سلطان بایزید ثانی پر اس خط کا جو اثر ہوا اسے بھی مسٹر اسکاٹ کی ہی زبانی سنئے لکھتے ہیں۔

"اپنے ہم مذہبوں کی یہ دردناک تحریر دیکھکر سلطان پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے دو فرانسکن راہبوں کو روم بھیجا اور پوپ کو یہ دھمکی دی کہ سلطنتِ ٹرکی میں تمام عیسائی آزادیٔ خیال و افعال رکھتے ہیں۔ اگر مسلمانانِ اندلس پر یہی ظلم جاری رہا تو اس کا بدلہ وہ اپنی عیسائی رعایا سے لیں گے ورنہ وہ فوراً اپنے رعب و اقتدار کو

کام میں لاکر اپنے کیتھولک غلاموں کو ان حرکتوں سے باز رکھیں جو وہ کر رہے ہیں۔"

پوپ نے سلطان کے دونوں ایلچیوں کو اپنا ایک خط دیکر فرڈیننڈ کے پاس بھیجدیا لیکن اس میں مسلمانوں کے لئے کوئی سفارش نہ تھی صرف واقعات کا اعادہ کیا گیا تھا۔ فرڈیننڈ اور ازبلا زمانہ بھر کے چالاک اور عیار تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو پوپ کو یہ جواب دیکر زم کیا کہ "تمام جزیرہ نمائے اندلس ان کا حق ہے۔ اس حق کو ان لوگوں کے (یعنی مسلمانوں) کے اجداد نے غصب کر لیا تھا جو اس وقت اس سرزمین کو اپنی ملکیت سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس ملک کو وہ بہت جلد اپنے ہاتھ سے اسی طرح کھودیں گے جس طرح خود ان کے (فرڈیننڈ اور ازبلا کے) اجداد نے کھودیا تھا" آگے چل کر فرڈیننڈ نے لکھا تھا کہ "میری سلطنت میں تمام غیر عیسائی باجگزاروں کو وہی حقوق حاصل ہیں جو دنیا بھر میں ہر جگہ مسلمانوں کی سلطنت میں عیسائیوں کو حاصل ہیں۔"

اور دوسری جانب اس زمانہ میں سلطان بایزید ثانی امیر مصر سے برسرِ پیکار تھا۔ فرڈیننڈ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے بایزید ثانی سے وعدہ کیا کہ "میں آپ کے دشمنوں کے خلاف آدمیوں اور جہازوں سے آپ کی مدد کروں گا۔" فرڈیننڈ کی یہ تدبیر کارگر ہوئی اور اس کے اس وعدہ کا سلطان بایزید ثانی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے پھر اندلس کے بیکس و بے بس مسلمانوں کی کوئی خبر نہ لی اور جیسا کہ اسکاٹ نے لکھا ہے "اسلام کے نام لیواؤں کو اپنے حال اور اپنی قسمت پر چھوڑ دیا" [۱]

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

اب ابو عبداللہ نے قصر الحمرا میں ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی جس میں غرناطہ کے بڑے بڑے شیوخ و عمائد اور امراء و وزراء شریک تھے۔ ان میں جو بعض بڑے پرجوش اور غیر تمند تھے، ان کی رائے قطعی طور پر یہی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے آخری قطرۂ خون تک لڑنا چاہئے۔ چاہے انجام کچھ ہی ہو۔ بہرحال غرناطہ کو اس طرح دشمن کے حوالہ کر دینا سخت ننگ و عار اور بزدلی کی

---

[۱] اخبار الاندلس ج ۲ ص ۶۹۲۔

بات ہے۔ لیکن اکثریت کے نقار خانہ میں اکیلے طوطی کی آواز کیا اثر پیدا کر سکتی تھی۔ آخر ابو عبد اللہ نے اپنے وزیر ابو القاسم عبد الملک کی معرفت فرڈیننڈ سے صلح کی بات چیت شروع کی اور انجام کار ایک صلحنامہ مرتب ہوا جس پر شاہ کیسٹل اور ابو عبد اللہ دونوں کے دستخط ہو گئے اور اس پر مسلمانوں کی حکومت کا جو تقریباً آٹھ سو سال سے قائم تھی، یہاں سے بالکل خاتمہ ہو گیا۔

یہ صلحنامہ جو درحقیقت مسلمانانِ اندلس کی بدبختی کی آخری دستاویز تھا نہایت طویل تھا اور جیسا کہ امیر شکیب ارسلان نے اپنی کتاب "آخر بنی سراج" میں تصریح کی ہے پچپن دفعات پر مشتمل تھا۔ ان میں سے چند اہم دفعات کا خلاصہ یہ ہے کہ "تمام چھوٹے بڑے مسلمانوں کو امن دیا جائیگا ان کے اموال اور جاگیرات اور جائیدادیں سب محفوظ رہیں گی۔ ان کے مذہبی معاملات اور اوقات و مساجد آزاد رہیں گے، ان کے معاملات و خصوصیات کا تصفیہ خود مسلمان قاضی یا حاکم کرے گا۔ جنگ میں جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آگیا ہے اس کو غصب نہ کیا جائے گا۔ مقررہ ٹیکس کے علاوہ ان پر کوئی زائد ٹیکس نہ لگایا جائے گا۔ جو عیسائی مسلمان ہو گئے ہیں ان کو ترکِ اسلام پر مجبور نہ کیا جائے گا اور اسی طرح کسی مسلمان کو بجبر عیسائی بنانے کی کوشش نہ کی جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان افریقہ جانا چاہے گا تو حکومت اس کو اپنے انتظام سے افریقہ پہنچائے گی۔ کوئی عیسائی کسی مسلمان کے گھر میں داخل نہ ہوگا اور نہ اس کی دیوار پر چڑھیگا۔ مسلمانوں کو عیسائی فوجیوں کی دعوت کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ مسلمانوں کو لباس میں پوری آزادی رہے گی۔ یعنی انھیں کسی خاص وضع قطع کے اختیار کرنے یا کوئی خاص علامت لگانے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ کوئی عیسائی کسی مسلمان کا راہ چلتے یا کہیں اور مذاق نہ اڑائے گا اس پر فقرہ نہ کسے گا۔ اس کے ساتھ تمسخر نہ کریگا اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کو قرار واقعی سزا دی جائے گی جو مسلمان جنگی مجرم ہیں اُن کو رہا کر دیا جائیگا اگر کوئی مسلمان غلام اپنے مالک کے پاس سے بھاگ کر غرناطہ آجائے گا تو اسے مامون سمجھا جائے گا اور بادشاہ اس کی قیمت غلام کے مالک کو ادا کر دے گا۔

یہ معاہدہ عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۳۰ر دسمبر ۱۴۹۱ء مطابق یکم ربیع الاول ۸۹۷ھ کو

ہوا تھا اور اس پر علاوہ فرڈیننڈ کے ملکہ ازبلا، شاہی خاندان کے شہزادے اور شہزادیاں، پادری اور دیگر مذہبی پیشوا۔ امرا اور وزرا، درباروعمائد و ارکانِ سلطنت کے دستخط ثبت تھے اور اس میں فرڈیننڈ اور اس کی بیوی ازبلا نے اس بات کا عہد کیا تھا کہ دونوں اس صلحنامہ کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی پابندی کریں گے اور جس طرح یہ عہدنامہ خود ان دونوں کے لئے اور ان کے تمام حکام و عمال اور امرا، و اعیان کے لئے واجب العمل ہے اسی طرح ان کے قائم مقام، ان کی اولاد، اور اولاد کی اولاد سب اس عہدنامہ کے مطابق عمل کرینگے اور اس سے سرِمو انحراف نہ کریں گے۔

یہ عہدنامہ تو وہ تھا جس کا تعلق عام مسلمانوں اور ان کے مفاد سے تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور عہدنامہ ترتیب دیا گیا جو خاص ابوعبداللہ کی ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ اس عہدنامہ میں چودہ دفعات تھیں جن کا ماحصل یہ تھا کہ شاہ فرڈیننڈ اور ازبلا ان دونوں نے کچھ املاک و اراضی اور شہر سلطان ابوعبداللہ کو دیئے ہیں انھیں میں سے ایک البشرات بھی تھا جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

علاوہ بریں اس بات کا بھی وعدہ کیا گیا تھا کہ ابوعبداللہ کو وہاں کے سکہ کے حساب سے جس کو "مراویدی" کہا جاتا تھا ایک کرور چالیس لاکھ اور پانچسو کی رقم دی جائے گی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ رقم اس وقت حوالہ کی جائے گی جبکہ فرڈیننڈ اور ازبلا قلعہ الحمرا میں داخل ہوجائیں گے پھر خاص ابوعبداللہ سے یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ جب تک وہ اندلس میں قیام کرے گا اس سے کوئی محصول نہیں لیا جائے گا اور اگر اس نے کبھی اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور ہی آباد ہونا چاہا تو اس کی ان زمینوں اور جائدادوں کو مناسب قیمت پر خرید کرلیا جائے گا۔ اور اگر اس نے ان کو فروخت نہ کرنا چاہا تو وہ اپنا کوئی قائم مقام یا کارندہ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے یہاں چھوڑ جائے وہ ہر سال ان جائیدادوں اور جاگیروں کی آمدنی وصول کرکے ابوعبداللہ کو بھیجدیا کرے گا۔ پھر ابوعبداللہ جو بحری سفر کرے گا تو اس کے لئے اور اس کے تمام متعلقین

کے لئے کشتیوں وغیرہ کا انتظام فرڈیننڈ کی حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔ امیر شکیب ارسلان کی تحقیق کے مطابق یہ دوسرا معاہدہ بتاریخ ۲۵ دسمبر ۱۴۹۱ء کو ہوا تھا۔ [1]

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ابو عبداللہ نے اپنے وزیر کے توسط سے جو یہ معاہدہ کیا تھا بالا بالا ہی کر لیا تھا۔ اہلِ غرناطہ کو اس کی کن پہن ہوئی تو وہ سخت برہم اور پریشان ہوئے۔ حامد بن زرارۃ نامی ایک درویش کے جوش دلانے اور اکسانے پر بیس ہزار اہلِ غرناطہ مسلح ہو کر جنگ کرنے کے لئے نکلے بھی لیکن کچھ ایسے اسبابِ سماویہ پیش آئے کہ یہ اس مشکل سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ اس واقعہ کے دوسرے دن ابو عبداللہ شہر کے رؤسا کی ایک جماعت کے ساتھ قلعہ الحمرا سے نکلا اور مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا۔

"مسلمانو! میں اقرار کرتا ہوں کہ اس ذلت و رسوائی میں کسی کا کوئی گناہ نہیں ہے گنہگار صرف میں ہوں۔ میں نے اپنے باپ کے ساتھ نافرمانی اور سرکشی کا معاملہ کیا، اور دشمنوں کو ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی لیکن بہر حال خدا نے مجھکو میرے گناہوں کی سزا دیدی ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میں نے اس وقت یہ معاہدہ جو قبول کیا ہے تو محض اس لئے کیا ہے کہ تم لوگوں کے اور تمہارے بچوں کے خون خواہ مخواہ نہ بہیں، تمہاری عورتیں لونڈیاں اور باندیاں نہ بنیں اور تمہاری شریعت اور تمہارے املاک و متاع اُن بادشاہوں کے زیرِ سایہ محفوظ رہیں جو بہر حال بدنصیب ابو عبداللہ سے بہتر ہوں گے۔"

فرڈیننڈ کی طرف سے دس دن دو ماہ کی مدت دی گئی تھی کہ ابو عبداللہ اس مدت کے اندر اندر فرڈیننڈ کا قبضہ الحمرا پر کرا دے گا۔ لیکن ابو عبداللہ اس درجہ پریشان اور سراسیمہ تھا کہ اس نے اس مدت سے پہلے ہی مندرجہ بالا تقریر کے دوسرے دن فرڈیننڈ کو پیغام بھیجا کہ آپ شہر پر قبضہ کر لیجئے۔ فرڈیننڈ نے ایک پادری کو اس پر مقرر کیا کہ سب سے پہلے وہ ایک جماعت

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۷

کے ساتھ غرناطہ میں داخل ہو کر قلعۂ الحمراء کے سب سے بڑے برج کے اوپر سے اسلامی نشان کو گرا کر اس کی جگہ صلیب کا نشان نصب کرے۔ تاکہ اسے دیکھتے ہی پر جوش وامنگ ہو کر بادشاہ اور اس کی ملکہ شہر میں داخل ہوں۔ اسی قرارداد کے مطابق اب دونوں طرف غرناطہ کو الوداع کہنے اور اس میں داخل ہونے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ایک جانب بدنصیب ابو عبداللہ اور اس کا تمام خاندان تھا جو رات بھر اپنا ساز و سامان درست کرتا رہا اور غرناطہ سے پیش آنے والی جدائی کے غم میں الحمراء کے ایک ایک در و دیوار اور طاقچہ و محراب کو حسرت و افسوس سے تکتا اور ان پر آنسو بہاتا رہا۔ اور دوسری جانب شاہ کیسٹل کے کیمپ میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ بس اب رات کا تاریک پردہ درمیان میں حائل ہے۔ اس کے اٹھنے کی دیر ہے کہ علی الصباح غرناطہ پر قبضہ ہو جائے گا۔

چنانچہ ابو عبداللہ علی الصباح اپنے متعلقین کو لیکر الحمراء سے نکلا اور ابھی تھوڑی دور ہی آیا تھا کہ اس کو فرڈیننڈ کا فرستادہ پادری مع ایک جماعت کے ملا، ابو عبداللہ نے قلعہ کی کنجیاں اس کو سپرد کرتے ہوئے کہا "جاؤ! اور اب اُن قلعوں پر قبضہ کرلو جن کو اللہ نے ہماری بداعمالیوں کے باعث ہمارے قبضہ سے نکال کر تمہارے قبضہ میں دیدیا ہے"۔ پادری نے الحمراء میں داخل ہو کر امر شاہی کے مطابق اسلامی نشان کو گرا کر اس کی جگہ صلیبی پرچم لہرایا۔ فرڈیننڈ، ازبلا اور تمام عیسائی فوج نے اسے دیکھا تو ان کی خوشی کی حد نہ رہی۔ فوراً بادشاہ اور ملکہ گھٹنوں کے بل بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالائے تمام فوج نے ان کی پیروی کی۔ اس سے فارغ ہو کر یہ لوگ غرناطہ میں داخلہ کے لئے روانہ ہوئے، دریا کے کنارے ایک چھوٹی جامع مسجد تھی، ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ یہاں ابو عبداللہ مل گیا۔ ابو عبداللہ نے فرڈیننڈ کو دیکھتے ہی چاہا کہ سواری سے اتر پڑے لیکن بادشاہ اور ملکہ دونوں نے منع کیا۔ اب ابو عبداللہ نے چاہا کہ بادشاہ کی دست بوسی کرے لیکن اس نے اسے یہ بھی نہ کرنے دیا۔

امیر شکیب ارسلان[1] نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبداللہ نے ملکہ ازبلا کے ہاتھوں کو چومنا چاہا تو اس نے بھی اپنے ہاتھ نہ پھیلائے اور ابو عبداللہ کا اضطراب دیکھ کر اسے تسکین دلاسا دیا،

---

[1] حاضر العالم الاسلامی ج ۲ ص ۹۔

اور ابو عبداللہ کا جو بیٹا اس کے پاس بطورِ ضمانت گرفتار تھا وہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس کے بعد ابو عبداللہ نے شہر کی کنجیاں بادشاہ کو حوالہ کرتے ہوئے کہا "یہ کنجیاں اسپین میں عربوں کے اقتدار کی آخری نشانی ہیں، آپ انھیں لے لیجئے۔ کیونکہ اللہ کی مشیت کے مطابق اب ہمارا ملک، مال و متاع اور ہمارے جسم یہ سب آپ کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نے جیسا وعدہ کیا ہے اسی طرح آپ ان کے ساتھ رحم و کرم اور رافت و نرمی کا معاملہ کریں گے۔" فرڈیننڈ نے جواب دیا "کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے جو وعدہ کیا ہے اس کے مطابق ہی معاملہ کریں گے۔" اس گفتگو کے بعد کنجیاں فرڈیننڈ نے ملکہ ازبلا کے سپرد کر دیں اس نے اپنے بیٹے پرنس جون کو دیں اور جون نے کاؤنٹ ٹنڈل کے حوالہ کر دیں جو غرناطہ کی فوج کا کمانڈر بنایا گیا تھا۔

اب فرڈیننڈ، اس کی ملکہ ازبلا، اور اس کا تمام لاؤلشکر غرناطہ کی طرف اس پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے اور ادھر بدبخت و بدنصیب ابو عبداللہ نے وادیٔ برشانہ میں اُس مقام کا رخ کیا جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس نے اپنی پشت کی جانب ایک حسرت آمیز نگاہ غرناطہ کی آبادی اور قصر الحمرا کے میناروں اور گنبدوں پر ڈالی، اس کے تمام ساتھی بھی اس وقت اس کے ساتھ غرناطہ کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے لیکن ان کی زبانیں گنگ تھیں۔ منہ سے ایک حرف نہ بول سکتے تھے۔ ابھی وہ اس حسرت انگیز اور دردناک نظارہ میں محو ہی تھے کہ قلعۂ الحمرا کے اوپر سے توپوں اور گولوں کے چلنے کی آواز آئی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب غرناطہ سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اور عیسائیوں کے پرچم نے اسے فتح کر لیا ہے۔ ابو عبداللہ اس وقت ضبط نہ کر سکا، بیساختہ اس کا جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔ ابو عبداللہ کی ماں عائشہ جو نہایت عقلمند اور فرزانہ تھی، اس نے بیٹے کو اس طرح روتے ہوئے دیکھا تو بولی "اب تو عورتوں کی طرح رو رہا ہے لیکن تجھ سے پہلے یہ نہ ہو سکا کہ مردوں کی طرح غرناطہ کا دفاع کرتا۔" ابو عبداللہ کے وزیر یوسف نے بھی اسے دلاسا دینے کی کوشش کی لیکن آنسوؤں کا ایک دریا تھا جو اُس کی آنکھوں سے رواں تھا۔ اور کسی کل اسے چین نہ آتا تھا۔ البشرات کی یہ

ایک پہاڑی جس پر کھڑے ہو کر ابو عبد اللہ اور اس کے ساتھیوں نے غرناطہ پر حسرت آمیز نگاہِ واپسیں ڈالی تھی "دمِ واپسینِ عرب" کے نام سے ہی مشہور ہو گئی اور اب تک اسی نام سے یاد کی جاتی ہے۔ امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی سیاحتِ اسپین کے دوران میں اس مقام کو دیکھا ہے۔

ابو عبد اللہ کی وفات

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے فرڈیننڈ نے البشرات کا علاقہ ابو عبد اللہ اور اس کے خاندان کی رہائش کے لئے متعین کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے بہت کچھ عہد و پیمان بھی کئے تھے لیکن غرناطہ پر اقتدار پانے کے بعد اس نے تمام عہود و مواثیق کو "گلدستۂ طاقِ نسیاں" بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ ابو عبد اللہ پر اندلس کی وسیع سرزمین کا چپہ چپہ تنگ ہو گیا اور آخر کار انجام یہ ہوا کہ فرڈیننڈ نے البشرات کا علاقہ بھی اونے پونے کر کے خرید لیا اور ابو عبد اللہ اندلس کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہکر افریقہ چلا آیا۔ یہاں مراکش کے بادشاہ کا ملازم ہو گیا اور اسی حالت میں ۹۴۰ھ میں اس دنیا سے بھی رخصت ہو گیا۔

ابو عبد اللہ نے یوسف اور احمد دو لڑکے اپنی جسمانی یادگار کے طور پر چھوڑے، شہر فاس میں جہاں ابو عبد اللہ کا انتقال ہوا تھا، اب تک اس کی اولاد موجود ہے۔ امیر شکیب ارسلان نے ان سے ملاقات کی ہے اس سلسلہ میں لکھتے ہیں "یہ لوگ نہایت عسرت اور فقر کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن لنگر خانوں سے فقرا اور مساکین کو کھانا تقسیم ہوتا ہے انھیں پر ان لوگوں کی گذر ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مسلمانانِ غرناطہ پر مظالم

سقوطِ غرناطہ کے بعد اندلس سے مسلمانوں کی حکومت جو تقریباً آٹھ سو سال سے یہاں قائم تھی، بالکل ختم ہو گئی۔ لیکن حکومت کے ساتھ عرصۂ حیات بھی ان غریبوں پر تنگ کر دیا گیا۔ ظلم و سفاکی اور جور و ستم کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو ان کے حق میں روا نہ رکھا گیا ہو ایک طرف عہدنامہ کی وہ عبارتیں پڑھیے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور دوسری جانب ان مظالم کی روئداد پڑھیے جو اندلس کے فرزندانِ توحید کے ساتھ کئے گئے تو آپ کو اس حقیقت کا یقین ہو جائے گا کہ دنیا میں جو قوم خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتی اس کو محکوم و مغلوب ہو کر کسی دوسری فاتح قوم سے ہرگز

لطف وکرم اور مواسات وہمدردی کی امید نہیں کرنی چاہیئے۔

چنانچہ فرڈیننڈا ورازبلا نے غرناطہ میں داخل ہوکر پہلا کام تو یہ کیا کہ غرناطہ کی سب سے بڑی جامع مسجد کو گرجا کی شکل میں تبدیل کردیا اور وہیں نمازِ شکرانہ ادا کی۔ اس کے بعد حکومت کی طرف سے اس بات کی کوشش ہوئی کہ مسلمان کسی طرح خود اپنی مرضی سے عیسائیت کو اختیار کرلیں اور مرتد ہوجائیں۔ اس سلسلہ میں اول اول ان کے ساتھ نرمی اور رعایت کا معاملہ کیا گیا۔ لیکن جب عیسائیوں کو یقین ہوگیا کہ مسلمان اپنے مذہب کو ترک کرنے والے نہیں ہیں تو اب اس نے ظاہری رواداری اور مراعات کا پردہ اٹھا کر ان کے ساتھ جبر و تشدد کا معاملہ کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ کسی عیسائی کے لئے مذہبِ اسلام کا اختیار کرنا قانوناً ممنوع ہوگیا اس کے برعکس جو مسلمان عیسائی مذہب قبول کرلیتا تھا اس کے لئے زروسیم کے انبار لگا دیئے جاتے تھے۔ اس کے بعد ۱۴۹۹ء میں فرمان شاہی صادر ہوا کہ جو لوگ مذہبِ عیسوی اختیار نہیں کرتے انہیں اسپین سے نکل جانا چاہیئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ بہت سے غریب اور کمزور طبیعت کے مسلمان گو در حقیقت مسلمان تھے لیکن عتابِ شاہی سے بچنے کے لئے بظاہر گرجاؤں میں آتے جاتے اور ان کے رسوم وطرق بجا لاتے تھے۔ ان کے برخلاف جو مسلمان ظاہراً و باطناً مسلمان رہے ان کے ساتھ طرح طرح کی سختیاں اور زیادتیاں کی گئیں، جن مسلمان بچوں پر ان کا بس چلا انھیں بپتسمہ دیا گیا۔

جب مسلمانوں نے ۱۵۲۴ء میں دربارِ شاہی میں ان مظالم کی شکایت کی تو ان کا معاملہ محکمۂ تفتیشِ مذہبی کے سپرد کردیا گیا۔ اس محکمہ کے فیصلہ کے مطابق ہزاروں مسلمان نذرِ آتش کردیئے گئے۔ پھر اس محکمہ کے صدر لارڈ بشپ نے یہ تجویز کی کہ سال میں ایک مرتبہ مسلمان نہ اپنے کسی وظیفۂ مذہبی کو ادا کریں نہ اپنا مخصوص لباس پہنیں، نہ اپنی زبان میں گفتگو کریں، بادشاہ فیلپ ثانی کے عہد میں غرناطہ کے لارڈ بشپ نے بادشاہ کی اجازت حاصل کرکے یہ عام اعلان کرادیا کہ مسلمان نجاستِ صغریٰ و کبریٰ دونوں میں سے کسی ایک نجاست کی حالت میں بھی غسل نہ کریں۔ علاوہ بریں مغربی رقص میں شریک ہونا ان کے لئے لازم اور عربی زبان کا بولنا اور لکھنا

عورتوں کا برقعہ استعمال کرنا یہ تمام چیزیں ممنوع قرار دی گئیں۔

اس پر ہی بس نہیں۔ مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نام بھی بدل لیں۔ چنانچہ امیر شکیب ارسلان نے حاضر العالم الاسلامی کی جلد ثانی کے شروع میں اسپین کے بہت سے محلوں اور مختلف جگہوں کے اسپینی نام بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ یہ تمام نام دراصل عربی نام تھے اور عربوں کے بڑے بڑے سرداروں سے منسوب تھے لیکن چونکہ وہ جبراً عیسائی بنالئے گئے یا ان کے نام بدل دیئے گئے اس بنا پر اُن کے اصل عربی ناموں کی صورت بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مسلمان مورخین کے علاوہ خود یورپین مورخین نے ان مظالم کو تفصیل کے ساتھ تاریخی ترتیب سے بیان کیا ہے۔

تمدنِ عرب کا مشہور مصنف موسیو لیبان کہتا ہے کہ اندلس کے غریب مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حالانکہ یہی وہ مسلمان تھے جنھوں نے اپنے اقتدار اور حکومت کے زمانہ میں عیسائیوں پر کبھی اس قسم کے ظلم نہیں کئے، اگر وہ ایسا کرنے پر آجاتے تو آج پورا جزیرہ نمائے اسپین عیسائیوں کے نام و نشان اور ان کے وجود سے یکسر خالی ہو جاتا۔

پندرہویں صدی کے آخر میں اندلس کے لارڈ بشپ مینڈوزا کے انتقال کے بعد فرانسکو شیمنس ڈی سیزوز اس عہدہ پر مقرر ہوا۔ یہ کس درجہ متعصب شخص تھا؟ مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں "اس شخص کے حالاتِ زندگی، اس کی صحبت اور اس کی تعلیم نے اس کو اس زمانہ کی تنگ دلی، تعصب اور غیر مساحت کا پورا نمونہ بنا رکھا تھا ...... نہ اس میں بردباری تھی نہ نرمی، نہ انسانی ہمدردی، وہ صرف یہ جانتا تھا کہ آدمی کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے کلیسا کا تابع فرمان ہو جائے" لیکن ساتھ ہی اس کی اخلاقی حالت کیا تھی؟ مسٹر اسکاٹ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں "اخلاق کے لحاظ سے وہ اپنے زمانہ کی تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس کی منظورِ نظر عورتیں عمائدِ سلطنت کے گھرانوں کی تھیں یا امرار کی بیٹیاں یا ملکہ کی خواصیں پوپ انوسنٹ ہشتم

نے ۱۴۹۲ء میں اور ملکہ ازبلا نے ۱۴۸۰ء میں اس کے (شیمنس کے) تین حرام کے بیٹوں کو جائز اولاد قرار دیا۔ شدید تعصب اور اخلاقی فرومائگی کے باوصف اس زمانہ میں چونکہ سلطنت کا نظام اور قانون جو کچھ بھی تھا کلیسا کی زبان تھا اس بنا پر شیمنس کو بھی امور سلطنت میں اس درجہ درخور اور عمل دخل تھا کہ گویا اسپین کا بادشاہ وہی تھا۔ اس صورت میں مسلمانوں کے ساتھ جتنے بھی مظالم ہوتے کم تھے چنانچہ اس سلسلہ میں اس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اس نے محکمۂ کلیسا سے ایک فرمان حاصل کیا۔ جس کی رو سے وہ مسلمانوں کے متعلق مذہبی تفتیش جس طرح چاہتا کرتا اور انھیں سزا دیسکتا تھا مسٹر اسکاٹ نے اس شخص کے مظالم کی زہرہ گداز داستان تفصیل سے لکھی ہے اس کو بعینہ نقل کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ ہے۔ اس لئے ہم ذیل میں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

اندلس کی حکومت سے بالکل بے دخل ہو جانے کے بعد مسلمان بہت زیادہ تعداد میں مسجد البیسن کے گرد و نواح میں جا رہے تھے انھیں میں سے چار ہزار مسلمانوں کو یہ کہکر بپتسمہ دیا گیا کہ یہ لوگ اپنے مذہب (اسلام) سے بیزار تھے۔ اس مسجد کو گرجا بنایا گیا۔ ان لوگوں پر جو جبراً عیسائی بنائے گئے تھے اس درجہ قدغن تھی کہ وہ بے اختیاری میں بھی کوئی فعل خلاف عیسائیت نہیں کر سکتے تھے۔ غرناطہ کے جن مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو ان کے ارتداد پر برا بھلا کہا ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ انھیں قید و بند کی سزا دی گئی۔

کتابوں کا جلانا | اب اس نے مسلمانوں کے علمی و ثقافتی کارناموں کے مٹانے کی طرف توجہ کی چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے غرناطہ کے تمام گھروں کی تلاشی لی اور زبانِ عربی کی جتنی کتابیں بھی اس کو جہاں کہیں ملیں اس نے ان سب کو ضبط کر لیا۔ اس ترکیب سے قریباً دس لاکھ کتابیں جمع ہو گئیں۔ ان میں نہ صرف قیمتی جلدیں قرآن شریف کی ہی تھیں بلکہ زمانۂ دولتِ بنی امیہ کی وہ کتابیں بھی تھیں جو دار السلطنت قرطبہ کی مایۂ فخر و ناز تھیں اور نسلاً بعد نسلٍ بے بہا جواہرات سمجھی جاتی تھیں۔ عام کتاب خانوں میں وہ کتابیں تھیں جن کی حفاظت و اضافہ کو تمام سلاطین غرناطہ اپنا اولین فرض سمجھتے رہے تھے۔ تاریخ اور سائنس کے وہ رسائل جو تمام واقعات پر مشتمل تھے اور مسلمانوں کی دماغی

زرقیات کی تصویریں تھے۔ ان کے علاوہ ادب اور فلسفہ، علمِ نباتات، علمِ ہیئت اور علمِ طب کی کتابیں بھی ان میں ہی تھیں۔ یہی وہ علوم تھے جن پر اندلسی مسلمانوں نے بہت توجہ اور محنت کی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ ان کتابوں میں زمانۂ قدیم کی کتابوں کے تراجم بھی ہوں گے جو ایک زمانہ میں سکندریہ کے یونانی کتاب خانوں کی زینت رہے ہوں گے۔ یہ تراجم کی کتابیں دریائے نیل کے دور دراز سواحل سے جزیرہ نمائے اندلس میں پہنچی تھیں اور بلحاظ خوبی تحریر و کتابت و زیبائش مسلمانوں کی شان و شوکت، تکلف اور جاہ و جلال کا پورا نمونہ تھیں۔ اور سونے چاندی اور مختلف رنگوں سے ان کا ہر صفحہ مزین تھا۔ بعضوں کی جلدیں مرصع چمڑے کی تھیں۔ بعض پر مختلف الالوان کام تھا بعض پر کچھوے کی ہڈی، سیپ، ہاتھی دانت اور جواہرات لگے ہوئے تھے اور ان کے کنارے خالص سونے کے تھے۔

علوم و فنون کے یہ بے بہا خزانے باب الرملہ کے چوک میں لاکر ڈھیر کئے گئے اور ان کو آگ لگا کر راکھ کر دیا گیا۔ مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس وحشیانہ مذہبی جوش سے جو نقصان دنیا کو پہنچا اس کا ادنیٰ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالباً دنیا بھر میں ایسا قیمتی ذخیرۂ علوم و فنون کہیں نہ ہو گا جس کو شمنس نے اس تاریخی چوک میں خاک سیاہ کر دیا۔ اس وحشیانہ فعل سے مالی نقصان تو بہت ہوا ہی تھا مگر اس کا مہلک اثر جو سوسائٹی پر پڑا وہ بالکل ناقابلِ بیان ہے اس سے وہ یگانۂ روزگار علمی یادگاریں تباہ ہو گئیں جن کا بدل ناممکن ہے، گھڑی بھر میں اس نے صدیوں کا جمع کیا ہوا وہ بیش بہا خزانہ خاکِ سیاہ کر دیا جس سے زمانۂ حال کے مورخ مسلمانانِ اندلس کی تہذیب کے متعلق ایسے مآخذ پیدا کر سکتے تھے جن کا علمی دنیا میں اب پتہ لگنا بالکل ممکن نہیں ہے۔ [1]

خود یورپ کے مورخین کا اندازہ ہے کہ شمنس کے حکم سے صرف غرناطہ میں جو کتابیں جلا کر خاک بھسم کی گئیں ان کی تعداد اسی ہزار تھی[2]۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اور بلادِ اندلس میں جو

[1] اخبار الاندلس ج ۳: [2] بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیہ ج ۱ ص ۱۵۲ و ۲۵۳۔

کتابیں جلائی گئیں اگر ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو نوبت کہاں تک پہنچتی ہے۔

زندہ آگ میں جلانا | پھر یہی باب الرملہ جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے مسٹر اسکاٹ لکھتے ہیں کہ اسی جگہ کے مشہور و معروف چوک ہیں جہاں ہزاروں مردانہ کھیل ہوا کرتے تھے اور جہاں شیمنس نے مسلمانوں کے علوم کو سپردِ آتش کیا تھا وہیں مجرم مسلمانوں سے آخری عبادت کفارہ کرا کر سب کو زندہ جلا دیا گیا[1]

قتلِ عام | استاذ کرد علی متعدد مغربی مورخین و محققین کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ "۱۴۹۹ء سے جبر و تشدد اور عام ظلم و ستم کا عہد شروع ہو گیا۔ اہلِ اسپین عربوں کے بچوں کو پکڑ لیتے تھے اور انھیں جبراً عیسائی بنا لیتے تھے اور اس کے لئے عذر یہ کرتے تھے کہ یہ لوگ ابتداءً عیسائی ہی تھے ان کو محکمۂ تفتیش مذہبی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان بدنصیبوں میں سے جن کو جلایا جا سکتا تھا انھیں جلا دیتے تھے۔ لیکن چونکہ کئی لاکھ انسانوں کو نذرِ آتش کر دینا آسان کام نہیں تھا اس لئے لارڈ بشپ نے سرزمینِ اندلس کو عربوں کے وجود سے بالکل پاک و صاف کر دینے کے لئے یہ تجویز کی کہ جو عرب دینِ مسیحی اختیار نہ کریں وہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور یا بچے بہرحال ان سب کو قتل کر دیا جائے۔

فرانس کا مشہور انقلابی مصنف والٹیر کہتا ہے "جب عربوں نے اسپین فتح کیا تو انھوں نے یہاں کے ایک عیسائی کو بھی اسلام اختیار کر لینے پر مجبور نہیں کیا۔ لیکن یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ جب عیسائیوں کا اس ملک پر قبضہ ہو گیا تو شیمنس نے تمام عربوں کو عیسائی کر لینا چاہا اور اس سلسلہ میں اس نے پچاس ہزار مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ ایک ایسے مذہب کا نشان (صلیب) لگائیں جن پر وہ ایمان نہیں لائے تھے۔

۱۵۶۶ء میں یہ حکم جاری ہوا کہ مسلمان عربی زبان کا استعمال اور اپنے شعائر کو ترک کر دیں اور اپنا لباس بھی نہ پہنیں ان مصائب سے تنگ آکر مسلمانوں نے غرناطہ اور البشرات میں بغاوت کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی سال تک جنگ ہوتی رہی۔ آخر کار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ۱۶۰۲ء میں

---

[1] اخبار الاندلس ج ۳ ص ۲۲۵۔

اعلان عام ہو گیا کہ مسلمان سرزمین اندلس کو بالکل خالی کر دیں۔ چنانچہ دو سال کی مدت میں تقریباً پانچ لاکھ مسلمانوں نے اس ملک کو خیرآباد کہدیا ور زیادہ تر افریقہ میں اور بعض اور ملکوں میں جہاں ان کو پناہ ملی چلے گئے۔ مورخین مغرب کا اندازہ ہے کہ فرڈیننڈ کے غرناطہ پر تسلط سے لیکر اس آخری حکم جلاوطنی تک جن لوگوں نے اسپین کو چھوڑا ان کی تعداد تیس لاکھ ہے لیکن ایک مورخ کا بیان ہے کہ افریقہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں میں سے ۳/۴ مسلمان وہ تھے جن کو راستہ میں ہی قتل کر دیا گیا اور وہ غریب منزلِ مقصود تک پہنچ بھی نہ سکے۔ بہر حال سترہویں صدی عیسوی کے شروع میں مسلمانوں کا اسپین سے بالکل خاتمہ ہو گیا۔[۱]

" سدا رہے نام اللہ کا "

---

[۱] بحوالہ الاسلام والحضارۃ العربیۃ ج ۱ ص ۲۵۲ و ۲۵۳۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت

اور

اُس کا زوال

دنیا کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں، اُن میں ہندوستان کی اسلامی حکومت کی تاریخ بھی نہایت اہم اور عبرت انگیز ہے۔ وہ اس سرزمین پر کم و بیش آٹھ سو سال تک حکمراں رہے لیکن پھر انقلاب کی بادِ تیز و تند کا ایک ایسا جھونکا آیا جس نے ان کی شمعِ اقبال کو اس ملک میں بالکل خاموش کر دیا اور آج تک وہی عالم باقی ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کی تاریخِ عروج و زوال کا ایک عام جائزہ لیتے ہوئے ضروری ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و زوال پر بھی ایک سرسری نگاہ کرتے چلیں۔

یوں تو ہندوستان پر مسلمانوں کے بحری حملے حضرت عمرؓ کے زمانہ سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ چنانچہ بحرین کے گورنر عثمان بن ابی العاصؓ نے عمان کے راستہ ساحل ہند کی طرف ایک لشکر روانہ کیا جو بمبئی کے علاقہ میں تانہ (تھانہ) تک آیا۔ لیکن بعد میں حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور عثمان کو لکھا کہ اگر اس مہم میں بڑھ

کے مسلمانوں کو نقصان پہونچ جاتا تو بس اُس کا بدلہ تیری قوم سے لیتا۔ علاوہ بریں عثمان نے اپنے بھائی الحکم کو بھڑوچ اور دوسرے بھائی مغیرہ کو دیبل بھی بھیجا تھا، جہاں ان کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی اور کامیاب بنے۔ پھر جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور عبداللہ بن عامر کو عراق کا گورنر مقرر کیا تو آپ نے اُن کو لکھا کہ ہندوستان کسی ایسے شخص کو بھیجو جو اُس کے حالات سے واقف ہو اور وہاں کی خیر خبر لے کر آئے، عبداللہ بن عامر نے اس کام کے لیے حکیم بن جبلہ العدوی کو چُنا۔ چنانچہ جب وہ ہندوستان سے واپس آئے تو انہیں دربارِ خلافت میں روانہ کر دیا گیا۔ یہاں حکیم بن جبلہ نے حضرت عثمانؓ سے ہندوستان کے حالات کچھ اس طرح بیان کیے کہ آپ نے کسی لشکر کو اس طرف بھیجنا مناسب خیال نہیں کیا۔[۱]

اس کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی خلافت کے زمانوں میں بھی سندھ کی سرحد پر مکران اور قیقان بلکہ بنوں اور لاہور تک اسلامی دستوں کے آنے اور جنگ کرنے کے واقعات کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کو صرف ایک طرح کی چھیڑ چھاڑ ہی کہا جا سکتا ہے۔ باقاعدہ حملہ اور فتح خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں مشہور اسلامی جرنیل محمد بن قاسم کے زیر قیادت ہوئی۔

محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ

اس حملہ کی کیفیت اور اس کے اسباب کی تفصیل یہ ہے کہ سندھ کا راجہ داہر پہلے سے ہی مسلمانوں سے بڑا بیر رکھتا تھا۔ چنانچہ جن عربوں نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کیا تھا راجہ داہر نے انہیں اپنے ہاں پناہ دے کر اپنے تعصب پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ لنکا کے راجہ نے جو مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے کا خواہشمند تھا، عراق کے مشہور اموی گورنر حجاج بن محمد بن یوسف الثقفی کے لیے چند جہاز روانہ کیے جو نوع بنوع تحائف و ہدایا سے لدے ہوئے تھے اور جن میں حاجی مسلمانوں کے علاوہ اُن عرب تاجروں کی عورتیں اور بچے بھی سوار تھے جو لنکا میں انتقال کر گئے تھے۔ اتفاقاً یہ جہاز دیبل[۲] پہونچ گئے جو راجہ داہر کے ماتحت تھا۔ یہاں بحری ڈاکوؤں نے ان جہازوں کا تمام

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری باب فتوح السند [۲] یہ ٹھٹھہ کے جنوب مغرب کی طرف چوبیس میل کے فاصلہ پر ایک بندرگاہ تھی

مال و اسباب لوٹا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ حجاج کو اس کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوا اور اُس نے داہر کو لکھا کہ گرفتار شدہ عورتوں، بچوں، اور مردوں کو فوراً رہا کر دے اور جو سامان لُوٹ لیا گیا ہے وہ ڈاکوؤں سے چھین کر ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ داہر نے جواب دیا یہ سب کچھ دریائی ڈاکوؤں کا کیا کرایا ہے۔ میرا ان پر کچھ بس نہیں ہے۔ داہر کی اسلام دشمنی تو پہلے سے ہی ظاہر تھی اس جواب نے حجاج کو اور برافروختہ کر دیا اور اب اُس نے پکا ارادہ کر لیا کہ سندھ کو فتح کر کے راجہ کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

چنانچہ اب اُس نے دربارِ خلافت سے اجازت لے کر عبیداللہ بن نبہان کو ایک لشکر کے ساتھ دیبل روانہ کیا لیکن ان کو کامیابی نہ ہوسکی اور قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد حجاج نے بدیل بن طہفہ البجلی کو دیبل روانہ کیا لیکن بدقسمتی سے ان کا گھوڑا بدک کر بھاگا تو دشمنوں نے انہیں گھیر لیا اور قتل کر دیا۔ اب حجاج نے اپنے نوجوان چچازاد بھائی اور داماد محمد بن قاسم کو، جو اس وقت ایران میں مقیم تھا اس خدمت کے لیے چُنا اور بڑے ساز و سامان اور ایک لشکرِ گراں کے ساتھ جس میں چھ ہزار شامی اور دوسرے لوگ تھے سندھ کی مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔

محمد بن قاسم روانہ ہو کر پہلے مکران آیا۔ چند روز یہاں قیام کرنے کے بعد روانہ ہوا اور قنز بور پہونچا۔ پھر اس کو فتح کر کے آگے بڑھا اور ارمائیل آیا اس کو سر کرنے کے بعد دیبل کا رُخ کیا جو ٹھٹھہ سے جنوب مغرب کی جانب چوبیس میل کے فاصلہ پر ایک بندرگاہ تھی۔ یہ مقام راجہ داہر کے زیرِ نگیں تھا۔ محمد بن قاسم خود خشکی کے راستہ سے آیا تھا۔ لیکن ایک بڑا لشکر کثیر ساز و سامان کے ساتھ بحری راستہ سے بھی آ رہا تھا۔ دیبل میں ان دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ یہاں پہونچ کر اسلامی لشکر نے اپنے جھنڈے نصب کر دیئے اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ دیبل میں ایک بڑا مندر تھا۔ جس پر ایک اونچی لاٹ میں سرخ جھنڈا لگا ہوا تھا۔ یہ پھریرا اتنا بڑا تھا کہ مورخ بلاذری کے بیان کے مطابق جب ہوا چلتی تھی تو گھومنے لگتا تھا اور شہر کو محیط ہو جاتا تھا۔ محمد بن قاسم نے

اس لاٹ کو اس طرح منہدم کیا کہ ایک منجنیق جس کو پانسو آدمی کھینچتے تھے اُس کو ایک جگہ نصب کر دیا گیا اور مشرقی جانب سے اُس کا ایک پایہ نکلوا دیا۔ اب منجنیق ٹیڑھی اور ترچھی ہوگئی تو محمد بن قاسم نے اُس کے انچارج کو منجنیق کے سر کرنے کا حکم دیا۔ نشانہ ٹھیک جا کر لگا اور لات ٹوٹ گئی۔ اس واقعہ نے راجہ داہر اور اُس کے تمام ساتھیوں کو حد درجہ مشتعل اور غضب ناک کر دیا۔ چنانچہ ان لوگوں نے میدانِ جنگ میں پہونچ کر خوب دادِ شجاعت دی۔ لیکن آخر کار انہیں شکست فاش ہوئی اور دیبل بزورِ شمشیر فتح کر لیا گیا۔ فتح کے بعد اسلامی لشکر نے اسلام کے مقرر کیے ہوئے احکام وضوابط کی پابندی کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا۔ بلاذری میں ہے کہ فتح کے بعد محمد بن قاسم نے تین روز تک یہاں مقیم رہ کر قتلِ عام جاری رکھا اور انتہا یہ ہے کہ مندر کے پجاریوں تک کو بھی اس عموم سے مستثنیٰ نہیں رکھا گیا۔

دیبل کی فتح نے دشمنوں کی ہمت اتنی پست کر دی کہ اس کے بعد محمد بن قاسم نے قلعۂ نیرون اور سہوان وغیرہ جس کسی مقام کا رخ کیا جنگ کیے بغیر ہی اسے فتح کر لیا۔ یہاں تک کہ جب وہ مہران پہونچا تو اب راجہ داہر نے بڑے پیمانہ پر جنگ کی تیاری کی۔ اُدھر محمد بن قاسم نے محمد بن مصعب کی قیادت میں سدوسان کی طرف ایک لشکر روانہ کر دیا۔ یہاں کے لوگ اتنے خوف زدہ تھے کہ چند پجاریوں کے واسطہ سے انہوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور اس طرح یہ علاقہ بھی جنگ کے بغیر ہی مفتوحات میں شامل ہو گیا۔ محمد بن مصعب جب اس مہم سے واپس آیا تو اُس کے ساتھ چار ہزار جاٹ بھی تھے جو سب کے سب محمد بن قاسم کی فوج میں شریک ہو گئے۔ اب اسلامی فوج کے سپہ سالار اعظم محمد بن قاسم نے تلہٹ کے پاس سے دریائے سندھ کو عبور کر کے دار السلطنت کا رخ کیا۔ ادھر راجہ داہر کو اس کی اطلاع ہوئی تو بڑے ساز وسامان کے ساتھ اُس نے ایک لشکر روانہ کیا۔ کولاب کچیری کے مقام پر دونوں کی معرکہ آرائی ہوئی جس میں داہر کی فوج کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اب محمد بن قاسم نے شہر الور کا ارادہ کیا۔ جہاں داہر قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہا تھا اور جاتے ہی قلعہ کا محاصرہ

کرلیا۔[1] یہ محاصرہ دس روز تک رہا۔ اس مدت میں سات مرتبہ لڑائی ہوئی اور ہر بار اسلامی فوج کو شان دار کامیابی حاصل ہوئی۔ آخر کار جمعرات کے دن ۱۰ ماہ رمضان المبارک ۹۳ھ کو راجہ داہر خود قلعہ سے اس تزک و احتشام کے ساتھ نکلا کہ اُس کے جلو میں دس ہزار جوشن بند سوار اور تیس ہزار پا پیادہ سپاہی تھے۔ ان کے علاوہ لشکر میں کوہ پیکر ہاتھیوں کا بھی ایک دستہ تھا جو مست و خرامان میدانِ جنگ میں چلتے تھے تو زمین دہل جاتی تھی۔ ایک ہاتھی پر جو خاص اہتمام سے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا عماری میں خود داہر سوار تھا۔ کہتے ہیں اس وقت اس کے پہلو میں دو پری چہرہ لونڈیاں بھی تھیں جن میں ایک اسے شراب کا جام پیش کرتی تھی اور دوسری پان کا بیڑہ دیتی تھی۔[2]

اب دونوں طرف فوجیں صف آرا ہوئیں اور جنگ کا آغاز ہوا۔ دن بھر بڑے گھمسان کا رن پڑا رہا۔ داہر کی فوج اپنی طاقت و قوت اور ساز و سامان کی کثرت کے گھمنڈ میں آگے بڑھ بڑھ کر بے پناہ حملہ کرتی تھی لیکن اُس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا لشکر تھا کہ پتھر کی چٹان بنا کھڑا تھا اور وہ دشمن کے ہر حملہ کو پسپا کر دیتا تھا۔ آخر کار جب شام ہونے لگی تو محمد بن قاسم ایک دستۂ فوج کو ساتھ لے کر خود اُس لشکر کی جانب بڑھا جو ہاتیوں کے سامنے تھا۔ اسی اثنا میں مسلمانوں کے ایک دستہ نے آتش بازی چھوڑنی شروع کر دی جس سے تمام ہاتھی بدک کر بھاگے اور اس طرح دشمن کی افواج میں سخت سراسیمگی اور ابتری پیدا ہو گئی۔ اسی ہنگامہ میں مسلمانوں کی طرف سے داہر کے گلے میں ایک ایسا تیر آکر لگا جس نے اسی وقت اُس کا خاتمہ کر دیا۔[3] داہر کے قتل کے بعد شکست خوردہ لشکر برہمن آباد (بہمن آباد) چلا گیا تھا۔ محمد بن قاسم نے وہاں تک اُس کا تعاقب کیا اور آخر کار جنگ کے بعد اسے بھی فتح کر لیا۔ اب پورا سندھ اسلامی علم حکومت کے زیرِ سایہ آچکا تھا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر محمد بن قاسم نے ملتان کا ارادہ کیا جسے اُس زمانہ میں دولت و ثروت

---

[1] یہ بیان سید محمد معصوم کا ہے۔ تاریخ معصومی ص ۲۲۔ لیکن چچ نامہ کا بیان ہے کہ داہر قلعہ راور میں تھا۔

[2] تاریخ معصومی ص ۲۲ [3] ایضاً۔

کی افراط کے باعث "بیت خرج الذہب" (سونے کا گھر) کہا جاتا تھا اور جہاں ایک بڑا بت خانہ بھی تھا۔ مسلمانوں کو اس جنگ میں بڑے شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ اُن کا سامانِ رسد ختم ہو گیا تو گدھے کھا کھا کر گذر اوقات کی۔ لیکن باایں ہمہ وہ بڑی پامردی اور ثابت قدمی و استقلال سے لڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اس مہم کو بھی سر کر لیا۔[1]

محمد بن قاسم کا انجام

محمد بن قاسم نے سندہ اور ملتان کو فتح کر کے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا۔ وہ کسی طرح موسیٰ بن نصیر اور طارق کے فتح اندلس سے کم اہم نہیں تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر اس وقت خلافت کے تخت پر کوئی خلیفۂ راشد متمکن ہوتا اور مسلمان خاندانی اور قبائلی عصبیت کا شکار نہ ہو گئے ہوتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ آج ہندوستان بھی مصر، شام اور عراق و فلسطین کی طرح اسلامی ملک نہ ہوتا۔ محمد بن قاسم کو ابھی ہندوستان آئے چار برس بھی نہ ہوئے تھے کہ ولید بن عبدالملک کا ۹۶ھ میں انتقال ہو گیا اور اُس کا بھائی سلیمان خلیفہ ہوا۔ سلیمان بعض معاملات کی وجہ سے حجاج کا دشمن تھا۔ اب اُس نے با اختیار ہوتے ہی حجاج کے عزیزوں قریبوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ جیسا کہ گذر چکا ہے محمد بن قاسم حجاج کا چچیرا بھائی اور داماد تھا۔ اس بنا پر وہ بھی سلیمان کے جذبۂ انتقام کی زد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ سلیمان نے عنانِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی یزید بن ابی کبشہ کو سندہ کا گورنر مقرر کیا اور محمد بن قاسم کو صرف یہی نہیں کہ اس منصب سے معزول کر دیا بلکہ حکم دیا کہ اُس کو پابزنجیر لایا جائے۔ عراق پہونچنے پر یہاں کے گورنر صالح بن عبد الرحمٰن نے دربارِ خلافت کے ایما سے اسے شہر واسط میں محبوس کر دیا اور آخر کار طرح طرح کی تکلیفیں دینے کے بعد آلِ ابن عقیل کے ایک گروہ کے ساتھ نوجوان فاتح سندھ کو بھی قتل کر دیا گیا۔[2]

عام تاریخی بیانات کے مطابق محمد بن قاسم نے سندہ اور ملتان کی لڑائیوں میں دشمن کے ساتھ جبر و تشدد اور سخت گیری کا معاملہ کیا تھا۔ لڑائی کے ختم اور کامیابی حاصل کر لینے کے بعد

---

[1] فتوح البلدان۔ ص ۴۲۷ [2] ایضاً۔ ۴۲۸

بھی اُس نے کئی کئی دن تک قتلِ عام جاری رکھا۔ مندروں اور بُت خانوں کو مسمار کیا، پجاریوں اور پنڈتوں کو تہ تیغ کیا۔ لیکن اُس کا یہ فعل وقتی اور ہنگامی تھا اور اُس وقت تک کے لیے تھا جب کہ امن وامان کا باقاعدہ اعلان ہو۔ اس کے بعد اُس نے مفتوحہ اقوام کے ساتھ جو معاملہ کیا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلیمان بن عبدالملک کے حکم سے جب اسے پابزنجیر کرکے سندھ سے واپس بلایا گیا ہے تو یہاں کے لوگ روتے تھے اور اپنی عقیدت و محبت کی یادگار کے طور پر انھوں نے محمد بن قاسم کا مجسمہ کیرج میں بنا کر رکھا۔[1]

ڈاکٹر تاراچند سندھ کے راجہ چچ اور محمد بن قاسم دونوں کے نظم سلطنت اور طرزِ حکومت کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> چچ (داہر کا باپ) متعصب فرماں روا تھا اُس نے بُدھ مذہب کے پیروؤں کے لیے نہایت ظالمانہ قوانین جاری کیے تھے۔ ان لوگوں کو ہتیار بند ہونے۔ ریشمین کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین لگا کر سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔ علاوہ بریں اُس نے حکم دے رکھا تھا کہ یہ لوگ برہنہ پا اور برہنہ سر کتوں کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا کریں۔"

اس کے برخلاف محمد بن قاسم کی نسبت وہ لکھتے ہیں۔

> "مسلمان فاتحوں نے مفتوحوں کے ساتھ ہوشیاری اور کرم گستری کا معاملہ کیا۔ مال گذاری کا پرانا نظم باقی رکھا گیا۔ پرانے ملازم اپنی ملازمتوں پر بدستور قائم رہے۔ ہندو پجاریوں اور برہمنوں کو مندروں میں پوجا پاٹ کرنے کی عام اجازت تھی۔ اور ان کو صرف ایک ہلکا سا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا جو اُن کی آمدنی کے مطابق تھا۔ مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قاضی کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کے لیے اُن کی پنچایتیں الگ تھیں جو اُن کے معاملات فیصل کرتی تھیں۔ بہت سے بڑے عہدوں پر ہندو فائز تھے۔ یہاں تک کہ وزارتِ عظمیٰ پر راجہ داہر کا وزیر ہی سرفراز تھا۔"

---

[1] فتوح البلدان۔ ص ۴۴۸۔

سندھ کے راجاؤں کا قبولِ اسلام

محمد بن قاسم کے بعد یزید بن ابی کبشہ سندھ کا گورنر مقرر ہوا۔ لیکن ابھی اس کو یہاں آئے اٹھارہ دن ہی ہوئے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ اب حبیب بن المہلب کو سندھ کا گورنر مقرر کیا گیا۔ لیکن اس کے سندھ پہونچتے پہونچتے یہاں کے راجا مہاراجا اپنے اپنے علاقوں پر از سرِ نو قابض ہو چکے تھے۔ چنانچہ داہر کا بیٹا جیسنہ برہمن آباد واپس آگیا تھا۔ اسی اثنا میں سلیمان بن عبد الملک کا انتقال ہو گیا اور حضرت عمر بن عبد العزیز (از ۹۹ھ تا ۱۰۱ھ) سریر آرائے خلافت ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت، خلافتِ راشدہ کے منہاج پر تھی اور فتوحات کا مقصد ملک گیری اور دولت اندوزی نہ تھا۔ اس بنا پر آپ نے راجگانِ ہند (سندھ) کو تبلیغی خطوط لکھے اور اُن کو اسلام قبول کر لینے کی دعوتِ عام دی۔ ان لوگوں کو خلیفہ اسلام کے اخلاق وعادات کی اطلاع پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اس بنا پر ان میں سے متعدد راجاؤں نے جن میں داہر کا بیٹا جیشہ بھی تھا اس دعوت پر لبیک کہا اور اپنے نام بھی عربی ہی رکھ لیے[1]۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد باقی خلفائے بنی امیہ کے عہد میں بھی خلافت کی طرف سے گورنر مقرر ہو ہو کر سندھ آتے رہے۔ لیکن کوئی غیر معمولی اور قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ ہشام بن عبد الملک (۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ) کے عہد میں جنید بن عبد الرحمٰن المری سندھ کا گورنر ہوا۔ یہ بڑا حوصلہ مند، باہمت اور فیاض طبع تھا اس نے سندھ کا معقول بندوبست کر کے دوسرے علاقوں کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اُس نے ایک لشکر اجین اور ایک لشکر حبیب بن مرہ کی سرکردگی میں مالوہ کی طرف روانہ کیا۔ علامہ بلاذری کے بیان کے مطابق ان

[1] فتوح البلدان ص ۴۲۹۔

دونوں جنگوں سے مالِ غنیمت تو بہت کچھ حاصل ہوا لیکن غالبًا ان کو فتح نہیں کیا جا سکا۔ آخری اموی گورنر منصور بن جمہور الکلبی تھا جو مروان الحمار (از ۱۲۷ھ تا ۱۳۲ھ) کے عہد میں سندھ آیا اور کہا جاتا ہے کہ یہاں کا مشہور شہر منصورہ اسی کا آباد کیا ہوا تھا۔ منصور کے عہد گورنری میں اموی خلافت کا خاتمہ ہوگیا اور اب (۱۳۲ھ میں) عباسی برسر اقتدار آئے تو ان کی طرف سے سندھ کے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے۔

سندھ خلافتِ عباسیہ میں

ان گورنروں میں سب سے زیادہ باحوصلہ ہشام بن عمرو التغلبی تھا۔ جو ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کے عہد میں سندھ کا گورنر مقرر ہوا تھا اس نے یہاں پہونچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جو علاقے فتنہ پردازوں کی فساد انگیزی کے باعث مسلمانوں کے قبضہ سے نکل گئے تھے اُن پر دوبارہ قبضہ کیا۔ پھر کشتیوں کا ایک بیڑا لے کر بھروچ کے قریب کندھار نامی ایک جگہ پر حملہ آور ہوا۔ یہاں سے بجانب شمال پلٹا تو کشمیر پر دھاوا بول آیا اور یہاں اُسے بہت کچھ مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔[2]

مامون رشید کے زمانہ تک سندھ میں عرب مسلمانوں کا وقار قائم رہا۔ معتصم باللہ کے عہد میں ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور نزاریوں اور یمنیوں میں عصبیتِ جاہلیہ کی آتشِ خانماں سوز بھڑک اٹھی اس زمانہ میں عمران بن موسیٰ سندھ کا گورنر تھا۔ عمران کا میلان یمنی عربوں کی طرف تھا اس پر نزاری اس سے ناراض تھے ہی اب یہاں کے موروثی خاندان ہباری کو پھر اُبھرنے کا موقع ملا چنانچہ ایک روز عمر بن عبدالعزیز الہباری نے موقع پا کر عمران کا خاتمہ کر دیا اس کے بعد واثق باللہ اور متوکل کے زمانہ میں بھی دربارِ خلافت کی طرف سے سندھ کے گورنر مقرر ہو کر آتے رہے لیکن اب اس دور افتادہ ملک کا خلافت سے تعلق محض برائے نام رہ گیا تھا۔

۲۴۰ھ میں ہباری خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔ ۲۹۰ھ میں ملتان کے ایک

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۳۰ - ۴۳۱ [2] ایضاً ص ۴۳۱

خاندان بنو سامہ نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اب ملتان اور منصورہ دو آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو گئے۔

بہرحال امیر محمد بن قاسم نے پہلی صدی ہجری کے اواخر میں صحرائے سندھ میں جو پودا لگایا تھا اُس کی شاخیں ملتان تک ہی دراز ہو کر رہ گئیں اور باہمی نااتفاقی اور بدانتظامی کی بادِ سموم نے اسے بھی آخر کار خشک کر دیا۔ البتہ درۂ خیبر کے راستہ سے اسلام کا جو سرچشمۂ فیض ہندوستان میں داخل ہوا اُس نے دور دور تک کے علاقوں کو سیراب کیا اور تقریباً آٹھ سو سال تک اُسی کے اثرات قائم رہے۔

امیر سبکتگین شمالِ مغربی ہند کے راستہ سے اسلام کا جو سب سے پہلا قافلہ ۳۶۰ھ کے لگ بھگ اس ملک میں داخل ہوا اُس کے میر کارواں ہونے کا فخر دولتِ غزنویہ کے فرماں روا امیر سبکتگین کی قسمت میں لکھا تھا۔ اس آمد کی تقریب بھی خودیاں کے راجہ جے پال کے عمل سے پیدا ہوئی جو پنجاب اور کابل و پشاور کا حکم راں تھا۔ غالباً امیر سبکتگین کے جذبۂ جہاد سے خوف زدہ ہو کر پیش بندی کے خیال سے کوہ پیکر ہاتھیوں اور ایک لشکر جرار کے ساتھ ۳۶۹ھ مطابق ۹۷۹ء کے اواخر میں اُس نے اسلامی سلطنت کی طرف پیش قدمی کی۔ امیر سبکتگین کو اس چڑھائی کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ مقابلہ کے لیے نکلا۔ برگز کی تحقیق[۱] کے مطابق طغان میں جنگ ہوئی۔ کئی روز کی مسلسل شدید معرکہ آرائی کے بعد جے پال نے صلح کی درخواست پیش کی اس معرکہ میں امیر سبکتگین کے ساتھ اُس کا نام ور فرزند محمود جو بعد میں سلطان محمود غزنوی کے نام سے معروف ہوا۔ خورد سالی کے باوجود شریکِ جنگ تھا۔ اُس نے صلح کی درخواست کو نامنظور کر دینے کی رائے دی۔ لیکن جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ راجپوت اپنی ضد اور آن کے بڑے پکے ہوتے ہیں اور اس بنا پر جب دیکھتے ہیں کہ جنگ میں شکست یقینی ہے تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیتے اور تمام مال و اسباب کو آگ لگا دیتے ہیں۔ تو اب محمود

[۱] دیکھو اردو ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد اول حواشی صفحہ ۱۰- از مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی۔

بھی صلح پر راضی ہو گیا۔ لیکن شرائط صلح میں جن چیزوں کا غزنین بھیجنا قرار پایا تھا۔ جے پال نے لاہور پہونچ کر اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ امیر سبکتگین کے آدمی جو جے پال کے ساتھ ان چیزوں کو لینے آئے تھے انہیں قید کر دیا اور اب یہ پیچ لگائی کہ "جب تک امیر میرے آدمیوں کو جنہیں میں بطور ضمانت رکھ آیا ہوں مجھے واپس نہ کرے گا میں عہدنامہ کی تعمیل نہ کرونگا"
امیر سبکتگین کو اس واقعہ کا علم ہوا تو اُسے بڑا طیش آیا اور ایک بھاری لشکر لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر جے پال نے دوسرے راجاؤں کی مدد سے ایک بہت بڑی فوج جمع کی۔ دہلی۔ اجمیر۔ کالنجر اور قنوج کے راجاؤں نے خاص طور پر فوج اور روپیہ سے دل کھول کر اس کی مدد کی تھی۔ پشاور کے قریب دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ یہ پہلی جنگ تھی جس میں شمالی ہند کے راجاؤں کی تمام فوجی طاقت ایک اسلامی فوج سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک مرکز پر سمٹ آئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جے پال کی ہمرکابی میں اس وقت ایک لاکھ سوار اور بے شمار پیادے تھے۔[1]

امیر نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر اس فوج کا جائزہ لیا تو اسے اس کی کثرتِ تعداد اور ساز و سامانِ جنگ کی غیر معمولی بہتات کے باوجود ذرا دل شکستگی نہ ہوئی اور اس نے نیچے اُتر کر فوجی سرداروں کے سامنے اس قدر پُرجوش اور ولولہ انگیز تقریر کی کہ تمام مجمع میں آگ سی لگ گئی۔ انہوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کے بعد جے پال سے دو ایک جھڑپیں اور ہوئیں۔ مگر اُن میں بھی اُسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کابل اور پشاور کا سارا علاقہ اسلامی مقبوضات میں شامل ہو گیا اور امیر اپنے ایک نائب کو دو ہزار سواروں کے ساتھ پشاور میں چھوڑ کر اور اس نواح کے افغانی اور خلجی صحرا نشینوں کو اپنا اطاعت گذار بنا کر غزنین واپس چلا گیا۔

تاریخ میں امیر سبکتگین کا نام اور اُس کا کام اتنا روشن نہیں ہوا جتنا کہ اُس کے بیٹے سلطان

---

[1] اردو ترجمہ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۵۶۔ از مولوی فدا علی صاحب۔ طالب۔

محمود غزنوی کا ہے۔ حالانکہ جہاں تک حقائق اور تاریخی واقعات کا تعلق ہے۔ باپ کے کارنامے اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے بیٹے کے کارناموں سے کسی طرح کم اہم نہیں۔ امیر سبکتگین پہلا فرماں روا ہے جس نے شمالی ہندوستان کے فوجی نظام اور یہاں کی متحدہ طاقت کو شکستِ فاش دے کر مسلمانوں کے لیے اس دروازہ سے آنے کی راہ نکالی۔ علاوہ بریں محمد قاسم فرشتہ نے متعدد واقعات لکھے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ امیر اخلاق و عادات اور مزاج و طبیعت کے لحاظ سے بڑا نیک، خدا پرست اور انصاف پسند تھا۔

وفات امیر ناصر الدین سبکتگین نے چھپن سال کی عمر میں بلخ کے قریب موضع ترمذ میں ۳۸۷ھ مطابق ۹۹۷ء میں وفات پائی اور غزنین میں دفن کیا گیا۔ امیر کی مدتِ حکومت کم و بیش بیس سال ہے۔

سلطان محمود غزنوی امیر سبکتگین کی وفات کے وقت اُس کا بڑا بیٹا سلطان محمود نیشاپور میں تھا۔ اس لیے مرحوم کی وصیت کے مطابق چھوٹا لڑکا امیر اسماعیل بلخ میں باپ کا جانشین ہوا۔ امیر اسمٰعیل نے تالیفِ قلوب کی بڑی کوشش کی لیکن فوج اور رعایا اُس کے قابو میں نہ آتی تھی۔ نیشاپور میں سلطان محمود کو ان واقعات کا علم ہوا تو اپنے چھوٹے بھائی کو لکھا "باپ کے انتقال کے بعد اب دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہے۔ لیکن قیامِ سلطنت اور انتظامِ مملکت کے لیے فرماں روا کو سن رسیدہ، تجربہ کار، اور صاحبِ سیاست ہونا چاہیے اگر تم میں یہ صفات ہوتیں تو میں تم سے زیادہ کسی اور کی اطاعت و فرماں برداری پر رضامند نہ ہوتا۔ باپ نے تم کو جو اپنا جانشین بنایا ہے تو اس کا منشا صرف مصلحتِ وقت اور ملک کی حفاظت تھا جو میری دوری کی وجہ سے اُس وقت اور زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ لیکن اب مصلحتِ وقت یہ ہے کہ نیک و بد میں امتیاز کرو۔ انصاف کو ہاتھ سے نہ دو اور جو کچھ باپ کا متروکہ ہے اسے شریعت کے مطابق تقسیم کر لو۔ غزنین جو ہماری حکومت کا سرچشمہ ہے وہ مجھے دیدو۔ تاکہ میں بلخ و خراسان کو تمہارے حوالہ کر دوں[1]۔"

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱۔ اردو ترجمہ ص ۶۳ - ۶۴۔

امیر اسماعیل پر اس خط کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر بھائی کی مخالفت اور اپنی ضد پر اڑا رہا محمود نے مجبور ہو کر لشکر کشی کی۔ دونوں بھائیوں میں معرکہ کارزار گرم ہوا جس میں اسماعیل کی فوج شکست کھا کر بے تحاشا بھاگی اور غزنین میں قلعہ بند ہو گئی۔ سلطان محمود نے ان سے عہد و پیمان کرنے کے بعد انہیں قلعہ سے نکالا۔ ملک کے خزانہ پر قبضہ کیا اور اپنے معتبر لوگوں کو وہاں کا عامل مقرر کر کے خود بلخ روانہ ہو گیا۔ چند روز کے بعد امیر اسماعیل کو جرجان کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔

پنجاب پر حملہ

سلطان محمود بچپن سے ہندوستان کو فتح کرنے کی آرزو رکھتا تھا چنانچہ اب اُس نے ترکستان و خراسان کی مہمات سے فارغ ہو کر ہندوستان پر فوج کشی کا عزم کیا اور ۱۰۰۱ء میں غزنین سے دس ہزار سواروں کا لشکر لے کر پشاور پہونچا۔ جے پال بھی غافل نہ تھا۔ ایک لشکرِ جرار کے ساتھ جس میں بارہ ہزار سوار تیس ہزار پیادے اور تین سو ہاتھی شامل تھے۔ مقابلہ کے لیے آگے بڑھا۔ دریائے اٹک کے کنارے شدید ترین معرکہ آرائی کے بعد آخر کار سلطان محمود کو فتح ہوئی اور جے پال اپنے چند عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ گرفتار ہو گیا۔ بعد میں سلطان نے اُس کو اپنا باج گذار بنا کر رہا کر دیا۔ جے پال اسلامی لشکر سے دو مرتبہ شکستِ فاش کھا چکا تھا اس لیے اُس زمانہ کے ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق وہ سلطنت کا اہل نہ تھا اور آگ کے سوا کوئی اور چیز اسے اس گناہ سے پاک نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے انند پال کو تخت و تاج کا مالک بنا کر خود نذر آتش ہو گیا۔

ملتان پر فوج کشی

ملتان کے قریب ایک ہندو راجہ کی راج دھانی تھی جس کا نام بھاٹیہ تھا۔ اس زمانہ میں یہاں کا حکمراں بجی رائے یا بیجرا رائے نامی بڑا مغرور و متکبر تھا۔ نہ سبکتگین کے ہندوستانی نائبوں کو نظر میں لاتا تھا اور نہ جے پال کی پوری اطاعت و فرماں برداری کرتا تھا۔ ۳۹۵ھ میں سلطان نے بھاٹیہ پر حملہ کیا کئی روز کی مسلسل لڑائی کے بعد راجہ کو شکستِ فاش ہوئی اور قتل کر دیا گیا۔ اس کے دوسرے سال سلطان نے ملتان کے حاکم ابوالفتح کو اس کی

سرکشی اور الحاد پروری کی سزا دینے کے ملتان پر فوج کشی کا ارادہ کیا۔ ابوالفتح کو اس کا علم ہوا تو اس نے انند پال سے مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ انند پال سلطان کا راستہ روکنے کے لیے لاہور سے پشاور آیا اب سلطان کے لیے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ پہلے انند پال سے ہی جنگ کی جائے۔ چنانچہ میدانِ کارزار گرم ہوا۔ انند پال شکست خوردہ ہو کر کشمیر کی طرف بھاگ نکلا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر سلطان نے پھر ملتان کا قصد کیا اور ابوالفتح کو اس کے کیفر کردار کو پہونچا کر غزنین واپس چلا گیا۔

معرکۂ پشاور اور نگرکوٹ کی فتح

۳۹۹ھ میں سلطان نے پھر ایک لشکرِ کثیر جمع کر کے ہندوستان پر حملہ کیا اس اثنا میں انند پال اپنی پراگندہ اور منتشر طاقت کو جمع کر چکا تھا۔ اس نے مقابلہ کے لیے بڑے پیمانہ پر تیاریاں کیں اور اس کے علاوہ دوسرے راجوں مہاراجوں سے بھی مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج اور دہلی و اجمیر کے راجاؤں نے دل کھول کر مدد کی۔ پشاور کے حوالی میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں۔ ہندو عوام میں بھی اس جنگ کی وجہ سے اس قدر جوش وخروش تھا کہ عورتوں نے زیور بیچ بیچ کر لشکریں کی مدد کی اور جو غریب تھیں انہوں نے چرخہ کات اور مزدوری کر کے پیسے بچائے اور اُن سے چیزیں خرید کر لشکریوں کو بھیجیں۔

سلطان کو ہندوؤں کے اس جوش وخروش اور ان عظیم الشان تیاریوں کا علم ہوا تو اس نے لڑائی شروع کرنے میں بڑی احتیاط اور دوراندیشی سے کام لیا۔ چنانچہ پہلے حکم دیا کہ لشکر کے دونوں جانب خندق کھودی جائے تاکہ کسی طرف سے ہندوؤں کا بس نہ چلے۔ پھر لڑائی شروع ہوئی تو ایک ہزار قدر انداز آگے بڑھے اور دشمن پر تیر برساتے ہوئے ان کو اپنے لشکر سے قریب لے آئے۔ جب مسلمان اِن سپاہیوں کے مقابلہ میں آئے تو اس احتیاط کے باوجود بیس ہزار گکھر سپاہی عین ہنگامۂ جنگ کی اس حالت میں دونوں طرف سے یورش کر کے خندق کو پھاند گئے اور اسلامی لشکر میں گھس آئے نتیجہ یہ ہوا کہ تین چار ہزار مسلمان وہیں کام آگئے۔ اسلامی فوج اس اچانک اور غیر متوقع حملہ سے سراسیمہ ہو گئی لیکن حسنِ اتفاق سے دفعۃً انند پال کا ہاتھی گولے اور بارود کی

آواز سے بگڑ کر میدانِ جنگ سے بھاگا۔ اُس کے سپاہی یہ سمجھے کہ راجہ نے مسلمانوں کی تیغ زنی سے ڈر کر میدان چھوڑ دیا اور راہِ فرار اختیار کر لی ہے۔ اس بنا پر اُن میں دل شکستگی پیدا ہو گئی اور وہ بھی بھاگ پڑے مسلمانوں کے لشکر نے دو دن اور دو رات تک ان لوگوں کا تعاقب کیا اور آٹھ ہزار کے قریب دشمن کی فوج کے سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ سلطان نے اس فتح کے بعد آگے بڑھنے کا ارادہ کیا اور نگر کوٹ (ضلع کانگڑہ) کے قلعہ بھیم کو سر کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ یہ قلعہ راجہ بھیم کے زمانہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا۔ یہ قلعہ مخزنِ اصنام تھا۔ ہر ایک راجہ نقد روپیہ۔ اشرفیاں۔ جواہرات اور قسم قسم کی عمدہ اور بیش قیمت چیزیں بطور نذرانہ یہاں بھیجتا تھا اس بنا پر اس کی دولت و ثروت کا کوئی حساب نہ تھا سلطان نے یہاں پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اہلِ قلعہ نے تیسرے دن ہی قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ محمود نے ان سب کی جان بخشی کی اور قلعہ کی تمام دولت پر جو راجہ بھیم کے زمانہ سے اب تک یہاں جمع ہوتی رہی تھی قبضہ کر کے غزنین روانہ ہو گیا۔ کانگڑہ کی یہ فتح سنہ ۴۰۰ھ مطابق سنہ ۱۰۰۹ء کا واقعہ ہے۔

تھانیسر کی فتح

سنہ ۴۰۵ھ مطابق سنہ ۱۰۱۴ء میں سلطان نے تھانیسر پر حملہ کیا اور یہاں کے مندروں اور بتوں کو منہدم کر کے اور بہت کچھ مالِ غنیمت لیکر غزنین واپس ہوا۔ اس کے بعد سلطان نے دہلی کو مسخر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن مشیرانِ کار نے کہا کہ دہلی کو فتح کرنے سے پہلے پنجاب کے پورے صوبہ پر قبضہ کر لینا ضروری ہے اور چونکہ اس وقت انند پال کے ساتھ معاہدہ کے باعث ایسا ہونا مناسب نہ تھا اس لئے سلطان نے اس ارادہ کو ترک کر دیا۔ کہتے ہیں کہ تھانیسر کی مہم سے فارغ ہو کر سلطان غزنین گیا ہے تو اس کے ہمراہ تقریباً دو لاکھ لونڈی اور غلام تھے۔

کشمیر پر حملہ

سنہ ۴۰۶ھ میں سلطان نے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور حدودِ کشمیر میں پہنچ کر قلعہ لوہ کوٹ کا جو بلندی اور مضبوطی میں مشہور تھا محاصرہ کیا لیکن موسم کی شدت

اور سخت برف باری کے باعث فوج یہاں زیادہ قیام نہ کر سکتی تھی اور اُدھر اہلِ قلعہ کو کشمیر کے دار السلطنت کی طرف سے برابر کمک پہونچ رہی تھی۔ اس بنا پر سلطان نے محاصرہ اٹھا کر غزنین کا رخ کیا۔ واپسی میں اصل راستہ سے بھٹک جانے کے باعث لشکر کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایک بڑی تعداد ہلاک بھی ہوگئی۔

قنوج کی فتح

۴۰۹ھ میں قنوج پر فوج کشی کی۔ یہاں کا قلعہ نہایت مضبوط اور بلند تھا۔ پھر راجہ راجے پال[۱] کا اُس زمانہ میں لوہا بھی مانا جاتا تھا۔ لیکن باایں ہمہ اُسے مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ سلطان کی خدمت میں ایلچی بھیج کر اطاعت و فرماں بری کا عہد و پیمان کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ راجہ مسلمان ہوگیا تھا لیکن اس کی تائید مستند تاریخوں سے نہیں ہوتی۔

قنوج میں تین روز قیام کے بعد سلطان نے ایک دو معرکے اور سر کیے۔ اسی اثناء میں اُس نے متھرا کی شہرت سُنی تو عنانِ عزیمت اُسی طرف موڑ دی۔ اور بلا مقابلہ فتح کر لیا۔

فتح سومنات

اس سے فارغ ہو کر وہ چند اور قلعوں اور کالنجر کی فتوحات میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ ۴۱۶ھ[۲] میں سلطان نے سومنات اور اُس کے بُت خانہ کی شہرت سُنی اور وہ اُس کو فتح کرنے کے ارادہ سے بڑے ساز و سامان اور لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ راستہ میں اجمیر اور پٹن گجرات میں بھی غارت گری کر کے بہت کچھ مال و اسباب حاصل کیا۔ سومنات کا قلعہ نہایت بلند اور بہت مضبوط تھا۔ دریا کا پانی اُس کی فصیل تک پہونچتا تھا۔ لیکن مسلمان فوجی کسی طرح سیڑھیاں باندھ کر قلعہ کے اوپر پہونچ گئے اور اہلِ قلعہ پر چاروں طرف سے حملہ آور ہوگئے۔ سخت ترین معرکہ آرائی کے بعد آخر کار سلطان کو عظیم الشان فتح ہوئی اور بیش قیمت اموال

---

[۱] علامہ ابن اثیر نے بھی قنوج کے راجہ کا یہی نام لکھا ہے تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۰۶۔ [۲] محمد قاسم فرشتہ نے فتح سومنات کا ۴۱۵ھ لکھا ہے لیکن علامہ ابن اثیر نے اس کا ذکر ۴۱۶ھ کے واقعات میں کیا ہے (ج ۹ ص ۱۱۸) اور مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے بھی تاریخ فرشتہ کے اپنے حواشی ج ۱ ص ۱۵ میں اسی کو صحیح بتایا ہے۔

غنیمت ہاتھ آئے اس سلسلہ میں بعض مورخین نے زیبِ داستان کے لیے عجیب وغریب قسم کی تفصیلات بیان کی ہیں جن کا اس موقع پر تذکرہ کرنا غیر ضروری ہے۔ حکیم ثنائی نے فتح سومنات کی تقریب پر ایک نظم لکھی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں۔

کعبہ و سومنات چوں افلاک شد ز محمود واز محمد پاک

ایں ز کعبہ بتاں بروں انداخت آں ز کیں سومنات را پرداخت

عسجدی جو محمود کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اُس نے بھی اس فتح کی تقریب سے ایک قصیدہ لکھا ہے اُس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تا شاہ خسرواں سفر سومنات کرد

کردارِ خویش را علم معجزات کرد

جس سال سلطان نے سومنات فتح کیا۔ بغداد میں خلافتِ عباسیہ کا تخت نشین القادر باللہ تھا۔ خلیفہ بغداد نے فتح سومنات کی خبر سے مسرور ہو کر محمود کے پاس ایک "القاب نامہ" بھیجا اور خراسان، ہندوستان، اور نیمروز و خوارزم کا لوائے سلطنت بھی عطا کیا۔ اس نامہ میں خلیفہ محمود اور اُس کے بیٹوں اور بھائیوں تک کو القاب عطا کیے تھے۔ چنانچہ سلطان کا لقب کہف الدولة والاسلام تھا۔[1]

وفات ماہ ربیع الثانی ۴۲۱ھ میں سلطان محمود کا بعارضۂ اسہال وسوءِ مزاج انتقال ہوا ۳۶۰ھ سالِ پیدائش ہے اس حساب سے تقریباً ساٹھ برس کی عمر پائی۔ مدتِ حکومت ۳۵ سال ہے۔ غزنین کے قصر فیروزہ میں جسم کو سپردِ زمین کیا گیا۔

اخلاق وعادات سلطان محمود کی شخصیت باعتبارِ اخلاق وعادات بہت اُلجھی ہوئی ہے بعض مورخین کا جن میں ہماری قومی یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر بھی شامل ہیں۔ خیال ہے کہ سلطان بڑا حریص اور طماع تھا۔ اُس نے جتنی لڑائیاں لڑیں اُن کا مقصد اسلام کو فروغ دینا نہ تھا بلکہ

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۱۶

جلبِ زر اور دنیا بھر کے اموال و امتعہ کو فراہم کرنا تھا۔ اس کے برعکس عام مورخین کا جو رجحان ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ "غازی" کا لقب سلطان کے نام کا جز ہو گیا ہے اور اُس کا نام سُنتے ہی "بت شکنی" کا تصور ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔

اس باب میں ہماری رائے یہ ہے کہ دونوں فریق افراط و تفریط میں مبتلا ہیں اور انہوں نے سلطان کے اخلاق و عادات اور اُس کے رجحانات و عواطف کا جائزہ تاریخی بیانات کی روشنی میں غیر جانب داری کے ساتھ نہیں لیا ہے۔ جہاں تک سلطان کے حریصِ زر و سیم ہونے کا تعلق ہے بڑی حد تک اُس کو اس الزام سے بری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر بھی سلطان کے مجاہدانہ کارناموں کے بے حد مداح ہونے کے باوجود لکھتے ہیں۔

وَلَمْ يَكُنْ فِيْهِ مَا يُعَابُ اِلَّا	سلطان میں کوئی عیب نہیں تھا بجز اس کے
اَنَّهُ كَانَ يَتَوَصَّلُ اِلٰى	کہ وہ ہر طریقہ سے اموال لینے کی
اَخْذِ الاموال بكل طريق	کوشش کرتا تھا۔

اس کے بعد یہ واقعہ لکھا ہے کہ سلطان نے سُنا۔ نیشاپور میں ایک بہت متموّل اور دولت مند شخص ہے سلطان نے اُس کو غزنین بلایا اور کہا "مجھے خبر ملی ہے کہ تو قرامطہ کا ہم خیال ہے" یہ شخص سلطان کا مطلب سمجھ گیا اور بولا "میں قرمطی تو نہیں ہوں البتہ میرے پاس دولت ہے اُس میں سے جتنی دولت آپ چاہیں لے سکتے ہیں" سلطان نے اُس کی ساری دولت پر قبضہ کر لیا اور اُس کو صحتِ عقیدہ کی سند لکھ کر دیدی[1]۔

لیکن بایں ہمہ یہ کہنا غلط ہے کہ سلطان محض "ایک ڈاکو اور صرف ایک لٹیرا تھا" اور اُس کی لڑائیوں کا مقصد بجز زر و سیم جمع کرنے کے کوئی اور نہ تھا۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ محمود کے زمانہ میں ہندوستان میں راجپوت آپس میں ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے

---

[1] تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۳۹

اور پنجاب کے ہندو شاہیہ خاندان نے عام طور پر اپنی متشددانہ پالیسی اور جابرانہ حکومت کے ذریعہ عوام میں بددلی پیدا کر رکھی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خود سلطان کی فوج میں ہندو کثرت سے شامل تھے اور سلطان اُن پر اتنا بھروسہ کرتا تھا کہ اُس نے ایک مرتبہ مسلمان جرنیل نیالتگین کو اُس کی بغاوت اور سرکشی کی سزا دینے کے لیے اپنی فوج کے ہندو کمانڈر "تلک" کو بھیجا تھا۔[1]

کچھ ہندوستان کے ان اندرونی اضطراب انگیز حالات اور عام بے چینی کے باعث اور کچھ ہندوؤں کے اس خیال کو باطل کرنے کی نیت سے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہوتا ہے وہ بتوں کے منشا اور ارادہ سے ہی ہوتا ہے اور تمام نفع و ضرر کی کنجیاں انہیں کے قبضہ میں ہیں۔ محمود نے ہندوستان پر پے بہ پے حملے کیے اور ان حملوں میں اُس کی توجہ کا بڑا مرکز وہ مقامات رہے جہاں بڑے بڑے شاندار مندر اور بت خانے تھے۔ اس سلسلہ میں محمود کا سب سے مشہور اور بڑا کارنامہ فتح سومنات ہے۔ سلطان نے یہ حملہ کیوں کیا تھا؟ اور اس سے اُس کا مقصد کیا تھا؟ علامہ ابن اثیر نے اس کی جو وجہ لکھی ہے اُس سے ہماری تائید ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں۔

وکان یمین الدولۃ کلما فتح	یمین الدولہ محمود جب کبھی ہندوستان
من الھند فتحا وکسر صنما یقول	میں کوئی فتح حاصل کرتا اور کسی بت کو توڑتا
الھنود ان ھذہ الاصنام	تھا تو ہندو کہتے تھے "سومنات ان
قد سخط علیھا سومنات	بتوں سے ناراض ہوگیا ہے ورنہ اگر
ولو انہ راض عنھا لاھلک	وہ ان سے راضی ہوتا تو اُن لوگوں کو ہلاک
من قصدھا بسوء فلما	کر دیتا جو ان بتوں کے ساتھ برا معاملہ کرتے
بلغ ذالک یمین الدولۃ عزم	تھے"۔ سلطان کو اس کی اطلاع ہوئی

[1]

علی غزوه واهلاکه ظنّاً منه — تو اُس نے سومنات کو ہلاک کردینے
انّ الهنود اذا فقدوه دراؤا — کا عزم کرلیا کیونکہ اُس کا گمان یہ تھا
آكذب ادعائهم الباطل — کہ ہندو سومنات سے محروم ہوجائیں گے
دخلوا فی الاسلام[1] — اور اپنے جھوٹے دعویٰ کو اپنی آنکھ سے
دیکھ لیں گے تو اسلام میں داخل ہوجائیں گے

اس میں شک نہیں کہ سلطان کا طریقۂ جنگ اور اُس کے بعد اُس کی بے دریغ لوٹ مار، عام قتل و اسر اور عبادت گاہوں کا ہدم یہ وہ چیزیں ہیں جن کو احکام اسلام کے ساتھ مطابقت کا شرف حاصل نہیں ہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا قطعاً بے بنیاد ہے کہ اُس کے کارناموں میں مذہبی جذبہ کو ذرا دخل نہیں تھا اور اُس کی غرض صرف لوٹ مار اور غارت گری تھی۔ سلطان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے قول و قرار کا کتنا پاس اور لحاظ تھا اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تھانیسر کی فتح کے بعد جب سلطان نے دہلی پر حملہ کا ارادہ کیا تو ارکانِ دولت نے کہا کہ دہلی اُسی وقت فتح ہوسکتی ہے جب کہ تمام صوبۂ پنجاب پر اسلامی قبضہ ہو جائے اور انند پال کی طرف سے کوئی خدشہ اور خطرہ باقی نہ رہے[2]۔ لیکن اس وقت چونکہ انند پال کے ساتھ معاہدہ تھا اور اُس نے اب تک معاہدہ کے خلاف کوئی بات نہ کی تھی اس لیے سلطان نے دہلی کو فتح کرنے کی غرض سے انند پال پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور تسخیر دہلی کا ارادہ ہی ترک کردیا۔ علاوہ بریں سلطان کے حالات میں مورخین جگہ جگہ لکھتے ہیں کہ وہ شدید جنگ کے دوران میں یا اُس کے شروع ہونے سے پہلے بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہوجاتا اور اپنی فتح کے لیے دعائیں مانگتا تھا۔ اُس کے اسی جذبۂ احترامِ دین و اہلِ دین کا اثر تھا کہ اُس نے طوس میں حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے مشہد کی دوبارہ تعمیر کرائی تھی جس کو اُس کے باپ ناصر الدین سبکتگین نے ویران کردیا تھا[3]

[1] تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۱۸ [2] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۸ [3] تاریخ الکامل ج ۹ ص ۱۳۹

بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان خلیفۂ بغداد کا علاقہ فتح کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔[۱] اس الزام کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ محمود نے عباسی خلیفہ بغداد القادر باللہ سے درخواست کی تھی کہ سمرقند مجھے دیدیا جائے۔ خلیفہ نے اس درخواست کو مسترد کر دیا اور جواب میں ایک نہایت تہدید آمیز خط لکھا۔ محمود نے اس پر غصہ سے برانگیختہ ہو کر ایلچی سے کہا "تم لوگ غالبًا یہ چاہتے ہو کہ میں ہزاروں کوہ پیکر ہاتیوں سے دارالخلافت کو روندڈالوں اور بارگاہِ خلافت کی خاک ان ہاتیوں پر لاد کر غزنین لے آؤں"۔ غالبًا محمود کے اس فقرہ سے مورخین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ خلافتِ عباسیہ کے ایک علاقہ (سمرقند) کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اسی واقعہ میں یہ مذکور ہے کہ محمود کے اس فقرہ کے جواب میں جب خلیفہ بغداد نے پھر ایک ایلچی ایک عجیب وغریب خط کے ساتھ بھیجا جس میں اصحابِ فیل کی طرف اشارہ کر کے محمود کو اس سے خبردار کیا گیا تھا اگر اُس نے واقعی خلافتِ عباسیہ پر ہاتیوں کی مدد سے حملہ کیا تو اُس کا حشر وہی ہوگا جو قرآن مجید کے بیان کے مطابق مکہ پر ہاتیوں سے حملہ کرنے والوں کا ہوا۔ تو محمود کو اس درجہ تاثر ہوا کہ وہ خط کا یہ مضمون معلوم کرتے ہی ہوش وحواس کھو بیٹھا پھر جب ہوش میں آیا تو بہت رویا۔ ایلچی سے اپنی پچھلی غلطی کی معذرت کی اور اُسے بیش قیمت تحفے تحائف دے کر بغداد واپس کیا۔ (تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۸۶)

بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگرچہ سلطان محمود نے ہندوستان پر پے بہ پے سترہ حملے کر کے یہاں کی فوجی طاقت کو بہت کمزور کر دیا اور پنجاب کو دولتِ غزنویہ سے ملحق کر کے اور وہاں اپنا ایک نائب اور ایک دستۂ فوج مقرر کر کے بعد میں آنے والوں کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے اور اپنی مملکت کو وسیع تر کرلے کے امکانات پیدا کر دیے تاہم اُس نے خود ہندوستان میں کوئی مستقل اسلامی نظام قائم نہیں کیا۔ اُس کے بے پناہ حملوں کے

[۱] محمد اکرام صاحب آئی سی ایس نے "چشمۂ کوثر" میں (ص ۵) اس جملہ کو ڈاکٹر تاراچند کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب Influence of Islam on Hinduism. میں یہ جملہ میری نظر سے نہیں گذرا۔

اثر سے کچھ لوگ برضا و رغبت اور کچھ جبراً و قہراً مسلمان ضرور ہوئے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی سوسائٹی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ سلطان محمود کے حملے اُس تیز و تند آندھی کی طرح ہوتے تھے جو بڑی تیزی سے گرد و غبار کا جھکّار اُڑاتی، درختوں کو گراتی اور شکستہ و خستہ دیواروں کی شکست و ریخت کرتی آتی ہے اور گذر جاتی ہے اور اپنے پیچھے تخریب و بربادی کے چند نقوش کے سوا اور کوئی چیز بطور یادگار نہیں چھوڑ جاتی۔

سلطان علم و فن اور ادب و شعر اور آرٹ کا بھی بڑا سرپرست اور مربی تھا۔ اُس کے دربار پر عباسی خلیفہ مامون کے دربار کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ ہندوستان سے جو بیش قیمت جواہرات اور پتھر اور دوسری قسم کا ساز و سامان لے گیا تھا اُن سے اُس نے غزنین کو خوب صورت اور شان دار شہر بنا دیا۔ جس میں عجائب خانہ، یونیورسٹی اور کتب خانہ سب ہی کچھ تھا۔

دولتِ غزنویہ کا زوال سلطان محمود کے انتقال کے بعد دولتِ غزنویہ پر انحطاط و زوال کے اثرات طاری ہو گئے۔ باپ کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی تخت و تاج کے لیے بھائیوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ آخر کار مسعود غالب آیا اور بھائی کو قتل کر کے خود تخت نشین ہوا۔ لیکن اسے بھی چین نصیب نہ ہوا۔ ایک طرف سلجوق ترک غزنین کا علاقہ ویران کر رہے تھے اور دوسری جانب طوائف الملوکی اور ترکی اور ہندی غلاموں کی سرکشی نے اندرونی امن و امان کی فضا کو تاریک کر رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسعود کو معزول کر کے اُس کے بھائی محمد کو تخت نشین کیا گیا۔ اس کے بعد متعدد بادشاہ اور ہوئے جو سیاسی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے دولتِ غزنویہ کے اضمحلال کا ہندوستان پر یہ اثر ہوا کہ مختلف حکومتوں اور ریاستوں نے پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ یہاں تک کہ نگر کوٹ بھی غزنوی گورنر پنجاب سے چھین لیا گیا۔

خاندانِ غور جس زمانہ میں دولتِ غزنویہ پر زوال طاری تھا قندھار کے قریب غور میں اُس کی ایک رقیب حکومت نشو و نما پا رہی تھی گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان دونوں میں

جنگ ہوئی اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار غور کے بادشاہ علاء الدین نے اپنے بھائی کے فریب کارانہ قتل کا انتقام لینے کے لیے ۱۱۴۹ء میں غزنین کا محاصرہ کیا اور شدید ترین حملوں کے بعد اسے فتح کر لیا۔ علاء الدین کو اس پر سیری نہیں ہوئی۔ اُس کی اجازت سے غوری فوجیوں نے غزنین میں سات روز تک مسلسل قتل عام قتل و اسیر اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ غزنین کے بڑے بڑے سردار جو علاء الدین کے بھائی کے قتل کی سازش میں شریک تھے اُن کو پابہ زنجیر غور لایا گیا اور قتل کر کے اُن کے خون کو گارے میں ملا کر اُن عمارتوں کی تعمیر میں استعمال کیا گیا جو اُس وقت غور میں بن رہی تھیں اس قساوتِ قلب اور شدید مظالم کے باعث ہی علاء الدین کو جہاں سوز کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

سقوطِ غزنین سے قبل ہی یہاں کا بادشاہ خسرو شاہ اپنی جان بچا کر لاہور آگیا تھا۔ جہاں (سات سال تک حکومت کرنے کے بعد) ۵۵۵ھ مطابق ۱۱۶۰ء میں وفات پائی۔

اس کے بعد اُس کا بیٹا خسرو ملک باپ کا جانشین ہوا۔ یہ دولتِ غزنویہ کے سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ اسی اثنا میں علاء الدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اُس کی حکومت اُس کے بھتیجوں میں اس طرح تقسیم ہو گئی کہ ایک بھتیجہ غور کا بادشاہ تھا اور دوسرا جس کو تاریخ سلطان شہاب الدین غوری کے نام سے جانتی ہے غزنین کا گورنر تھا۔ شہاب الدین نہایت عالی ہمت اور بلند حوصلہ انسان تھا۔ وہ شروع سے ہی ہندوستان کو فتح کرنے کا آرزومند تھا۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے ضروری تھا کہ پنجاب کو پہلے کی طرح تاج و تختِ غزنین کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے لاہور پر حملہ کیا اور آخر کار دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد ۱۱۸۶ء میں فتح کر لیا۔ خسرو ملک جو لاہور میں دولتِ غزنویہ کی آخری نشانی تھا، گرفتار کر کے غور بھیج دیا گیا۔

پنجاب پر قبضہ ہو جانے کے بعد شہاب الدین غوری کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنا

یوں ہی آسان تھا کہ اُس کو مزید قوت اس سے پہونچی کہ اس وقت قنوج اور دہلی و اجمیر شمالی ہند میں راجپوتوں کی یہ دو مضبوط اور طاقت ور حکومتیں تھیں۔ قنوج کی حکومت جے چند کے قبضہ میں تھی اور دہلی و اجمیر کی سلطنت کا فرماں روا پرتھوی راج تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ان دونوں میں سخت پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور اس کا اثر یہ تھا کہ شمالی ہند کے اعیان و امراء میں سے کچھ لوگ جے چند کی حمایت کرتے تھے اور دوسرے لوگ پرتھوی راج کے ساتھی تھے۔ اس موقع کو غنیمت جان کر غوری نے ۱۱۹۱ء میں بھٹنڈہ پر حملہ کرکے اُسے فتح کرلیا۔ پرتھوی راج کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ ایک لشکرِ جرار لے کر مقابلہ کے لیے نکلا۔ تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر دونوں میں معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ لیکن راجپوتوں نے اس مردانگی اور بہادری سے جنگ لڑی کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ خود سلطان غوری بری طرح زخمی ہوکر اپنے گھوڑے سے گرنے لگا تھا کہ ایک جاں نثار غلام لپک کر گھوڑے پر جا بیٹھا اور گھوڑا اُڑاتا ہوا اپنے آقا کو میدانِ جنگ سے صاف نکال بھاگا۔ زخموں کے اچھا ہوجانے کے بعد غوری غزنین آیا اور از سرِ نو حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ چنانچہ دو سال بعد اُس نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا۔

پرتھوی راج خود بھی بڑا بہادر تھا اور پھر جنگ میں آیا بھی تھا بڑے تزک و احتشام اور ساز و سامان کے ساتھ لیکن باایں ہمہ غوری کو فتح ہوئی۔ پرتھوی راج کا صفِ اول میں لڑتے ہوئے گرفتار ہونا تھا کہ پوری فوج میں بھگدڑ پڑ گئی۔ اور آخر کار اجمیر تک کا علاقہ سلطان کے قبضہ میں آگیا۔

اس مہم سے فارغ ہوکر غوری ہندوستان میں اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑ کر غزنین واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد قطب الدین نے دہلی بھی فتح کرلی۔

۱۱۹۴ء میں غوری نے شمالی ہند کی دوسری راجپوت حکومت یعنی قنوج پر حملہ کیا

سے بڑی بڑی جنگ کی اور بہادری سے لڑا۔ لیکن آخر کار شکست کھائی اور غزنی اسے فتح
کر کے افغانستان چلا گیا۔ بعد ازاں قطب الدین نے گجرات اور بختیار خلجی نے جو قنوج
میں غوری کا نائب تھا۔ ۱۱۹۹ء اور بہار اور مغربی بنگال فتح کر لیا

اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ اب شہاب الدین غوری ہندوستان کے ایک بڑے
حصہ پر قابض تھا۔ لیکن یہ فتوحات جیسے جیسے اس سرعت کے ساتھ حاصل ہوئی تھیں
کہ ان کا انتظام خاطر خواہ طریقہ پر نہ ہو سکتا تھا۔ جگہ جگہ بغاوت اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک
اٹھے سب سے زیادہ زور شمالی ہندوستان میں تھا۔ جہاں ایک قوم کھوکھر نے قیامت
برپا کر رکھی تھی۔

۱۲۰۶ء میں سلطان [illegible] غزنی سے ہندوستان آیا۔ اس
سے فارغ ہو کر [illegible] جا رہا تھا کہ [illegible] دمیک نامی ایک مقام پر
ایک اسماعیلی ملحد نے اس کو قتل کر دیا۔ سلطان جابر [illegible] بعض مورخین
شہاب الدین غوری کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے عظیم سانحہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا
اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حاجی الدبیر [illegible] لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کب ہو گی؟ ارشاد ہوا ۶۰۲ھ [illegible]
[illegible] اس کے بعد مورخ [illegible] لکھتا ہے کہ غوری کی
وفات بھی ۶۰۲ھ میں ہوئی تھی اس لیے اس کو قیامت کی پہلی علامت سمجھنا چاہیے اور چونکہ
چنگیز خان کے حملوں کا آغاز بھی اسی سن میں ہوا تھا اس لیے یہ قیامت کی دوسری علامت
ہے[1]

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ سلطان شہاب الدین غوری نہایت جری اور بہادر
ہونے کے ساتھ محمود غزنوی کی طرح جنگی نہ تھا۔ بلکہ نہایت فیاض اور کشادہ دل بھی تھا۔

[1] ظفر الوالہ بمظفر و آلہ ج ۳ ص ۹۲۱

علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں

وكان رحمه الله شجاعاً	علاوہ بریں وہ شریعت
مقداماً كثير الغزو	اسلام کے احکام پر عمل کرتا اور
إلى بلاد الهند عادلاً	اور اُن کے مطابق فیصلہ
في رعيته حسن السيرة	کرتا تھا[1]
فيهم	

علماء سے اُس کو بڑی عقیدت تھی۔ اکثر اُن سے صحبت رکھتا اور دینی مسائل پر اُن سے گفتگو کرتا تھا۔ امام فخر الدین رازیؒ سے اُس کو بڑی ارادت تھی۔ امام صاحب خود محل شاہی میں تشریف لاتے اور وعظ کہتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے دوران وعظ میں سلطان کو خطاب کر کے فرمایا "اے بادشاہ نہ تیری یہ حکومت باقی رہے گی اور نہ رازی کی یہ تلبیس رہے گی اور ہم سب کو اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے"۔ سلطان پر امام کے ان فقروں کا یہ اثر ہوا کہ بے ساختہ رونے لگا اور اتنا رویا کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا۔[2]

سلطان کے کوئی لڑکا نہ تھا جسمانی یادگار کے طور پر صرف ایک لڑکی رکھتا تھا۔ لیکن اُس کو بڑا شوق یہ تھا کہ غلام خریدتا اور خاص طور پر اُن کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں اُس کے چالیس غلام ایسے تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین تربیت سے بہرہ مند تھے۔ سلطان انہیں کو اپنی جسمانی یادگار سمجھتا تھا۔ یہ سب کسی نہ کسی علاقہ کے حاکم یا گورنر تھے۔[3]

سلطان غوری نے اپنے غلاموں کو اعلیٰ انتظامی اور فوجی قابلیت سے آراستہ کر کے ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جو اُس کے بعد بھی ہندوستان میں حکومت و سلطنت کا کام بخوبی چلا سکتا تھا۔ چنانچہ غوری کے انتقال کے بعد جیسا کہ توقع تھی سلطنت کے حصے بخرے

[1] تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۸۴ [2] ابن اثیر ج ۱۲ ص ۸۴ [3] ظفر الوالہ بمظفر وآلہ ج ۲ ص ۶۸۲۔

ہو گئے۔ اسی کشمکش میں قطب الدین ایبک نے جو دہلی کا گورنر تھا اپنی خود مختار بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

خاندانِ غلامان
قطب الدین ایبک

قطب الدین ایبک خاندانِ غلامان (از ۱۲۰۶ء تا ۱۲۹۰ء) کا بانی ہے۔ اس خاندان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ قطب الدین خود غلام تھا اور اُس کے بعد جو اُس کے جانشین ہوئے اُن میں بھی اکثر و بیشتر وہی لوگ تھے جو اصلاً غلام تھے۔

قطب الدین ایبک نسلاً ترک تھا۔ ایبک کے معنی شل ہونا ہیں۔ چونکہ اُس کا ایک ہاتھ شل تھا اس لیے اسے ایبک کہتے تھے۔ جب اسے نیشاپور لایا گیا تو یہاں کے ایک قاضی القضاۃ فخر الدین عبد العزیز الکوفی نے جو امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے خرید کر لیا اور اپنی اولاد کی طرح اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ مکتب میں داخل ہو کر قطب الدین نے قرآن مجید، ضروری مسائل فقہ اور ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ایک شخص قاضی فخر الدین سے خرید کر اسے غزنین لایا اور سلطان محمد غوری کے سامنے پیش کیا۔ سلطان بڑا مردم شناس تھا اُس نے جوہر قابل سمجھ کر قطب الدین کو خرید کر لیا اور پھر خود اپنے اہتمام سے اُس کو فوجی اور انتظامی تعلیم و تربیت دی۔ چنانچہ صاحبِ طبقاتِ ناصری کا بیان ہے کہ ”اگرچہ قطب الدین صورۃً خوب صورت نہ تھا تاہم اُس کے اخلاق و عادات نہایت عمدہ تھے۔ وہ بڑا شہ سوار بہادر عقل مند، فیاض و سخی، بزرگانہ خصائل کا مالک، درست کار اور راست باز انسان تھا۔ لوگ عام طور پر اس کی مدح کرتے تھے“ [۱]

قطب الدین ۱۲۰۶ء میں دہلی میں تخت نشین ہوا۔ بعد میں اُس نے تاج الدین یلدز سے لاہور بھی چھین لیا اس سے فارغ ہو کر غزنین گیا۔ چالیس روز مقیم رہ کر لاہور واپس آیا۔ یہاں کے قیام کے دوران میں ایک دن پولو کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر کر جاں بحق ہو گیا یہ واقعہ تخت نشینی کے چار سال بعد یعنی ۱۲۱۰ء میں پیش آیا۔ لاہور میں ہی رسم تدفین عمل میں آئی

---

[۱] بحوالہ ظفر الوالہ ج ۲ ص ۶۴۴

جہاں بازار انارکلی کے عقب میں اُس کا مزار اب تک حسرت و عبرت کا مرقع ہے۔[1]

قطب الدین کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا۔ لیکن یہ کمزور ہونے کے باعث اس ذمہ داری کا اہل نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمس الدین التمش جو اُس وقت دہلی میں تھا اور قطب الدین کا داماد بھی تھا اُس میں اور آرام شاہ میں دہلی کے آس پاس جنگ ہوئی اور آرام شاہ گرفتار ہو کر بدایوں بھیج دیا گیا۔

خاندانِ غلامان کی مدتِ حکومت کل ۸۴ سال ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے غلاموں کے لیے جو تعلیم و تربیت کے بہتر سے بہتر مواقع بہم پہونچائے ہیں اور مسلمانوں کو غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی جو تلقین کی ہے تاریخ اسلام میں اس کے جہاں اور بے شمار نظائر و امثال موجود ہیں ہندوستان کا خاندان غلامان بھی ان تعلیمات کی حقانیت و صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور کھلی شہادت ہے۔ قطب الدین خود جن اوصاف و شمائل کا انسان تھا اُس کا تذکرہ ابھی گذر چکا ہے۔

---

[1] قطب الدین جتنا بہادر اور جری تھا۔ مدبر اور سمجھ دار بھی تھا۔ فتوحات کے علاوہ اُس کا غالباً سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ہندوستان کا سیاسی تعلق غزنین سے منقطع کر لیا جو دو سو برس سے قائم تھا۔ اس طرح ہندوستان میں خود مختار اسلامی سلطنت کی داغ بیل سب سے پہلے اُسی کے ہاتھوں پڑی۔ یہاں اُس کی حکومت کا نظام کیا تھا؟ اور وہ اس بارے میں کس روش پر چلنا پسند کرتا تھا؟ اس کی ایک جھلک فخر الدین مبارک شاہ کے اس بیان میں نظر آسکتی ہے کہ "قطب الدین نے تمام غیر شرعی محصولات کو ختم کر دیا اور صرف شرعی محصولات کو باقی رہنے دیا تھا۔ اس کے مطابق بعض حالات میں عُشر ($\frac{1}{10}$) اور بعض حالات میں اس کا بھی نصف لیا جاتا تھا"

(عجائب نامہ۔ سر ای۔ ڈی۔ روس۔ صفحہ ۴۰۳)

ڈاکٹر ترپاٹھی اس کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "قطب الدین کی حکومت کی پالیسی اس میں شبہ نہیں کہ فیاضانہ تھی کیونکہ وہ ایک مفصل دستور قانونی پر سختی سے عامل ہونا چاہتی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی قانون کی رو سے محصول کی جو مختلف صورتیں اور مقداریں مقرر کی گئی ہیں اُن میں سے کون سی صورت اختیار کی گئی تھی بہر حال خواہ کچھ بھی ہو وہ محصولات کی اُس نوعیت سے بہت قریب تھی جو اُس زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھی۔"

سلطان شمس الدین التمش

آرام شاہ کے بعد قطب الدین کا آزاد کردہ غلام اور داماد شمس الدین التمش ۱۲۱۰ء میں تخت نشین ہوا تو یہ بھی عجیب و غریب اوصاف و خصائص کا انسان تھا۔ ایک طرف وہ نہایت مدبر، بیدار مغز اور بہترین سیاست داں اور بہادر تھا۔ جس نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلے سندھ اور بنگال کے باغی گورنروں کی سرکوبی کی پھر ہندوؤں کی ہمسایہ خود مختار ریاستوں کی طرف توجہ کی اور راجپوتانہ پر حملہ کیا۔ رنتھمبور اور گوالیار کے قلعوں کی تسخیر کی۔ مالوہ کا قدیم دار السلطنت اجین فتح کیا۔ علاوہ بریں نظم و نسق اور ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ بقول ڈاکٹر ترپاٹھی کے اس کو ہندوستان میں اسلامی خود مختار حکومت کا اولین موسس اور بانی کہا جاسکتا ہے۔[۱]

ان اوصاف کے ساتھ ہی دوسری جانب وہ نہایت عابد و زاہد صوفی منش اور فقر پسند طبیعت کا مالک تھا۔ چنانچہ خزائن الاصفیا کے مصنف کا بیان ہے

اگرچہ بظاہر تعلق بہ پادشاہی داشت لیکن از دل فقیر و فقیر دوست بود۔[۲]

فرائض و نوافل کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ ہوجانے کے بعد بڑے سے بڑے اہم سیاسی کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود وہ نماز ترک نہ کرتا تھا۔ مولف طبقات اکبری کا بیان ہے

---

[۱] Some aspects of Muslim administration. P. 24

[۲] بحوالہ اسلامک کلچر ج ۲۷ نمبر ۲ صفحہ ۱۶۶

سلطان شمس الدین بطاعت و عبادت مدام بود در روزہائے جمعہ بمسجد رفتے و
بہ ادائے فرائض و نوافل قیام نمودے

وعظ سننے کا اسے بڑا اشتیاق تھا۔ ہفتہ میں تین مرتبہ اور ماہ رمضان المبارک میں روزانہ وعظ سنتا تھا۔ سیر العارفین کی روایت ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد سلطان اپنے محل میں ایک اجتماع منعقد کرتا تھا جس میں اکابر و اشراف و مشائخ شریک ہوتے تھے۔ اس اجتماع میں شرکاء بزم پوری آزادی سے بادشاہِ اسلام کے فرائض و واجبات پر اظہار خیال کرتے اور بادشاہ اُن سب کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتا تھا۔

فرائض و تمام نوافل کے علاوہ وہ بیشتر رات عمر ذکر الٰہی اور اوراد و ظائف میں مشغول رہتا تھا۔ بابا فرید فوائد السالکین میں لکھتے ہیں۔

او صاحب اعتقاد بود کہ شبہا بیدار بودے کہ وقتے او را کسے در خواب ندیدے
گر در عالم تحیر ایستادہ دگر قدرے خواب کردے ہماں زماں بیدار شدے وخود
برخاستے و آب گرفتے، وضو ساختے و بر مصلّی قرار گرفتے و ہیچ یکے از خدمت گاران
وغیرہ بیدار نہ کردے و گفتے آسودگاں را چرا در رنج آرم [1]

سلطان کے کمالِ تصوف و درویشی کے ثبوت کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ خواجہ عثمان ہرونی جو خود بڑے پایہ کے بزرگ اور صوفی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہما اللہ کے پیر و مرشد ہیں سلطان کو "انسانِ کامل" سمجھتے تھے۔ انہیں وجوہ سے سلطان کو علماء و مشائخ اور خصوصاً صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ اس کے عہد میں درۂ خیبر کے راستہ سے کثرت سے مشائخ و صوفیاء ہندوستان آئے۔ جب سلطان کو اُن میں سے کسی کے دہلی آنے کی اطلاع ہوتی تھی تو استقبال کے لیے خود میلوں تک پاپیادہ جاتا تھا۔

[1] یہ اور اس سلسلہ کی تقریباً سب معلومات پروفیسر خلیق احمد نظامی ایم اے کے اُس مقالہ سے ماخوذ ہیں جو اسلامک کلچر جلد بست و نہم نمبر ۲ میں "..." کے عنوان سے شائع ہوا ہے

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ملتان سے دہلی آئے تو سلطان نے حضرت خواجہ کا بڑا شاندار استقبال کیا اور شاہی محل میں ہی قیام کرنے کی درخواست کی لیکن جب قطب صاحب نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا اور شہر سے باہر ایک خانقاہ میں قیام فرمایا تو سلطان اکثر وبیشتر آپ کی ملاقات کے لیے خانقاہ میں آتا تھا اور آپ سے پند ونصیحت کی باتیں سنتا تھا۔ سلطان کو قطب صاحب سے کس درجہ عقیدت وارادت تھی اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود حضرت قطب صاحب کا بیان ہے "ایک رات سلطان مجھ دعاگو کے پاس آیا اور آتے ہی میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے کہا" کیا کوئی تکلیف ہے؟ اگر کوئی حاجت ہے تو بیان کیجیے" سلطان نے جواب دیا" حاجت! حاجت تو اُس خدائے فضل وکرم سے جس نے مجکو یہ مملکت اور سلطنت دی ہے۔ کوئی نہیں ہے۔ مجکو البتہ صرف یہ بتا دیجیے کہ قیامت کے روز میرا حشر کس گروہ کے ساتھ ہوگا؟"

ایک مرتبہ جب بعض سیاسی حالات کے باعث حضرت خواجہ معین الدین چشتی قطب صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر دہلی سے اجمیر جانے لگے تھے تو اہالیانِ دہلی کے جم غفیر کے ساتھ سلطان بھی کئی میل تک ان دونوں بزرگوں کی مشایعت کے لیے پیدل گیا لیکن جب خواجہ اجمیری کو باشندگان دہلی اور خود سلطان کے رنج وغم کا احساس ہوا اور اس بنا پر آپ نے قطب صاحب کو دہلی میں ہی قیام کرنے کی اجازت دیدی تو سلطان نے فرط مسرت سے خواجہ اجمیری کے پاؤں کو بوسہ دیا اور قطب صاحب کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ دار السلطنت واپس لے کر آیا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد غالباً مشکل سے ہی کوئی بادشاہ ایسا نکلے گا جو شمس الدین التمش کی طرح سبحہ وشمشیر دونوں کے کمالات کا بیک وقت جامع ہو۔ بہترین مدبر اور سیاست داں ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا صوفی اور صاحبِ معرفت وطریقت بھی ہو۔ اُس کی تلوار نے

بڑی بڑی حریف طاقتوں کو شکستِ فاش دے کر ایک عظیم و وسیع سلطنت کی بنیادیں مستحکم کی ہوں لیکن وہ خود درویشوں اور فقیروں کی خاکِ پا ہو عظیم الشان طاقتیں اُس کے قدموں پر اطاعت و بندگی کا سر جھکائے ہوئے ہوں لیکن وہ خود گوشہ نشین اربابِ فقر کے پاؤں کو بوسہ دیتا ہو، رات کی تاریکیوں میں خانقاہ کے اندر جا کر خوفِ خدا اور فکرِ فرداسے روتا ہوا آہ و زاری کرتا ہو۔ سلطان کی پاکیزہ زندگی، طہارتِ نفس اور ورع و تقویٰ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہیے کہ ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا اور آپ کا جنازہ غسل و کفن کے بعد باہر لایا گیا تو خواجہ ابو سعیدؒ نے کہا حضرت خواجہ نے وصیت کی تھی کہ "میرے جنازہ کی نماز صرف وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی زنا نہ کیا ہو اور عصر کی سنتیں اور تکبیر اولیٰ ترک نہ کی ہوں" اس مجمع میں سلطان خود موجود تھا وہ انتظار کرتا رہا کہ حضرت خواجہ کی وصیت کے مطابق کوئی ایسے ہی بزرگ آگے بڑھیں اور نماز پڑھائیں۔ سلطان کافی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ لیکن آخر جب کسی شخص نے نماز جنازہ میں امامت کرنے کی جرأت نہ کی تو سلطان خود آگے بڑھا اور بولا "میں اپنی نمازوں کی تشہیر اور نمائش پسند نہیں کرتا لیکن حضرت خواجہ کی وصیت کی تعمیل بہر حال ضروری ہے" یہ کہہ کر سلطان نے نماز پڑھائی اور جنازہ کو کاندھا دیتا ہوا قبرستان لے گیا۔[1]

حضرت خواجہ کی وفات کے چند مہینوں بعد (۶۳۳ھ) میں خود سلطان کا بھی انتقال ہو گیا لیکن جب تک زندہ رہا قاضی حمید الدین ناگوریؒ کی خانقاہ میں خواجہ صاحب کی فاتحہ کے طور پر کھانا بھیجتا رہا۔ سلطان کی وفات پر حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے حسبِ ذیل شعر کہا۔

بسال شش صد و سی و سہ بود کہ از ہجرت
نماند شاہِ جہاں شمس دین عالمگیر

---

[1] خزائن الاصفیاء، ص ۲۷۵

انہیں خصوصیات کے باعث سلطان شمس الدین التمشؒ ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس کے لیے بغداد کے دربارِ خلافت سے خلعتِ فاخرہ آیا اور ہندوستان پر جس کی حکومت کو تسلیم کیا گیا۔ طبقاتِ اکبری کے مصنف نظام الدین احمد کا بیان ہے کہ سلطان کے لیے یہ دن بڑی مسرت اور جشن کا تھا۔ اُس نے جب یہ خلعت زیب تن کیا تو مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا اس تقریبِ مسرت میں اُس نے امراء کو خلعت تقسیم کیے اور شہر کی آئینہ بندی کرائی۔

جیسا کہ گذر چکا ہے سلطان نے ۶۳۳ھ میں وفات پائی اور دہلی کے پاس مسجد قوت الاسلام یعنی قطب صاحب کی لاٹ کے احاطہ میں سڑک کے کنارہ پر اُس کا مزار عبرت گاہ خواص و عوام ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ سلطان کے حالات کتاب کے اختصار کے پیشِ نظر کچھ زیادہ مفصل ہو گئے ہیں اور اس بنا پر غالباً ایک ناقد کو کتاب کے مضامین میں ناہمواری نظر آئے۔ لیکن اس باب میں اگر میں کوئی معذرت پیش کر سکتا ہوں تو صرف یہی کہ

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ جو باپ کے انتقال کے وقت حسنِ اتفاق سے دہلی میں موجود تھا بادشاہ منتخب ہوا۔ لیکن یہ امورِ سلطنت کا اہل ثابت نہ ہو سکا۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی عنانِ سلطنت اپنی ماں شاہ ترکان کے حوالہ کر دی اور خود دین و دنیا سے یک سر غافل و بے خبر ہو کر شب و روز دادِ عیش و طرب دینے لگا۔

شاہ ترکان ترکی کنیز اور حد درجہ کینہ پرور تھی۔ اُس نے بیٹے کی غفلت اور اپنی خود مختاری سے فائدہ اٹھا کر التمش کی متعدد بیویوں کو ذلت و رسوائی سے قتل کرایا۔ شمسی محلات کی بہت سی حسین خواتین اور کنیزیں اس کے ظلم کا نشانہ بن کر غربت و افلاس میں زندگی

کے دن کاٹنے پر مجبور ہوگئیں۔ التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا قطب الدین بھی اُسی کے ایما سے مارا گیا۔ ان وجوہ کی بنا پر ملک میں رکن الدین کے خلاف عام بغاوت اور نفرت پھیل گئی چنانچہ تخت نشینی سے چھ ماہ بعد ہی معزول کر کے قتل کر دیا گیا اور اُس کی جگہ سلطان التمش کی بیٹی سلطان رضیہ کو تخت نشین کیا گیا۔ رضیہ کی نسبت فرشتہ کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سلطان رضیہ میں تمام صفاتِ جہاں داری موجود تھے۔ عقل و فہم اور حسنِ تدبیر و سیاست میں یہ عورت اپنے زمانہ کے بہترین مردوں کے ہم پلہ تھی۔ انسانی فضیلتوں کے جانچنے والوں کو رضیہ میں سوا نسوانیت کے اور کوئی ایسا عیب نہ ملتا تھا جو حکمرانی کے اعلیٰ مرتبہ تک پہونچنے میں اُس کا حائل ہو سکے۔ رضیہ قرآن شریف کی تلاوت بڑے ادب و احترام کے ساتھ کرتی تھی اور مذہبی معلومات کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی اُس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ التمش کے زمانہ سے ہی رضیہ کا ہاتھ مہماتِ سلطنت کے انجام دینے میں کام کر رہا تھا۔ شمسی عہد کے اکثر پیچیدہ مہمات سلطنت رضیہ کی صائب رائے سے ہی سطے ہوتے تھے .... التمش نے گوالیار کے جشن فتح میں اپنے چند خاص امیروں کے سامنے رضیہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور جب اُس سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہا "میں اپنے بیٹوں کے عادات و اطوار سے خوب واقف ہوں۔ اس وقت بھی جب کہ وہ میرے دستِ نگر ہیں دن رات شراب خواری اور عیاشی میں مصروف رہتے ہیں۔ میں ان کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ سلطنت کا بار اٹھا سکیں۔ بخلاف اس کے رضیہ اگرچہ عورت ہے۔ لیکن فہم و فراست کے اعتبار سے حقیقتاً مرد ہے اور اسی وجہ سے میں اسے اپنے بیٹوں پر ہر طرح ترجیح دیتا ہوں[1]

[1] تاریخ فرشتہ (اردو ترجمہ) ج ۱ ص ۲۵۷۔

تمام مورخین اس پر متفق ہیں کہ رضیہ واقعی بڑی عقل مند، سمجھ دار، اور فرض شناس تھی۔ وہ مردوں کا لباس پہن کر دربارِ عام کرتی تھی۔ گھوڑے پر سوار رہتی تھی۔ لیکن باغیوں کا قلع قمع کرنے اور سلطنت کی بنیادیں مستحکم کر لینے کے بعد بعض اسباب و وجوہ سے خود اس کے قابلِ اعتماد ترک امراء میں اُس کی طرف سے جذبۂ بیزاری پیدا ہو گیا۔ جس نے آخر کار شدید بغاوت اور جذبۂ انتقام کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساڑھے تین سال کی حکومت کے بعد اُسے معزول کر کے قتل کر دیا گیا۔

رضیہ سلطانہ کے بعد چھ سال کی مختصر مدت میں دہلی کے تخت پر دو بادشاہ بہرام شاہ اور علاء الدین بیٹھے۔ لیکن یہ دونوں حد درجہ نالائق اور عشرت پسند تھے۔ چنانچہ بہرام شاہ دو سال ڈیڑھ مہینہ تک حکومت کر کے قتل ہوا اور علاء الدین چار سال اور ایک مہینہ کی حکومت کے بعد گرفتار کر کے قید کر دیا گیا اسی حالت میں اُس نے وفات پائی [۱]

اب تمام امراء کے اتفاق سے سلطان شمس الدین التمش کا چھوٹا بیٹا ناصر الدین محمود تخت نشین ہوا۔ ناصر الدین محمود اخلاق و عادات اور مذاقِ طبیعت کے لحاظ سے سلطان شمس الدین التمش کا عکس تھا۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے۔

> یہ بادشاہ شجاعت، عبادت اور سخاوت میں اپنے زمانہ میں بے مثل تھا۔ بادشاہ نے اپنے ذاتی مصارف کا بار کبھی شاہی خزانہ پر نہیں ڈالا۔ اپنے ذاتی مصارف قرآن مجید کی کتابت کر کے پورے کرتا تھا۔ [۲]

نظام الدین احمد مولف طبقات اکبری کا بیان ہے

> سلطان ناصر الدین ہر سال دو قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور

---

[۱] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان شمس الدین التمش کے دو بیٹوں کا نام ناصر الدین محمود تھا۔ اس نام کے ایک بیٹے کا انتقال ۶۲۶ھ میں بمقام لکھنوتی خود التمش کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ التمش کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ کچھ دنوں بعد جب اس کے گھر میں سب سے چھوٹا بچہ پیدا ہوا تو اُس نے مرحوم بیٹے کی یاد قائم رکھنے کی غرض سے اس بچہ کا نام بھی ناصر الدین محمود ہی تجویز کیا۔ [۲] جلد اول ص ۲۶۸

ان ہی کا ہدیہ سلطان کے ذاتی خورد و نوش میں صرف ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بادشاہ کے لکھے ہوئے قرآن مجید کو ایک امیر نے معمول سے زیادہ رقم دے کر ہدیہ لیا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا کہ آئندہ سے اُس کے لکھے ہوئے نسخہائے قرآن مجید کو پوشیدہ طریقہ پر یعنی اُس کا نام بتائے بغیر رائج الوقت پر ہدیہ کیا جائے۔ بادشاہ کے گھر میں اُس کی بیوی کے سوا کوئی لونڈی یا خادمہ کام کرنے کو نہ تھی۔ ایک روز بیوی نے امور خانگی سے تنگ آکر ایک لونڈی خریدنے کی فرمائش کی تو بادشاہ نے جواب دیا "بیت المال بندگانِ خدا کا حق ہے۔ میں اس کا مجاز نہیں ہوں کہ اُس میں سے کچھ روپیہ لے کر اپنے ذاتی آرام کے لیے لونڈی خریدوں۔ دنیا کی تکلیفوں پر صبر کرو۔ خدا آخرت میں اس کا بدلہ دے گا۔[1]

بدایونی کا بیان ہے

وحکایات دیگر غریب کہ مشابہ احوالِ خلفائے راشد باشد از و نقل می کنند

سلطان کی طبیعت چونکہ عبادت اور گوشہ نشینی کی طرف زیادہ مائل تھی۔ اس لیے اُس نے سلطان شمس الدین التمش کے محبوب غلام (اور بقول فرشتہ داماد بھی) غیاث الدین بلبن کو خان اعظم الغ خاں کا خطاب اور چتر و دورباش عطا کر کے عہدۂ وزارت تفویض کر دیا۔ اور سلطنت کے اہم امور میں اُسی پر اعتماد کرنے لگا۔ وزیر سلطنت مقرر کرتے وقت اُس نے بلبن سے کہا "میں نے تمہیں اپنا نائب مقرر کیا ہے اور خلقِ خدا کی باگ تمہارے ہاتھ میں دی ہے۔ تم کوئی کام ایسا نہ کرنا کہ مجھے خدا کے سامنے جواب دہ اور شرمندہ ہونا پڑے"

یہ فراختائی نسل کا ترک اور اسی قوم کے ایک قبیلہ البری کا فرزند تھا۔ جب مغلوں کا سیلاب فتوحات ترکستان کی حدود میں پہونچا تو بلبن بھی ایک مغل کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مغل نے ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور سوداگر نے بغداد لا کر اسے یہاں کے ایک

[1] بحوالہ تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۷ و ظفر الوالہ ج ۲ ص ۷۲۶

مشہور و متدین بزرگ خواجہ جمال الدین کے ہاتھ بیچ دیا۔ خواجہ جمال بلبن اور چند تر کی غلاموں کو ساتھ لے کر ہندوستان پہونچے اور سلطان شمس الدین التمش کی خدمت میں انہیں پیش کیا۔ التمش نے بیش از بیش قیمتیں دے کر ان سب غلاموں کو خرید لیا۔ لیکن بلبن میں آثار رشد و ہدایت پا کر التمش نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی۔ وہ سلطان التمش کے عہد میں "بازدار" یا "خاصہ دار" رہا۔ رکن الدین کے زمانہ میں تمام ہندوستانی ترکوں کا افسر ہو کر پنجاب کے باغیوں کی سرداری کرتا رہا۔ رضیہ سلطان کے عہد میں شاہی فوج کے ہاتوں گرفتار ہو کر نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد رہا ہو کر میر شکار ہو گیا۔ معز الدین بہرام شاہ کے ایام حکومت میں میر شکار کے عہدہ سے ترقی کر کے امیر آخور کے عہدہ پر فائز ہوا۔ اس دور میں اس کو ہانسی اور ریواڑی کے پرگنے جاگیر میں ملے تو اس نے ان غیر مسلم میواتیوں کو زیر کیا جو دار الخلافت کو لوٹ مار سے تاراج کیا کرتے تھے۔ بلبن کے اس کارنامہ نے اس کی شجاعت اور مردانگی کا سکہ بٹھا دیا اور بہرامی دربار میں اسے ایک امتیاز خاص حاصل ہو گیا۔ بہرام کے بعد علاء الدین مسعود کا دور شروع ہوا تو اسے اور فروغ حاصل ہوا اور وہ امیر حاجب کی حیثیت سے سلطنت کے اہم امور و قضایا کا انصرام و انتظام کرتا رہا۔ بعد ازاں سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں وہ جس خود مختاری اور آزادی کے ساتھ وزیر سلطنت کی حیثیت سے حکومت کا کام چلاتا رہا اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ نام ناصر الدین محمود کا تھا اور باقی کام سب بلبن ہی کرتا تھا۔

غیاث الدین بلبن نے اپنی قابلیت اور لیاقت کے علاوہ بادشاہ کے ساتھ اپنی ایک لڑکی کا نکاح کر کے اس کا اور مزید اعتماد بھی حاصل کر لیا اور سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر اپنے ہی معتمد رشتہ داروں کو فائز کر کے اپنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط

لہ فرشتہ نے "بازدار" لکھا ہے جس کے معنی ہیں "شکاری بازوں کا منتظم" لیکن طبقات ناصری کے عام نسخوں میں "خاصہ دار" لکھا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے بلبن بادشاہ کے لیے پان بنانے یا کھانے کا انتظام کرنے پر مامور تھا۔ ۱۲

رہا تھا چنانچہ اس کا چھوٹا بھائی کشلو خان امیر حاجب بنا اور اس کا چچیرا بھائی شیر خان لاہور اور بھٹنڈہ کا گورنر مقرر ہوا۔ ایک مختصر وقفہ کے علاوہ جس میں سلطان نے عماد الدین ریحان نامی ایک شخص اور اس کی جماعت کے کہنے سننے سے بلبن اور اس کے آدمیوں کو عارضی طور پر مناصب حکومت سے الگ کر کے دلی سے چھوڑ دینے کا حکم دے دیا تھا۔ بلبن ناصر الدین کے آخر زمانۂ حیات تک سلطان کا معتمد علیہ رہا اور امور سلطنت خود مختاری کے ساتھ انجام دیتا رہا۔

۱۲۶۶ء میں سلطان ناصر الدین کے انتقال کے بعد وہی تخت نشین ہوا۔ اسے دو مشکلات کا مقابلہ کرنا تھا۔ ایک طرف مغل پنجاب پر حملے کر رہے تھے جن کو علاء الدین مسعود کے عہد میں وہ شکست فاش دے چکا تھا اور دوسری جانب غیاث الدین بلبن کی سخت گیری کی وجہ سے خود اندرون مملکت جگہ جگہ بغاوت اور سرکشی کی آگ بھڑک رہی تھی اور مختلف صوبوں کے گورنروں نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔ غیاث الدین بلبن نے ان سب کا مقابلہ بڑی ہمت اور پامردی سے کیا۔

مغلوں نے بغداد اور نیشاپور پر جو تباہی اور ظلم و ستم ڈھائے تھے اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ خود شمس الدین التتمش اور غیاث الدین بلبن ان دونوں کا یہ کارنامہ ہی کچھ کم اہم نہیں ہے کہ انہوں نے مغلوں کو پے بہ پے شکست دی اور اس وجہ سے ہندوستان ان کی تاخت و تاراج اور تباہ سامانی سے محفوظ رہ گیا۔

غیاث الدین بلبن میں بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چند امیروں نے گجرات اور مالوہ اور بعض اور مقامات جو ایبک اور التتمش کے زمانہ میں اسلامی دائرۂ حکومت میں داخل تھے لیکن اب سرکش ہو گئے تھے ان علاقوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ لیکن بلبن نے مملکت کے اندرونی اور بیرونی حالات کے باعث دلی کو چھوڑنا قرین مصلحت نہ سمجھا اور امراء کی درخواست مسترد کر دی۔[1]

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۸۸

اخلاق وعادات کے لحاظ سے غیاث الدین بلبن مجموعۂ اضداد تھا۔ یعنی ایک طرف اُس کے لطف وکرم کا یہ عالم تھا کہ مغل حملوں کی بلاانگیزی کے باعث جو بادشاہ اور شہزادے ترکستان۔ ماوراالنہر۔ خراسان۔ عراق۔ آذربائجان۔ فارس۔ روم اور شام وغیرہ ملکوں سے تباہ حال ہوکر ہندوستان آگئے تھے بلبن نے اُن سب کو اپنے دامن میں پناہ دی اور اُن کو اپنے دربار کے امرائے کبار میں شامل کیا۔ اُن میں سے دو شاہزادے جو خلفائے بنی عباس کی نسل میں سے تھے پایۂ تخت کے قریب بیٹھتے تھے۔ بلبن کی عادت تھی کہ اس قسم کا کوئی مہمان اُس کے پاس آتا تھا تو اسے بڑی خوشی ہوتی تھی وہ اُن کو پرتپاک خیر مقدم کہتا تھا اور بسا اوقات کسی محلہ کا نام بھی مہمان کے نام پر ہی رکھ دیتا تھا۔ چنانچہ مورخ فرشتہ نے اس قسم کے پندرہ محلوں کے نام درج کیے ہیں علاوہ بریں وہ علماء مشائخ اور ارباب ہنر کا بڑا قدردان تھا۔ علماء کے ساتھ اُس کی عقیدت وارادت اس درجہ کی تھی کہ بقول فرشتہ نماز جمعہ پڑھ کر اُن کے گھر جاتا اور شیخ برہان بلخی مولانا سراج الدین سنجری اور مولانا نجم الدین دمشقی ایسے بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتا تھا طبیعت میں غم زدہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ اس قدر تھا کہ علاوہ نماز جنازہ میں شریک ہونے کے میت کے گھر پر جاتا تھا اور مرحوم کے پس ماندگان کو صبر اور راضی برضا رہنے کی تلقین کرتا تھا اور یتیم بچوں کی پرورش کے لیے گراں بہا وظیفے مقرر کرتا تھا۔ راستہ میں چلتے چلتے اگر کہیں مجلسِ وعظ نظر آتی تھی تو فوراً گھوڑے سے اُتر کر مجلس میں شریک ہوتا اور وعظ میں خدا اور رسول کے احکام بغور سن کر زار زار روتا تھا۔[۱]

باایں ہمہ اُسے سلطنت کا وقار اور حکومت کا دبدبہ وحشم قائم رکھنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ اس بنا پر کسی مخالفت اور قانون کی خلاف ورزی کو ذرا برداشت نہ کرسکتا۔ باغیوں اور سرکشوں کو سخت سے سخت سزائیں دیتا تھا۔ چنانچہ شمسی خاندان کے جن لوگوں پر اُس کو اپنا حریف ہونے کا شبہ تھا اُن سب کو کسی نہ کسی طرح قتل کرادیا۔ قانون کے احترام میں چھوٹے

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۴۶ (اردو ترجمہ)

بڑے کسی کی خرادر و رعایت نہ کرتا تھا" مشہور ہے ایک مرتبہ ایک شاہی امیر ملک لغیق نے جو بدایوں کا صوبہ دار تھا، ایک فراش کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا۔ چند روز بعد بلبن بدایوں آیا تو فراش کی بیوہ نے حاضر ہو کر داد خواہی کی بلبن نے حکم دیا کہ صوبہ دار کو بھی کوڑوں سے مار کر بیوہ کے مرحوم شوہر کے پاس پہونچا دیا جائے حکم شاہی کی فوراً تعمیل کی گئی اور مرنے کے بعد امیر کا جسم عبرت کے لیے شہر کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔ [1]

غیاث الدین بلبن کس مزاج وطبیعت کا انسان تھا اور اُس کے اصول جہاں بانی کیا تھے اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک مرتبہ اُس نے اپنے بیٹوں کو جمع کر کے کہا

"سلطان شمس الدین التمش فرماتے تھے کہ میں نے دو مرتبہ معز الدین محمد بہاء الدین سام کی مجلس میں سید مبارک غزنوی سے سنا ہے کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حد تک پہونچ جاتے ہیں اور ان سے اکثر کام سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن اس پر بھی اگر ان چار چیزوں میں خلل پڑا تو اُس سے بڑھ کر کوئی گناہ گار نہیں ہے۔ اول یہ کہ بادشاہ کو چاہیے اپنی حشمت اور دبدبہ کو مناسب محل اور موقع پر استعمال کرے اور خلق کی بھلائی اور خدا ترسی کے علاوہ کوئی اور بات اُس کے پیش نظر نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی بدکاری کو ملک میں رائج نہ ہونے دے اور ہمیشہ فاسقوں اور بے غیرتوں کو ذلیل و رسوا رکھے۔ تیسرے یہ کہ سلطنت کے کام ہمیشہ عقلمندوں اور شائستہ لوگوں کے سپرد کرے مخلوق کی باگ دیانت دار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ بدعقیدہ لوگوں کو

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۴۴ (اردو ترجمہ)

اپنے ملک میں قدم نہ جمانے دے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ انصاف میں پوری کوشش کرے اور ماتحتوں کے کاموں کو برابر عدل کی ترازو میں تولتا رہے تاکہ ملک میں ظلم اور جبر کا نام بھی نہ سنائی دے۔ اس کے بعد اپنے بیٹوں کو خطاب کرکے کہا کہ تم لوگ جو میرے جگر کے ٹکڑے ہو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کوئی کسی عاجز اور ناچار پر ظلم کرے گا تو میں ظالم کو ضرور سزا دوں گا۔"

غیاث الدین بلبن کا رحم دلانہ اور منصفانہ برتاؤ کسی خاص فریق یا قوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر تمام رعایا کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پروفیسر تاریخ دہلی یونی ورسٹی لکھتے ہیں:

"اس سلسلہ میں ایک خاص دلچسپی کی یہ بات ہے کہ ایک ہندو کتبہ ملا ہے جو کچھ سنسکرت میں ہے اور کچھ ہریانہ کی زبان میں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مسلمان بادشاہوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

یہ کتبہ سنہ ۱۲۸۰ء سے متعلق ہے جبکہ سلطان غیاث الدین بلبن تخت نشین تھا اس میں مسلمان فرماں رواؤں کی تعریف کی گئی ہے اور خاص طور پر بلبن کی نسبت لکھا ہے" اس بادشاہ کی پرسکون اور مطمئن حکومت میں ڈراوادی ملک اور رمیشورم سے اور غور سے غزنہ تک ہر جگہ زمین بہار صحرا کا منظر پیش کرتی ہے اس کی فوجیں امن و امان کی ضامن ہیں۔ جس سے ہر شخص بہرہ اندوز ہوتا ہے سلطان اپنی رعایا کی دیکھ بھال میں اس درجہ مستعد ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے وشنو دیوتا نے دنیا کی خبر رکھنا ترک کر دیا ہے اور وہ دودھ کے سمندر پر سونے چلا گیا ہے"۔[۱]

کہتے ہیں امارت کے زمانہ میں بلبن کو شراب نوشی کی عادت تھی۔ لیکن بہرحال

---

[۱] دہلی سلطنت کا نظم و نسق (انگریزی) ص ۲۲۸

یہ واقعہ ہے کہ تخت حکومت پر قدم رکھتے ہی اُس نے اس اُمّ الخبائث کو منہ لگانے کی قسم کھالی بلکہ کبائر کا نام تک ملک سے مٹا دیا اور ہمیشہ نماز روزہ کا پابند رہا۔ فرائض کے علاوہ تہجد اور اشراق و چاشت کی نماز بھی کبھی قضا نہیں کی۔ ہر وقت باوضو رہتا تھا۔[1]

چالیس سال کی حکومت کے بعد ۶۸۵ھ میں غیاث الدین نے وفات پائی صبح کو قبرستان جانے کے لیے جنازہ محل شاہی سے چلا تو بڑے بڑے اعیان و امرا اور خود محل کے ملازموں اور غلاموں کا فرطِ غم و الم سے یہ حال تھا کہ سر برہنہ اور گریباں چاک تھے کوئی ایسا نہ تھا جس نے سر پر مٹی نہ ڈالی ہو لوگ روتے تھے اور رلاتے تھے۔ سب سے زیادہ اثر ملک الامرا فخر الدین پر تھا۔ کہتے ہیں بلبن کی وفات سے چھ ماہ بعد تک وہ زمین پر ہی سوتے رہے۔ دہلی میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس نے مرحوم سلطان کے لیے صدقہ اور خیرات کرکے اُس کی روح کو ثواب نہ پہونچایا ہو۔[2]

بلبن کی وفات کے بعد اُس کا پوتا کیقباد جو بغرا خاں گورنر بنگالہ کا بیٹا تھا تخت نشین ہوا لیکن یہ نہایت نالائق اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ دربار میں حسین و جمیل سازندوں اور مطربوں کا ہجوم رہنے لگا۔ مسخروں اور بھانڈوں کی قدر ہونے لگی۔ صاحب طبقات اکبری کا بیان ہے۔

لولی و مسخرہ و مطرب و مطربہ از اطراف و جوانب عالم رو بدرگاہِ او آوردند۔ و
چوں ایں طائفہ را در ہند اقسام بسیار است کار لہو و لعب رواجِ عظیم پیدا کرد
و ابواب فسق و فجور مفتوح ...... و دائم مجلس سلطان از خوبرویان و
خوش آوازان و مردم ظریف و ندمائے شیریں کلام مملو و معمور بود"[3]

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۸۶ [2] ظفر الوالہ بمظفر و آلہ ج ۲ ص ۷۳۴ [3] طبقات اکبری مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ج ۱ ص ۱۰۶

باپ بغرا خاں کو اس کا علم ہوا تو اُس نے بیٹے کی گوش مالی کے لیے دہلی پر فوج کشی کی۔ مگر جنگ کی نوبت نہ آئی تھی کہ کیقباد نے باپ کی نصیحتوں پر کاربند ہونے کا عہد کیا۔

باپ کے واپس بنگالہ چلے جانے کے بعد کچھ دنوں وہ اس پر عامل بھی رہا۔ لیکن ایک اتفاقی واقعہ سے متاثر ہو کر اُس نے توبہ توڑ دی اور پھر پہلے کی طرح داد عیش و عشرت دینے لگا۔ آخر کار ساڑھے تین سال تک اس طرح حکومت کرنے کے بعد چند ترکوں نے اس کو جب کہ وہ مرض فالج میں گرفتار تھا قتل کر دیا اور اُس کے بعد جلال الدین خلجی جو پنجاب کا گورنر تھا سب کے اتفاق سے تخت نشین ہوا۔ اس طرح ۸۴ سال کے بعد خاندانِ غلامان کا خاتمہ اور خلجی سلطنت کا آغاز ہوا۔

خلجی خاندان | خلجی قوم تاتاری نسل سے تھی۔ مگر ایک مدت سے شمال اور مغربی افغانستان میں آبسی تھی۔ نظام الدین احمد بخشی مولف طبقات اکبری نے کہا ہے کہ یہ لوگ چنگیز خاں کے داماد قالج خاں کی نسل سے ہیں۔ اس نسبت سے قالجی کہلاتے تھے۔ الف کثرتِ استعمال سے گر گیا اور ق۔ خ سے بدل گیا۔[۱] بہرحال ہندوستان میں خلجی خاندان کا پہلا بادشاہ جلال الدین تھا۔ جو کیقباد کے قتل کے بعد تخت نشین ہوا تھا اس کی زندگی کا بہترین زمانہ پنجاب میں مغلوں کے حملوں کو پسپا کرنے میں بسر ہوا تھا۔ اب بڑھاپے میں دہلی کا تخت نصیب ہوا لیکن چونکہ عام طور پر لوگ جلال الدین کی بادشاہت کو پسند نہ کرتے تھے اس لیے اُس نے کیلوکھری میں قیام کر کے ایک شہر نو کی بنیاد ڈالی اور شہر دہلی میں آ کر تخت شاہی پر جلوس نہیں کیا۔ لیکن بقول صاحب طبقات اکبری جب لوگوں کو جلال الدین کی خدا ترسی، بردباری۔ حیا اور عدل و احسان کا علم ہوا تو چھوٹے بڑے سب شہر سے آئے اور جلال الدین کے ہاتھ پر بیعت کی۔[۲] اب سلطان بڑے جاہ و حشم اور ایک آراستہ و پیراستہ لشکر کے ساتھ

---

[۱] طبقات اکبری ج ا ص ۱۱۶ [۲] ایضاً ص ۱۱۷

شہر میں داخل ہوا اور دولت خانہ میں (جہاں محلات شاہی تھے) پہونچکر گھوڑے سے اترا دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور پھر تخت شاہی پر جلوس کرنے کے بعد کہا "میں نے سالہا سال تک اس تخت کے آگے سر جھکایا ہے لیکن آج میں اس پر پاؤں رکھ رہا ہوں اس احسان خداوندی کے شکر سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

جیساکہ ابھی بیان ہوا۔ جلال الدین نہایت نیک طینت منکسر المزاج اور حلیم و بردبار تھا۔ شاہی میں بھی اسے اوائل عمر کے واقعات یاد تھے۔ چنانچہ جب وہ دولت خانہ میں رسم تخت نشینی سے فارغ ہو کر غیاث الدین بلبن کے محل کوشک لعل کے دروازہ پر پہونچا تو رسم قدیم کے مطابق پاپیادہ ہو گیا۔ عمدۃ الملک ملک احمد حاجب بار بک ہم رکاب تھا اُس نے کہا "اب تو یہ کوشک آپ کا ہی ہے پھر اس کے احترام میں گھوڑے سے اترنا کیوں کر موزوں اور مناسب ہے؟ سلطان نے جواب دیا "اپنے ولی نعمت کی عزت کا خیال رکھنا ہر حال میں ضروری ہے" ملک احمد پھر بولا "سلطان کو اب اسی کوشک میں کہ دارالامارت ہے قیام فرمانا چاہیے" سلطان نے کہا "اس کوشک کو سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنی بادشاہت کے زمانہ میں بنوایا تھا اب یہ سلطان کی اولاد کی ہی ملک ہے اس میں میرا کوئی حق نہیں ہے" ملک احمد نے جواب دیا "امور سلطنت میں اس طرح کے تقید اور اس درجہ احتیاط کی گنجائش کہاں ہے؟" سلطان نے فرمایا "من از برائے مصلحت ملک چند روزہ چگونہ از قواعد اسلام بیروں آیم و بر خلاف نفس الامر کارے کنم"

کجا عقل یا شرع فتویٰ دہد

کہ اہل خرد دین بدنیا دہد

تخت نشینی کے دوسرے سال سلطان بلبن کے بھتیجہ ملک چھجو نے بغاوت کی اور خطبہ و سکہ اپنے نام کا جاری کر کے سلطان مغیث الدین کے نام سے حکومت کرنے لگا

بہت سے امرا اس کے حامی ہو گئے اب اس نے دہلی کا رخ کیا سلطان جلال الدین اپنے فرزند اکبر خان خانان کو شہر دہلی میں اپنا قائم مقام بنا کر ملک جھجو کے مقابلہ کے لیے شہر سے نکلا شدید معرکہ آرائی کے بعد دشمن کو شکست فاش ہوئی اور اکثر اعیان و امرا گرفتار کر کے خدمت سلطانی میں روانہ کر دیے گئے ملک جھجو بھی اسیر ہو کر بارگاہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے ان سب کو آزاد کر دیا بلکہ ان میں سے چند خاص لوگ جو سلطان بلبن کے یہاں قدر و منزلت رکھتے تھے اُن کے متعلق اُس نے حکم دیا کہ ان کو حمام میں لیجا کر غسل کرایا جائے اور خلعت ہائے خاصہ پہنا کر اُن کے عطر ملا جائے یہ لوگ سلطان کے وفور کرم سے حد درجہ نادم تھے اور شرم کے مارے ایک لفظ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ سلطان نے ان کی یہ حالت دیکھ کر کہا "تم لوگوں نے اپنے ولی نعمت کا حق ادا کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہے یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے" اب رہا ملک جھجو تو اس کو محافہ پر سوار کرا کے ملتان بھیج دیا اور تاکید کر دی کہ اسے بحرمت تمام وہاں پہونچا دیا جائے اور عیش و عشرت کی جو چیزیں درکار ہوں وہ اس کے لیے مہیا کر دی جائیں۔ ملک احمد حبب اور دوسرے امرا نے کہا کہ "ملک جھجو اور اس کے ساتھی سب کے سب واجب القتل تھے ایسے لوگوں کے ساتھ رو رعایت اور کرم و نوازش کا معاملہ کرنا آئین جہاں داری کے خلاف ہے" سلطان نے جواب دیا

> "آنچہ شما می گوئید ہمہ صواب و موافق تدبیر جہان داری ست۔ اما چکنم ہفتاد
> سال در مسلمانی گذرانده وخون ہیچ مسلمانے نریختہ ام۔ اکنوں کہ پیر شده ام
> و آخر عمر است نمی خواہم کہ خون مسلماں بریزم" [۱]

۶۸۹ھ میں سلطان نے قلعہ رنتھبور کو فتح کرنے کے لیے لشکر کشی کی۔ راجہ قلعہ بند ہو بیٹھا تو چند روز تک محاصرہ کرنے کے بعد سلطان نے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔

---

[۱] طبقات اکبری ص ۱۲۱

اور کہا "یہ قلعہ اتنا اہم نہیں ہے کہ اُس کو فتح کرنے کے لیے ایک جان کی قربانی بھی پیش کی جاسکے اور بالفرض اگر میں نے یہ قلعہ فتح کر بھی لیا اور خدا کے بندوں کو قتل کرا دیا تو کل جب عورتیں بیوہ ہو کر اور بچے یتیم ہو کر میرے سامنے آئیں گے اور میری نظر اُن پر پڑے گی تو میرا کیا حال ہوگا۔ قلعہ کی فتح کی ساری لذت مجھ پر زہر سے زیادہ تلخ ہوجائے گی"۔[۱]

ایک مرتبہ سلطان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ میں نے مغلوں سے بارہا جنگیں کی ہیں اور اُن میں کامیاب رہا ہوں پھر کیوں نہ مجھ کو خطبہ میں "المجاھد فی سبیل اللہ" کے لقب سے یاد کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنی بیوی ملکۂ جہاں سے کہا کہ کسی تہنیت کی تقریب سے اعیان و اکابر محل میں آئیں تو بیگم اُن سے کہیں کہ یہ لوگ مجھ سے خطبہ میں اس خطاب کے استعمال کرنے کا ذکر کریں اور اس کے لیے مجھ سے اجازت طلب کریں لیکن جب اس قرارداد کے مطابق قاضی فخر الدین نے جو علامۂ عصر تھے اعیان و اکابر کی نمائندگی کرتے ہوئے سلطان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو سلطان کو تنبہ ہوا اور اُس نے کہا مجھے معلوم ہے آپ لوگ میرے کہنے کے مطابق ملکۂ جہاں کے ایما سے یہ کہہ رہے ہیں لیکن مجھ کو اُسی وقت یہ خیال آیا تھا کہ میں نے دشمنانِ خدا سے جتنی لڑائیاں لڑی ہیں اُن میں سے کوئی جنگ بھی ایسی نہیں ہے جو میں نے غرضِ دنیوی کے شائبہ کے بغیر محض خدا کے لیے لڑی ہو اس خیال کے آتے ہی میں اپنی خواہش پر پشیمان ہوا اور اب میں نے اپنے ارادہ سے رجوع کرلیا ہے"۔[۲]

ان واقعات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ سلطان طبعًا بڑا رحمدل، نیک طینت اور مزاج کا نرم تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس کی یہ نرم خوئی بعض اوقات بالکل بے موقع اور بے محل ہوتی تھی چنانچہ نظام احمد بخشی کا بیان ہے

[۱] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۲۷-۱۲۸ [۲] ایضاً ص ۱۲۴

"درجرمے کہ از نزدیکان او بوقوع آمدے ہیچ یک را لت و بند نفرمودے و
ہر کرا جاگیر دادے ہرگز تغیر نکردے۔"

اس حد درجہ نرم خوئی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک میں فتنہ و فساد اٹھ کھڑا ہوا اور شہری زندگی کا امن و امان فنا ہو گیا۔ چور اور راہزن سلطان کے دربار میں گرفتار کر کے لائے جاتے تھے اور سلطان اُن کو کسی قسم کی سزا دیے بغیر محض آئندہ کے لیے چوری نہ کرنے کی قسم لے کر رہا کر دیتا تھا۔ لوگ شراب کے نشہ سے بدمست ہو کر سلطان کے خلاف سخت باغیانہ باتیں کہتے تھے۔ لیکن ان تمام باتوں کا علم ہونے کے باوجود سلطان یہ کہہ کر چشم پوشی کر لیتا تھا کہ ان لوگوں نے مستی کے عالم میں یہ باتیں کہی ہیں اس لیے ان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس قسم کے اور دوسرے لوگ جو سلطان کی علانیہ ہجو کرتے تھے جب دربار میں پکڑے لائے جاتے تھے تو سلطان نہ صرف یہ کہ انہیں رہا کر دیتا تھا بلکہ انہیں اپنا ندیم خاص بنا لیتا اور انہیں خلعت و اکرام دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک شخص "مندا ہری" نے جلال الدین کی گورنری سامانہ کے زمانہ میں اُس کے چہرہ پر ایک ایسا کاری زخم لگایا تھا کہ اُس کا نشان آخر عمر تک رہا۔ لیکن اس کے باوجود جلال الدین کے بادشاہ ہو جانے کے بعد جب یہ شخص دربار میں گرفتار کر کے لایا گیا تو سلطان نے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف جلال الدین یہ کہتا ہے کہ "چند روزہ سلطنت کے لیے میں احکام اسلامی سے سرتابی کیوں کروں" اور دوسری جانب اُس کے محل میں شراب خوری کا دور بھی چلتا تھا اور حسین و جمیل مغنیوں اور ارباب نشاط کی محفلیں بھی گرم رہتی تھیں۔ امیر خسروؔ ہر روز ایک نئی غزل لکھ کر لاتے تھے اور سازندے اسے ساز پر گا کر سناتے تھے[1]

[1] امیر خسرو نے ذیل کا شعر غالباً جلال الدین خلجی کو ہی مخاطب کر کے کہا ہے:
گلستانیست خاک آستانت از رخ خوباں — کہ مرغ آں گلستاں خسرو سحر البیان آمد

ضیاء الدین برنی نے ان مجالس کا تذکرہ بڑے آب و تاب کے ساتھ کیا ہے بادشاہ کی حد سے زیادہ نرم خوئی اور ان مجالس کا چرچا ملک میں عام ہوا تو لوگوں میں اُس کی طرف سے عام بددلی پیدا ہوگئی اور انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ "این مرد جہاں داری و بادشاہی نمی داند" اسی اثنا میں ایک ناگوار واقعہ یہ پیش آیا کہ سیدی مولہ جو ایک بڑے بزرگ تھے اور جن کی دہلی میں ایک بڑی خانقاہ تھی، بغاوت اور بادشاہ کے خلاف سازش کے شبہ پر بڑے دردانگیز طریقہ پر سلطان کے ایماء سے قتل کیے گئے اس واقعہ نے تمام ملک میں آگ لگادی۔

ایک طرف ملک میں جلال الدین کے متعلق اس قسم کی باتیں مشہور تھیں جن سے اُس کو ہر دل عزیزی حاصل نہیں رہی تھی اور دوسری طرف بادشاہ کا بھتیجہ علاء الدین خلجی متعدد فتوحات کی وجہ سے زور پکڑتا جارہا تھا یہاں تک کہ ایک مکمل اور گہری سازش کے تحت اُس نے چچا کو کڑہ بلایا اور وہاں نہایت بے رحمی کے ساتھ جب کہ آفتاب غروب ہورہا تھا اور جلال الدین مسافر ہونے کے باوجود روزہ سے تھا اسے قتل کرادیا اور اُس کے سر بریدہ کو ایک نیزہ پر آویزاں کر کے شہر کی گلی کوچوں میں گشت کرایا۔ جلال الدین خلجی کی مدتِ حکومت سات برس چار مہینے ہے[1]۔ یہ واقعہ ماہ رمضان ۶۹۵ھ میں پیش آیا۔

جلال الدین کی بیگم ملکۂ جہاں نے اس وقت سوءِ تدبیر سے کام لیا چونکہ شہزادہ ارکلی خاں اس وقت ملتان میں تھا بیگم نے اپنے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم کو ذوعمری اور معاملاتِ سلطنت سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود اور ارکان و عمائد سے مشورہ کیے بغیر تختِ حکومت پر بٹھادیا۔ ارکلی خاں جو جلال الدین کی جانشینی کا ہر طرح اہل اور سزاوار تھا چھوٹے بھائی کی تخت نشینی کا حال معلوم کر کے ملتان میں ہی رہ پڑا اور اس طرح دہلی کے حالات ایک عورت کی ناقص العقلی اور ضد کی وجہ سے بدسے بدتر ہوگئے

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۵۲

علاء الدین خلجی

علاء الدین خلجی کو ان حالات کی خبر ہوئی تو اب اُس نے دہلی پر حملہ کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ جود و عطا اور فیاضی و بخشش کی گنگ وجمن بہاتا اور اس طرح اپنی طاقت اور لشکر کی تعداد میں اضافہ کرتا ہوا دہلی کی طرف روانہ ہوا اور آخرکار دو تین معمولی جھڑپوں کے بعد ۲۲ر ذی الحجہ ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۶ء کو وہ شہر میں فاتحانہ داخل ہوا اور تختِ سلطنت پر جلوس کیا اس موقع پر شہر کی آئین بندی جس طریقہ پر کی گئی مورخ فرشتہ اُس کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے۔

"جلوس کے بعد بادشاہ کوشک لعل میں داخل ہوا اور اس کو اپنا دار الخلافت بنا کر تین دن جشن عیش و عشرت میں مشغول ہوا۔ رعایا نے بھی شہر میں آئین بندی کی اور جا بجا عیش و عشرت کی محفلیں گرم ہوئیں ہر گلی کوچے میں شراب کی سبیل رکھی گئی اور لہو و لعب کا بول بالا ہوا بادشاہ نے بھی غرور دولت اور نشۂ جوانی میں سرشار ہو کر اتنی عیش پرستی کی اور رعایا کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ جلال الدین خلجی کے بے گناہ مارے جانے کا غبار لوگوں کے دلوں سے بالکل جاتا رہا۔" [1]

ایک طرف غیروں اور بیگانوں کے ساتھ اُس کا یہ فیاضانہ معاملہ تھا کہ امیروں کو خطابات دیے عہدہ داروں کے عہدوں اور مناصب میں ترقی دی زر و جواہر کی بارش سے امید و ارمان کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے محسن اور مربی چچا کے ساتھ

[1] تاریخ فرشتہ ج ا ص ۳۵۷

دو بیٹوں ارکلی خاں اور رکن الدین ابراہیم اور اُس کے داماد الغوخاں کے ساتھ اُس نے یہ سفاکانہ معاملہ کیا کہ پہلے ان کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر انہیں نابینا کر دیا اور پھر ہانسی کے قلعہ میں نظر بند اور ارکلی خاں کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا۔ علاوہ بریں جلال الدین خلجی کی بیگموں اور اُس کی بہوؤں اور ملکۂ جہاں کو بھی دہلی لاکر نظر بند کر دیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ عہد جلالی کے جو اعیان و امرا جلال الدین خلجی کی اولاد سے بیوفائی کر کے اُس سے سازباز کر بیٹھے تھے استحکام سلطنت کے بعد علاء الدین نے ان پر بھی رحم نہیں کیا اور انہیں گرفتار کر کے مختلف سزائیں دیں جن سے ان لوگوں کے خاندانوں کا نام و نشان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور خود اُن کی تمام دولت واملاک پر قبضہ کر کے ایک کروڑ روپیہ کے قریب شاہی خزانہ میں جمع کیا۔

علاء الدین کی سلطنت کے ابتدائی دو سال مغلوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں صرف ہوئے۔ ان کو اُس نے شکست فاش دے کر پنجاب سے نکال دیا۔ تیسرے سال اُس نے گجرات پر حملہ کیا۔ راجا تاب مقاومت نہ لا کر بھاگا اور اُس کا ملک مقبوضات علائی میں شامل ہو گیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر اُس نے راجپوتوں کی طرف رخ کیا۔ مسلمانوں نے جب شمالی ہندوستان پر قبضہ کیا تھا تو بہت سے راجپوت امرا اپنی بچی کھچی دھن دولت کے ساتھ راجپوتانہ بھاگ آئے تھے اور یہاں انہوں نے چھوٹی چھوٹی آزاد و خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں اور پھر اپنے بچاؤ کے لیے انہوں نے ایک وفاق بنا لیا تھا جس کا رئیسِ اعلیٰ چتور کا راناتھا۔ رنتھبور کا قلعہ فتح کرنے اور یہاں کے لوگوں کا قتل عام کرنے کے بعد اُس نے چتور پر فوج کشی کی لیکن چھ ماہ تک اس کا محاصرہ کرنے کے باوجود وہ اسے فتح نہ کر سکا اور آخر کار بعض شرائط پر صلح ہو گئی۔

علاء الدین خلجی کی مدت حکومت بیس سال ہے اس مدت میں اُس نے فوجی قابلیت

اور فتوحات کے باعث سلطنت کے حدود اتنے وسیع کر دیے کہ اپنے تمام پیش رووں سے سبقت لے گیا۔

علاء الدین کی خودسری اور انانیت

لیکن ان فتوحات نے اُس میں خودسری اور انانیت پیدا کر دی۔ چنانچہ اُس نے اپنے لیے سکندر ثانی کا لقب اختیار کیا اور حکم دیا کہ خطبوں میں اور سکوں اور طغروں میں اُس کے نام کے ساتھ اس لقب کا بھی اضافہ کیا جائے۔ سکندر ثانی بننے کے ہی شوق میں اُس نے یہ ارادہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان سے باہر نکل کر پہلے وہ خراسان ماوراء النہر اور ترکستان فتح کرے اور پھر آگے بڑھ کر روم فارس، عراق عرب۔ عجم۔ شام اور حبش وغیرہ کو بھی اپنے زیر نگیں لے آئے۔

ایک طرف اُس کے دماغ میں جہاں گیری و کشور کشائی کا یہ سودا ایک رہا تھا اور دوسری جانب چونکہ وہ جاہل اور اَن پڑھ تھا اور مذہب سے واقفیت نہ رکھتا تھا اس لیے اُس کے سر پر اس بات کا جنون بھی سوار ہوا کہ "جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوت و شوکت سے شریعت قائم کی اور آپ کے خلفاء اربعہ کے ذریعہ اسے استحکام نصیب ہوا اسی طرح وہ بھی ایک نیا مذہب اختیار کرے اور اپنے مشیرانِ کار کی مدد سے اس کو رائج کرے۔ علاء الدین سمجھتا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اُس کا نام دُنیا میں قیامت تک باقی رہے گا۔"[1]

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علاء الدین جو کچھ کرتا تھا اُس میں صحیح مذہبی جذبہ کا دخل نہ تھا بلکہ اُس کے کارناموں اور فتوحات کا اصل مقصد شہرت و نام وری اور جمع دولت و ثروت تھا۔ علاء الدین بہت سی باتوں میں اکبر سے قریبی مشابہت رکھتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ خوش قسمتی سے اسے کوتوال علاء الملک اور قاضی مغیث ایسے حق گو اور صداقت شعار لوگ مل گئے جن کی وجہ سے علاء الدین کو اپنی گمراہی اور غلطی پر فوراً

---

[1] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۴۴-۱۴۵

تنبہ ہوا اور وہ ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کی لغویت سے محفوظ رہا۔ اس سلسلہ میں علاء الملک نے جان ہتھیلی پر رکھ کر جابر وقاہر بادشاہ کے سامنے جو تقریر کی اُس کا خلاصہ یہ ہے۔

"دین و شریعت کا تعلق انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہے اور اُن کی نبوت وحی آسمانی سے وابستہ ہے۔ منصب نبوت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا حال سُن کر عام وخاص اور چھوٹے بڑے سب آپ سے متنفر ہو جائیں گے اور سلطنت میں فسادِ عظیم پیدا ہو جائے گا۔ بادشاہ کو معلوم ہے کہ چنگیز خاں اور اُس کی اولاد نے برسوں کوشش کی کہ دینِ محمدی کو مٹا کر اپنے دین کو جو ہزاروں سال سے ترکستان میں رائج تھا جاری کریں اور اسی خیال سے انہوں نے لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا لیکن اُن کی کوشش بار آور نہ ہوئی اور آخر کار یہ سب لوگ خود مسلمان ہو گئے۔"[1]

علاء الملک کی صاف گوئی کا بادشاہ پر خاطر خواہ اثر ہوا اور اُس نے کافی غور و خوض اور تامل کے بعد کہا

"آنچہ تو گفتی ہمہ صواب و موافق نفس الامر ست۔ باید کہ من بعد ایں قسم سخن از من صادر نہ شود"[2]

اب علاء الدین نے کہا کہ "اچھا دوسری بات یعنی دنیا کو فتح کرنے کے منصوبہ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" علاء الملک نے جواب دیا

بادشاہ کا دوسرا خیال بالکل صحیح ہے کیونکہ اس وقت جو ہم آپ کی بلند ہمتی کی وجہ سے آپ کے پیشِ نظر ہے اس سے پہلے دوسرے بادشاہوں نے بھی غور کیا ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ بادشاہ کو جو قوت و شوکت اور خزانہ و لشکر حاصل ہے

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۶۵-۳۶۶ [2] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۴۵

اُس کی مدد سے اس مہم کو سرانجام دے دینا چنداں دشوار نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب بادشاہ پائے خلافت کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں پر حملہ آور ہو گا اور عرصۂ دراز تک اجنبی ملکوں میں رہے گا تو یہاں ایسا کون سا امیر ہے جو بادشاہ کی غیر موجودگی میں کاروبار سلطنت کو انجام دے اس کے علاوہ جب بادشاہ کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد جب اپنا ایک نائب وہاں مقرر کر کے کسی دوسرے ملک کا رخ کرے گا تو کیا پتہ ہے کہ وہ نائب دارالسلطنت کا وفادار بھی رہے گا۔

علاء الملک نے یہ بھی کہا کہ بادشاہ کو سکندر پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ سکندر کے زمانہ میں غداری، نمک حرامی اور بے وفائی کا وجود بہت کم تھا پھر اُس کو ارسطو جیسا ہوشیار اور عاقل و فرزانہ وزیر ملا ہوا تھا جس کی حسن تدبیر کے باعث مفتوحہ ممالک کے معاملات بگڑنے نہ پاتے تھے"

علاء الدین خلجی نے یہ تقریر سُن کر پوچھا کہ "اچھا اگر میں عزم جہاں کشائی فسخ کر دوں اور صرف دہلی کی سلطنت پر قناعت کر کے بیٹھ رہوں تو یہ خدم و حشم اور یہ بھرپور خزانے کس کام آئیں گے ؟" علاء الملک نے کہا

اس وقت دو ایسی مہیں بادشاہ کے پیشِ نظر ہیں کہ تمام اندوختہ خزانہ ان کے سر کرنے میں صرف ہو سکتا ہے۔ پہلی مہم شمال و جنوب اور مشرق میں ہندوستان کی سرحد کے بعض شہروں کا فتح کرنا ہے اور دوسری مہم مغلوں کا سدباب ہے ان دونوں مہموں سے فارغ ہو کر بادشاہ اطمینان سے دار الخلافت میں قیام کرے اور لائق اعتماد امیروں کو ہر چہار سمت فتوحات کے لیے روانہ کر دے۔

آخر میں علاء الملک نے کہا

یہ تمام باتیں اُسی وقت ممکن ہیں جب کہ بادشاہ بادہ نوشی، عیش پرستی اور سیر و شکار

کو کم کرکے خود ان امور کی نگرانی کرے۔

علاء الدین خلجی پر اس مخلصانہ تقریر کا بڑا اثر ہوا اور اس نے علاء الملک کی اصابت رائے اور حسنِ تدبیر کی بہت تعریف کرکے اسے بیش قیمت انعامات و اکرامات سے سرفراز کیا جو امراء کہ اس خاص مجلس میں شریک تھے وہ بھی اس تقریر سے اتنے خوش ہوئے کہ ان میں سے ہر ایک نے علاء الملک کو ہزاروں تنگے اور دو گھوڑے انعام میں بخشے۔ حضرت شیخ نظام الدینؒ اولیاء علاء الدین خلجی کی خودسری اور اس کی گمرہی کی خبریں سُن سُن کر بڑے رنجیدہ اور آزردہ خاطر ہوتے تھے۔ آپ کو جب علاء الملک کی اس تقریر کا علم ہوا تو بڑے خوش ہوئے اور آپ نے علاء الملک کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ ؎[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث کا ہے۔ دونوں کی گفتگو اگرچہ طویل ہے لیکن ہم ذیل میں اس کے اکثر حصے نقل کرتے ہیں۔ قارئین کو اس سے اندازہ ہوگا کہ جابر سے جابر بادشاہ کے سامنے بھی علماء حق کس بے باکی اور بے خوفی سے گفتگو کرتے تھے اور امور سلطنت کی تشکیل و تعمیر میں ان کا کتنا بڑا دخل تھا مورخ فرشتہ کا بیان ہے۔

> جب شاہی گماشتوں کی عرضیاں بادشاہی ملاحظہ میں آنے لگیں تو اس ضرورت نے بادشاہ کو کچھ نوشت و خواند پر مجبور کیا اور علاء الدین نے اتنی استعداد بہم پہونچائی کہ شکستہ خط کو آسانی سے پڑھ لیتا تھا اس تقریب سے بادشاہ نے فارسی کی چند کتابوں کا مطالعہ کرکے علماء سے کلمہ و کلام کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اس حالت کو پہونچ کر بادشاہ کا فاسد عقیدہ درست ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ علماء اور قاضی اور مفتی پاک باطن اور نیک نیت ہیں یہ لوگ دنیاوی طمع میں گرفتار ہو کر اپنی طرف سے مسائل نہیں گھڑتے۔ اب بادشاہ کبھی کبھی علماء کی

؎[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۶۶-۳۶۷

صحبتوں میں بیٹھتا اور اُن سے شرعی مسئلے پوچھتا تھا۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے قاضی مغیث بیانوی سے مخاطب ہو کر کہا "میں آپ سے چند مسائل دریافت کرنا چاہتا ہوں"۔ چونکہ بادشاہ نے تمام عمر کبھی علماء سے بات نہ کی تھی اور ہمیشہ ان کو حیلہ ساز اور مکار سمجھ کر ان کو قابل مشورہ نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے قاضی مغیث الدین بادشاہ کے اس خلافِ عادت خطاب سے ڈرے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت آگیا ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ بادشاہ مسئلہ پوچھنے کی زحمت کیوں گوارا فرمائیں۔ شاہی ملازمین کو حکم ہو جائے کہ میرا سر قلم کر دیں کیونکہ جو کچھ آپ دریافت فرمائیں گے اگر اُس کا صحیح جواب عرض کیا گیا تو ممکن ہے آپ کی مرضی کے خلاف ہو اور اس بنا پر میرے قتل کا باعث بنے اور اگر میں نے بادشاہ کی خوشنودی اور رضامندی کی رعایت سے جواب غلط عرض کیا تو کل جب آپ اور علماء سے اس کے متعلق استفسار کریں گے اور وہ میری تصدیق نہ کریں گے تو پھر دروغ بیانی کے جرم میں مجھ سے بازپرس ہو گی اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ بھی ہلاکت ہی ہے۔ یہ سُن کر بادشاہ ہنسا اور بولا کہ "جو کچھ میں آپ سے پوچھوں آپ اس کا جواب شریعتِ اسلام کے مطابق دیجیے اور یہ یقین رکھیے کہ سچ سے آپ کو کوئی ضرر نہ پہونچے گا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی نے قاضی صاحب سے چند سوالات کیے۔

پہلا سوال یہ تھا کہ شریعتِ اسلام کی رو سے کس ہندو کو ذمی یا خراج گذار کہہ سکتے ہیں؟ قاضی صاحب نے جواب دیا اسلام نے ان غیر مسلموں کو ذمی قرار دیا ہے جو بادشاہ اسلام کے گماشتوں کے طلب کرنے پر بلا عذر خراج اور مال ادا کر دیں۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ "اگر شاہی گماشتے کچھ رقم بہ طور رشوت لے لیں تو اس رقم کو چوری یا سرقہ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟" قاضی صاحب نے کہا

اگر شاہی گماشتے اپنی معمولی تنخواہ سے جو ان کی ضرورتوں کو کافی ہو کچھ زائد وصول کرلیں تو اس رقم کو سختی کے ساتھ اُن سے واپس لے لینا چاہیے لیکن ہاتھ کاٹنے کی سزا جو چوروں کے لیے مخصوص ہے رشوت ستانوں پر جاری نہیں ہوسکتی۔ تیسرا سوال یہ تھا کہ جو مال و دولت میں نے سلطنت کے تخت پر بیٹھنے سے پہلے دیوگڈھ سے حاصل کیا تھا وہ بیت المال کی امانت اور مسلمانوں کی ملکیت ہے یا میرا حق ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا" اس مال میں بادشاہ کا حق بھی ان مسلمانوں کے برابر ہے جو مال کے حاصل کرنے میں بادشاہ کو مدد دیتے رہے ہیں۔ علاءالدین خلجی اس جواب سے ناراض ہوا اور کہا کہ جو رقم میں نے اپنی امارت کے زمانہ میں حاصل کی اور وہ شاہی خزانہ میں داخل نہیں ہوئی وہ کس طرح بیت المال کی سمجھی جاسکتی ہے؟ قاضی صاحب بولے کہ" جو دولت بادشاہ خود اپنے بازو کی قوت سے حاصل کرے وہ اس کی ہے اور جو خزانہ کہ اسلامی لشکر کی مدد سے جمع کیا جائے اُس میں عام جاں باز مسلمانوں کا حق اتنا ہی ہے جتنا کہ خود بادشاہ کا ہے"۔ اب علاءالدین نے پوچھا کہ اچھا! ایسی دولت میں میرا اور میری اولاد کا کتنا حصہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں قاضی صاحب نے کہا کہ اب معلوم ہوتا ہے میری موت آگئی ہے کیونکہ پہلے ہی جواب سے بادشاہ ناراض تھا اور اب اس دوسرے سوال کے جواب سے تو بادشاہ کی نارضامندی اور بھی بڑھ جائے گی" علاءالدین نے کہا" میرے سوال کا صحیح جواب دو اور اپنی جان کی طرف سے بالکل مطمئن رہو" قاضی صاحب نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں تین طریقوں پر عمل ہوسکتا ہے۔ اگر محض عدالت اور خلفائے راشدینؓ کی پیروی منظور رہو تو بادشاہ کو اس دولت میں سے اسی قدر حصہ لینا چاہیے جتنا کہ عام مسلمانوں کو ملتا ہے اور

اگر میانہ روی سے کام لیا جائے تو بادشاہ کا حصہ اُن امیروں کے برابر ہونا چاہیے جن سے زیادہ کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا اور اگر مصلحتِ ملکی کا لحاظ رکھا جائے جیسے کہ علما ایسے وقت میں ضعیف روایتوں سے تمسک کر کے بادشاہوں کی ہم زبانی کر دیتے ہیں تو بادشاہ ان امیروں کے اعلیٰ ترین حصہ سے کچھ رقم زائد لے سکتا ہے"۔ اس کے بعد بادشاہ نے پوچھا" میرا دستور ہے کہ جو سپاہی فوجی خدمات پر ضرورت کے وقت حاضر نہیں ہوتا ہے اُس سے تین سال کا معاوضہ واپس لے لیتا ہوں اور باغیوں اور فتنہ انگیز لوگوں کو مع اُن کی آل اولاد کے قتل کرنے کے بعد اُن کا تمام مال و دولت شاہی خزانہ میں داخل کر لیتا ہوں"۔ یہ سُن کر قاضی صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور دور جا کر ایک کونہ میں کھڑے ہو گئے اور سر ہتیلی پر رکھ کر بولے" یہ تمام باتیں احکام شریعت کے خلاف ہیں" بادشاہ اس جواب سے ناراض ہو کر شدید غیظ و غضب کے عالم میں حرم سرا میں چلا گیا۔ ادھر قاضی صاحب بھی فوراً اپنے گھر روانہ ہوئے تاکہ اپنے اہل و عیال سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائیں۔

قاضی صاحب اپنے گھر پر ہر آن منتظر تھے کہ بادشاہ کا قاصد آئے گا اور انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن کلمۂ حق کا اثر یہ ہوا کہ دوسرے دن علاء الدین خلجی نے انہیں اپنے دربار میں بلایا اور خلاف توقع غیر معمولی انعام و اکرام سے نوازا اور قاضی صاحب سے خطاب کر کے بولا" اگرچہ میں علم سے بالکل بے بہرہ اور فرائض و نوافل کے مسائل سے نابلد ہوں لیکن مسلمان ہوں اور مسلمان زادہ ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن ملک کے خاص حالات کے پیشِ نظر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ نظم و نسق کی خاطر مجرموں کو شدید ترین سزائیں دی جائیں۔ بہر حال میری نیت بخیر اور اُس کا مقصد

خلق اللہ کی سرسبزی ہے۔[۱]

حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ سے عقیدت

سلطان علاء الدین خلجی کو اب حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ سے بھی بڑی عقیدت اور ارادت ہوگئی تھی جب کبھی اسے کوئی مہم پیش آتی تھی تو وہ حضرت کی طرف رجوع کرتا تھا۔ چنانچہ جس زمانہ میں سلطان قلعہ چتوڑ کے فتح کرنے میں مشغول تھا مغلوں کی ایک جماعت ایک شخص طرغی نام کی قیادت میں اپنے ملک سے روانہ ہوئی۔ علاء الدین کو یہ خبر ملی تو فوراً تمام پروگرام ملتوی کر کے دہلی پہونچا۔ اتنے میں مغلوں کی یہ جماعت بھی جو مورخ فرشتہ کے بقول ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی دہلی کے قریب آپہونچی۔ چونکہ سلطان کی بہترین فوج اس زمانہ میں دکن میں تھی اس لیے علاء الدین کو ان لوگوں سے عہدہ برآ ہونے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ مغل دریائے جمنا کے کنارے ڈیرہ جمائے پڑے تھے۔ علی گڈھ اور بلند شہر کے جو امراء دہلی آنا چاہتے تھے اُن کے راستہ میں یہ لوگ حائل تھے اور موقع پاکر خاص دہلی شہر پر بھی حملہ کر کے غلّہ وغیرہ لے جاتے تھے۔ سلطان ان واقعات سے جب بہت پریشان ہوا تو آخر کار حضرت سلطان نظام الدین اولیاءؒ سے مدد کا خواستگار ہوا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ اسی رات طرغی پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اچانک محاصرہ اٹھاکر اپنے ملک کو روانہ ہوگیا۔ نظام الدین احمد بخشی لکھتے ہیں "دہلی کے لوگ اس واقعہ کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی توجہ کا نتیجہ اور آپ کی ہی کرامت یقین کرتے تھے"[۲]

اسی طرح ایک مرتبہ علاء الدین دہلی میں تھا اور ورنگل (دکن) میں اُس کی فوج مصروفِ جنگ تھی۔ بادشاہ کو چند روز تک اس لشکر کی کوئی اطلاع نہ ملی تو بڑا پریشان ہوا۔ اور قاضی مغیث اور ملک قرابیگ کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں

---

[۱] ماخوذ از تاریخ فرشتہ ج ۱، از صفحہ ۳۷۷ تا ۳۸۱ و طبقات اکبری ج ۱۔ از صفحہ ۱۵۴ تا ۱۵۷

[۲] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۵۸

یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اگر جناب کو اپنے کشفِ باطن سے اس لشکر کا کچھ حال معلوم ہوا ہو تو مجھ کو اطلاع دے کر مطمئن کیجیے۔ شیخ نے جواب میں کسی ایک پرانے بادشاہ کی حکایتِ فتح بیان کی اور فرمایا کہ اس کے علاوہ اور بھی فتوحات کی امید ہے۔ چنانچہ اسی روز عصر کے وقت قاصدوں نے پہونچ کر ورنگل کا فتح نامہ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ اس واقعہ کے بعد علاء الدین کا اعتقاد حضرت شیخ کے بارہ میں اور زیادہ ہو گیا اور اگرچہ بادشاہ نے حضرت شیخ سے ملاقات نہیں کی لیکن خطوط کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور اپنی تحریروں میں ہمیشہ یک جہتی اور خلوص کا اظہار کر کے حضرت شیخ کے انوارِ باطن سے مدد طلب کرتا رہا۔[1]

اصلاحاتِ ملکی فتوحات اور وسعتِ مملکت کے اعتبار سے بہ قول شیخ محمد اکرام صاحب آئی۔سی۔ایس کے ہندوستان کا جتنا علاقہ اس کے زیرِ نگیں تھا برطانوی حکومت سے پہلے کسی کو نصیب ہوا۔[2] لیکن وہ جتنا بڑا بہادر سپاہی دلیر اور جنگ کے معاملہ میں حوصلہ مند تھا اتنا ہی بیدار مغز اور منتظم بھی تھا۔ اُس نے محکمۂ جاسوسی کو اس درجہ ترقی دی کہ ملک کی ایک ایک بات سے باخبر رہتا تھا۔ رات کو امرا کے گھروں میں جو بات چیت ہوتی تھی صبح کو جب یہ لوگ دربار میں آتے تھے تو حرف بحرف اُن کو شب کی گفتگو سنا دیتا تھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ اگر کسی کے دل میں بادشاہ کے خلاف کوئی شکایت یا برائی ہوتی بھی تھی تو وہ راز کی مجلس میں بھی اُس کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ معاملاتِ مملکت کے متعلق کافی غور و خوض اور اربابِ رائے سے مشورہ کے بعد اپنی ایک پالیسی متعین کرتا تھا اور اُس پر سختی سے کاربند رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ لشکروں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے اُس نے یہ انتظام کیا تھا کہ جب وہ کہیں لشکر روانہ کرتا تھا تو وہاں سے لشکر کی فرودگاہ تک ڈاک چوکی جس کو پہلے زمانہ میں بام کہا جاتا تھا بٹھائی جاتی تھی اور ہر کوس پر دو پیادے جن کو ہندی میں

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۴ [2] چشمہ کوثر ص ۱۲۹

پایک کہتے ہیں متعین کیے جاتے تھے تاکہ میدانِ جنگ کے حالات روزانہ قلم بند کرلیے جائیں۔ راستے اس قدر پر امن تھے کہ سوداگر بے یار و مددگار راتوں کو سفر کرتے تھے[۱]۔ سڑکوں کا انتظام اس قدر اعلیٰ تھا کہ "بنگالہ کے راستے دریائے شور کے کنارے تک اور سندھ اور گجرات کی راہیں تلنگانہ اور مالابار تک اور لاہور کی سڑکیں کابل و کشمیر تک دہلی اور سیری کی گلی کوچوں کا نمونہ بن گئیں۔ راہ گیر جس قدر مال چاہتے تھے اپنے ہمراہ لے جاتے تھے اور جس جنگل میں ان کا جی چاہتا اس کو خانۂ ہفت حصار سمجھ کر مال کو زمین پر پھینک دیتے تھے اور خود بے خوف و خطر رات کو آرام سے سوتے تھے۔ مسافر غریب الوطن اور اجنبی اشخاص جس گاؤں میں پہونچتے تھے اس کا چودھری اور دوسرے اہل قصبہ ان لوگوں کی مہمان نوازی کرتے تھے[۲]" عام طور پر اخلاقی معائب اور فتنہ و فساد شراب نوشی سے پیدا ہوتے ہیں۔ علاء الدین خلجی نے ادھر بھی توجہ کی۔ چنانچہ پہلے خود شراب سے توبہ کی اور پھر تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص کھلم کھلا یا پوشیدہ طور پر شراب پیے گا اُسے شدید ترین سزا دی جائے گی۔ بدایوں میں ایک خاص کنواں اسی لیے تھا کہ جو شخص اس اعلان کے بعد بھی شراب نوشی کے جرم میں گرفتار ہوتا تھا اس کنوئیں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک سے اس ام الخبائث کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ علاء الدین نے یہ حکم بھی جاری کر رکھا تھا کہ شاہی امیر اور درباری رئیس حکم سلطانی کے بغیر ایک، دوسرے سے رشتہ قرابت قائم نہ کریں اور نہ باہم ضیافت اور مہمان داری کا سلسلہ جاری کریں۔

ہمارے زمانہ میں دو چیزیں مملکت کے حسن انتظام اور رعایا کی عام خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے نہایت ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ دولت کی تقسیم مساوی ہونی چاہیے تاکہ سرمایہ دار لوگ اپنی دولت کے گھمنڈ میں غریبوں پر بے جا ظلم و ستم اور زیادتی

---

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۴ [۲] ایضاً

نہ کرسکیں۔ اور دوسرے یہ کہ اجناس اور دوسری ضروری چیزوں کے نرخ حکومت کی طرف سے مقرر کر دیئے جائیں اور اُن چیزوں کی فراہمی کا کام بھی حکومت کے سپرد ہونا چاہیے تاکہ دولت مند اور ارباب اغراض حد سے زیادہ نفع خوری کی لعنت میں مبتلا ہو کر عوام کے لیے پریشانی کا باعث نہ بنیں۔ عجیب بات ہے کہ علاء الدین خلجی کو بھی ان دونوں باتوں کی طرف توجہ ہوئی اور اُس نے ان کا اتنا اچھا انتظام اور بندوبست کیا کہ ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ یا ہندو راجہ کے عہد میں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ اُس نے امر اول یعنی ملک سے سرمایہ داری ختم کرنے اور لوگوں کو محنت سے پیسہ کمانے کا خوگر بنانے کے لیے یہ کیا کہ ہر قصبہ جو معافی یا وقف یا کسی اور طرح پر رعیت کے قبضہ میں تھا املاک شاہی میں شامل کر لیا گیا اور ہر مسلم اور غیر مسلم غریب و امیر پر جا و بے جا ہر طرح کا دباؤ ڈال کر جو کچھ ان کی پونجی تھی اُن سے لے کر خزانہ میں داخل کی۔ فرشتہ کا بیان ہے

> "علاء الدین نے چاہا کہ سلطنت میں چند ضابطے ایسے جاری کرے جس سے کم زور اور طاقت ور لوگوں میں بالکل مساوات ہو جائے اور گاؤں کے مکھیوں اور چودھریوں کو جو فوقیت رعایا پر حاصل ہے وہ باقی نہ رہے۔"[1]

اسی سلسلہ میں رشوت ستانی کا دروازہ بند کرنے کے لیے اُس نے یہ حکم جاری کیا کہ کوئی عامل اپنے مقررہ روزینہ کے علاوہ کوئی رقم ہرگز وصول نہ کرے اور اگر کوئی عامل ایسا کرتا تو پٹواری کے دفتر کا معائنہ کیا جاتا اور پھر جس شخص کے نام کوئی رقم زائد نکلتی تھی اُس سے بڑی سختی کے ساتھ وہ واپس لے لی جاتی تھی۔

اب رہی دوسری چیز یعنی اشیا کی نرخ بندی اُن کی قیمتوں اور اُن کی فراہمی کی نگرانی

---

[1] تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۲۷۶۔ فرشتہ نے اس کے بعد اُن قوانین کی تفصیل دی ہے جن کے ذریعہ طاقتور اور کمزور میں مساوات پیدا کرنا منظور تھا۔ ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔

توکوئی شبہ نہیں کہ اُس زمانہ میں آمدورفت اور خبر رسانی کے وسائل و ذرائع کی قلت کے باعث اس نظم کو جاری کرنا اور اسے قائم رکھنا نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن علاء الدین خلجی نے اسے جس طرح رائج کیا اور اُس کے لیے جو قواعد و ضوابط بنائے وہ یقیناً اُس زمانہ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ نرخ بندی کا یہ نظام اشیاء خوردنی و نوشیدنی کپڑہ لباس گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل تھا۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمین کے مدارج و مراتب قائم کرکے ہر مرتبہ اور درجہ کے لیے الگ الگ تنخواہوں کی مقدار مقرر کر دی گئی تھی جس میں نہ کمی ہو سکتی تھی اور نہ زیادتی۔ حد یہ ہے کہ ارباب نشاط، سازندوں گویوں کے لیے بھی اُن کے مختلف مدارج کمال کے اعتبار سے نرخ مقرر کر دیا گیا تھا جس سے زائد وہ ایک پیسہ وصول نہیں کر سکتے تھے اشیا کی درآمد و برآمد کے لیے اُس نے ایک محکمہ سرائے عدل کے نام سے قائم کیا تھا سوداگر باہر سے جو چیزیں لاتے تھے۔ اس محکمہ کے علم اور اجازت کے بغیر اُس کی مقرر کی ہوئی قیمت سے زیادہ پر فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ فرشتہ نے اس پورے نظام کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے ہم یہاں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر صرف غلہ کا نرخ نامہ نقل کرتے ہیں اس سے دوسری اشیا کے نرخ ناموں کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔

گیہوں	فی من	۷½ چیتل
جو	"	چار "
چنا	"	پانچ "
دھان	"	"
ماش	"	"
موٹھ	"	تین[۱] "

[۱] سید ہاشمی صاحب فرید آبادی لکھتے ہیں "اُس زمانہ میں ایک من جیسا کہ فرشتہ نے خود تصریح (باقی برص ۲۶۴)

علاء الدین خلجی کے آخری زمانہ تک غلہ کا یہ نرخ قائم رہا۔ البتہ کبھی کبھی بارش کی کمی یا دوسرے اسباب قحط کی وجہ سے اس میں کچھ فرق ہو جاتا تھا۔

اُس زمانہ میں ایک فرقہ تھا جو اباحیہ کہلاتا تھا۔ یہ لوگ سال میں ایک مرتبہ مجلسِ عیش منعقد کرتے تھے اور اس رات میں بڑا سے بڑا کوئی گناہ بھی ایسا نہ تھا جس کا یہ ارتکاب نہ کرتے ہوں یہاں تک کہ محرماتِ شرعیہ اپنی ماں اور بہنوں سے بھی لطف اندوز ہوتے اور اُن سے مباشرت کرتے تھے۔ علاء الدین خلجی کو جب یہ علم ہوا کہ یہ گروہ دہلی میں بھی موجود ہے تو اُس نے تہ تیغ کر کے اس کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹا دیا علاء الدین کی طبیعت کا یہ خاصہ تھا کہ کسی سے خوش ہوتا تھا تو اُس کے لیے فیاضی اور جود و عطا کے دریا بہا دیتا تھا۔ لیکن احکام شاہی سے سرتابی کرنے والوں پر اس قدر سختی اور تشدد کرتا تھا کہ بسا اوقات اس پیسٹ میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے تھے۔ چنگیز خاں کا نواسہ الغو خاں جو جلال الدین کا داماد بھی تھا چار ہزار مغل مردوں اور عورتوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا تھا اور یہ سب نو مسلم مغل یہیں آباد ہو گئے تھے اس جماعت کے چند لوگوں نے ایک مرتبہ علاء الدین کو اس کی شکارگاہ میں قتل کر دینے کا منصوبہ باندھا۔ علاء الدین کو اس کی خبر ہوئی تو اُس نے نہ صرف ان سازشیوں کے متعلق بلکہ تمام نو مسلم مغلوں کی نسبت یہ حکم جاری کر دیا کہ ان کو مع عورتوں اور بچوں کے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ ان سب کو اس سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا کہ بقول مورخین کے علاء الدین نے ضحاک اور فرعون کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی ہے ۹۶۰ تولہ (یعنی ہمارے ۱۲ سیر) کے برابر ہوتا تھا (حواشی تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۱۸۱) اب رہا جیتل تو وہ ہمارے آدھنے کے ہم وزن اور قیمت میں تنکہ (یا روپیہ) کا چالیسواں حصہ سمجھا جاتا تھا۔ (حواشی تاریخ فرشتہ ج ۱ ص ۳۰)

اسے تعمیرات کا بھی بڑا شوق تھا۔ چنانچہ فرشتہ کا بیان ہے

"علاء الدین خلجی نے جس کثرت سے مسجد و خانقاہ حوض و منار و حصار تعمیر کرائے کسی بادشاہ کے کارناموں میں اس تعداد کا پتہ نہیں چلتا"۔

ارباب علم و فن کی بھی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے

"اہل ہنر اور ہر فن کے ماہر اس کثرت سے اُس زمانہ میں جمع تھے کہ ایسا مجمع کسی دوسرے زمانہ میں نہ ہوا تھا۔ انصاف اور سچائی اور اطاعت کا دور دورہ اور بغاوت اور سرکشی کی کساد بازاری جیسی اس عہد میں ہوئی کسی زمانہ میں میسر نہ ہوئی ہوگی۔ اسی طرح مشائخ کبار اور اولیاء اللہ کا مقدس مجمع جیسا کہ اس دور میں دہلی میں جمع ہو کر باعث برکت ہوا ایسا کسی زمانہ میں یکجا نہ ہوا ہوگا"

بزرگان طریقت اور سادات و قضاۃ کے علاوہ ۴۶ علمائے باکمال تھے جو تمام علوم کے جامع تھے اور علاء الدین خلجی کے عہد میں درس و تدریس کا شغل رکھتے تھے۔ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ دونوں میں ان علمائے کرام کے ناموں کی فہرست بھی درج ہے جس کو یہاں نقل کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔

خاندانِ خلجی کا خاتمہ

علاء الدین نے بیس سال تک بڑے دبدبہ و حشم اور شوکت و سطوت کے ساتھ بادشاہت کی لیکن آخر زمانہ میں کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے جو انجام کار خلجی خاندان کی تباہی اور اُس کے خاتمہ کا باعث بنے

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ علاء الدین کا ملک نائب (وزیر اعظم) ایک نومسلم تھا جس کا نام کافور تھا۔ یہ شخص ابتداءً ہندو تھا اور گجرات کی مہم کے موقع پر ایک غلام کی حیثیت سے اُس کے ہاتھ لگا تھا۔ کافور نے بہ قول صاحب طبقات اکبری کے علاء الدین خلجی کو اپنے حسن و جمال سے اس درجہ متاثر کیا کہ اُس نے فوراً اُس کو اپنی افواج کا کمانڈر بنا دیا اور کافور نے دکن کی لڑائیوں میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی تو اسے وزیر اعظم کے عہدہ پر

سرفراز کر دیا گیا۔ رفتہ رفتہ کافور نے اس قدر اعتماد حاصل کر لیا کہ آخر زمانہ میں علاء الدین کوئی کام اُس کی مرضی اور رائے کے خلاف نہیں کرتا تھا۔ اس بنا پر خود شاہی محل میں بادشاہ کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ علاء الدین کی بیوی ملکۂ جہاں اور اُس کا بڑا بیٹا خضر خاں جس کو ولی عہد نامزد کر دیا گیا تھا اپنی رنگ رلیوں اور عشرت کوشیوں میں مصروف تھے کافور خضر خاں سے خوش نہ ہونے کے باعث ایسے موقع کا منتظر تھا جس سے فائدہ اٹھا کر وہ اُس کو ولی عہدی سے الگ کرا دے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب کہ بادشاہ علیل تھا خضر خاں باپ کی اجازت سے امروہہ کی طرف شکار کھیلنے گیا۔ باپ نے چلتے وقت کہا کہ "مجھ کو صحت ہو جائے گی تو میں تم کو طلب کر لوں گا" اتفاق ایسا ہوا کہ خضر خاں کو باپ کی صحت یابی کی اطلاع ملی تو وہ باپ کی طرف سے طلبی کے حکم کا انتظار کیے بغیر دہلی روانہ ہو گیا۔ اب کافور نے بادشاہ سے کہا کہ "خضر خاں ایک فاسد خیال دماغ میں لے کر آپ کی طلب اور اجازت کے بغیر دہلی آ گیا ہے اور مشورہ دیا کہ اسے گوالیار کے قلعہ میں بند کر دینا چاہیئے" بادشاہ نے اس سے اتفاق کیا اور خضر خاں محبوس کر دیا گیا اس کے بعد کافور نے ملکۂ جہاں کے بھائی الپ خاں کو بھی گجرات سے بلوا کر قتل کرا دیا۔ اُس کے بعد خود علاء الدین نے بھی بمرض استسقاء وفات پائی بعض مورخین کا بیان یہ بھی ہے کہ کافور نے ہی بادشاہ کو کسی طرح زہر کھلا کر ہلاک کیا تھا[1]

سلطان علاء الدین کی وفات کے دوسرے روز ملک کافور نے بادشاہ کی ایک تحریر امراء و ارکانِ سلطنت کو دکھائی جس میں خضر خاں کو ولی عہدی سے الگ کر کے اُس کے چھوٹے بھائی شہاب الدین کو ولی عہد نامزد کیا گیا تھا۔ چنانچہ شہاب الدین کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور خود ملک کافور نائب سلطنت کی حیثیت سے تمام امور مملکت کا انصرام و انتظام کرنے لگا۔ شہاب الدین کی تخت نشینی کے پہلے دن ہی ملک کافور نے

[1] طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۷۲ - ۱۷۳

ایک شخص کو باربیگی کے عہدہ کا لالچ دے کر اُس کے ذریعہ خضر خاں اور اُس کے بھائی شادی خاں جو قلعہ گوالیار میں قید تھے۔ کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر دونوں کو اندھا کرا دیا۔ علاء الدین کی بیوی ملکہ جہاں بھی یہیں قید تھی اُس کی تمام دولت و ثروت پر قبضہ کر لیا گیا شہاب الدین تخت نشینی کے وقت بالکل بچہ تھا۔ طبقات اکبری کا بیان ہے

"کافور ایک دو گھڑی کے لیے شہاب الدین کو اندرون محل سے ملوا کر بام ہزار ستون پر لا کر تخت پر بٹھا دیتا اور تمام امراء اور ملازمین دربار کو حکم دیتا تھا کہ اُس کے سامنے صف باندھ کر کھڑے ہوں۔ پھر جب دربار برخاست ہو جاتا تو بچہ کو محل میں اُس کی ماں کے پاس بھیج دیا جاتا اور خود کافور چند معتمد خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر وغیرہ کھیلنے میں مشغول ہو جاتا تھا"[1]

فرشتہ کا بیان تو یہ ہے

"کافور کافر نعمت نے اسی پر اکتفانہ کی بلکہ باوجودیکہ وہ فطرتاً ناکارہ تھا شہاب الدین کی ماں سے نکاح کر لیا"[2]

خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کرنے کے بعد ایک اور شہزادہ مبارک خاں رہ گیا تھا۔ کافور نے اُس کو بھی اندھا کرنے کے لیے چند خواجہ سرا بھیجے۔ لیکن مبارک خاں نے اُن کو اپنے باپ کے احسانات اور حقوق کچھ اس انداز میں یاد دلائے کہ ان لوگوں پر بڑا اثر ہوا اور اب یہ اس عزم بالجزم کے ساتھ واپس ہوئے کہ مبارک خاں کے دشمنوں کو ہی ختم کر کے دم لینگے۔ چنانچہ اُسی شب میں ان لوگوں نے کافور کی خواب گاہ میں کسی طرح داخل ہو کر اُس کا اور اُس کے تمام ہواخواہوں کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ علاء الدین خلجی کی وفات کے پینتیس روز بعد پیش آیا۔

کافور اور اُس کے ہواخواہوں کے قتل کے بعد مبارک خاں دو ماہ تک اپنے بھائی

---

[1] ص ۱۷۴ [2] ص ۱۲۴

شہاب الدین کے نائب کی حیثیت سے امور سلطنت کا انتظام کرتا رہا۔ آخر کار سلطان قطب الدین مبارک شاہ کا لقب اختیار کر کے خود تخت سلطنت پر بیٹھا اور شہاب الدین کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا۔ [۵]

قطب الدین مبارک شاہ نے ۸ محرم ۷۱۶ھ کو تخت سلطنت پر جلوس کیا شروع میں اُس کا رویہ اچھا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایک طرف باغیوں کا قلع قمع۔ فتنہ پرداز اور مفسد لوگوں کو ختم کیا۔ ملازمین کو چھ چھ مہینوں کی تنخواہ پیشگی دی۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں جو بھاری ٹیکس رواج پا گئے تھے اُن کو کم کیا۔ علماء، صوفیہ اور مستحقین کے وظائف میں اضافہ کیا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی عیش و عشرت کا وہ اس درجہ دلدادہ ہو گیا کہ امور سلطنت سے غفلت برتنے لگا۔ ہر وقت ارباب نشاط کے جھرمٹ میں بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی زنانے کپڑے پہن کر بھی مجلس میں شریک ہوتا تھا۔ ملک خسرو نام ایک نیچ ذات کا ہندو تھا جو برائے نام مسلمان ہو گیا تھا۔ جس طرح کافور علاء الدین خلجی کا بہت بڑا معتمد تھا اسی طرح ملک خسرو پر بھی قطب الدین کو اتنا بھروسہ اور اعتماد تھا کہ اُس نے اُس کو وزیر اعظم بنا کر سلطنت کے تمام سیاہ و سپید کا مختار کل بنا دیا تھا۔ ملک خسرو نے اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر تمام محکموں اور دفتروں میں اپنے آدمی داخل کر دیے اور جب اس طرح سلطنت کے جزو کل پر اُس کو اقتدار حاصل ہو گیا تو آخر اس نے اپنی قوم کے چند آدمیوں کی مدد سے قطب الدین کو اس بے دردی اور

[۵] فرشتہ میں ہے کہ جب کافور مبارک خاں کو بھی اندھا کر دینے کی تدبیریں سوچ رہا تھا مبارک خاں کی ماں بی بی مالک نے اُس زمانہ کے ایک صاحب کشف و باطن شیخ نجم الدینؒ کے پاس جو حضرت شیخ احمد جامؒ کے فرزند ارجمند تھے ایک آدمی بھیج کر مدد کی درخواست کی۔ شیخ نے فرمایا "کچھ رنج مت کرو اور غیبی امداد کی امید رکھو" اس کے بعد حضرت شیخ نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر اُس کو الٹا کیا اور پھر اسے اپنے سر پر رکھ کر فرمایا "انشاء اللہ اب میں اس ٹوپی کو سیدھا اُسی وقت کروں گا جب مبارک شاہ تخت سلطنت پر جلوس کرے گا۔"

سفاکی سے قتل کیا کہ اُس کا سر تن سے جدا کر کے قصر ہزار ستون کے نیچے پھنکوا دیا۔ اور اس کے بعد علاء الدین خلجی کے جتنے بیٹے تھے[1] اُن کو مع اُن کی ماں کے قتل کیا پھر بیگمات اور شہزادیوں کے ساتھ جو معاملہ کیا اُس کا اندازہ فرشتہ کے لفظوں میں اس سے ہو سکتا ہے

> آپنے بھائی کو (جو ظاہر ہے کہ اُس کی ہی طرح اصلاً نیچ ذات کا ہندو ہوگا) خان خانان کے خطاب سے سرفراز کر کے سلطان علاء الدین خلجی کی بیٹی کو اُس کے حوالہ کیا اور قطب الدین مبارک شاہ کی بیوی کو خود اپنے محل میں داخل کیا۔ ان کے علاوہ قطب الدین اور علاء الدین کے دوسرے حرم اور اُن کی بیبیاں خسرو خاں کے اور لشکریوں کے حصہ میں آئیں اور علائی اور قطبی غلاموں کو تہ تیغ کرنے کے بعد اُن کی جو عورتیں اور بچے بچ رہے تھے اُن سب کو گجرات کے ہندوؤں کے حوالہ کر دیا"[2]

غرض یہ ہے کہ اس نابکار نے جو بہ ظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن بہ باطن ہندو تھا اور وہ بھی ایک نیچ ذات کا۔ علاء الدین خلجی کے خاندان کا نام و نشان مٹانے اور اس خاندان کے زن و مرد اور بچوں پر سفاکانہ مظالم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس خاندان کا جو فرد بھی جہاں کہیں تھا اُسے تہ تیغ کر دیا۔ چنانچہ علاء الدین خلجی کا ملک مسرت نام ایک بھانجہ تھا جو عرصہ سے ترک دنیا کر کے گوشہ نشین ہو گیا تھا خسرو خاں نے اس کو بھی قتل کرا دیا۔

اس زمانہ میں شیخ بشیر دیوانہ کے نام سے ایک مجذوب تھے۔ لوگوں نے

---

[1] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ خضر خاں اور شادی خاں جو علاء الدین خلجی کے بیٹے اور قطب الدین کے بھائی تھے۔ تخت نشین ہونے کے بعد خود قطب الدین ان دونوں کو قتل کرا چکا تھا اور خضر خاں کی بیوی سے شادی کر لی تھی۔ [2] فرشتہ ص ۲۲۷

اُن سے علائی خاندان پر مظالم کا تذکرہ کرکے پوچھا "حضرت! یہ کیا ہو رہا ہے؟" شیخ بولے "یہ اسی کفران نعمت کا نتیجہ ہے جو علاء الدین سے اپنے چچا اور مربی جلال الدین خلجی کے حق میں سرزد ہوئی تھی" [1]

قطب الدین مبارک شاہ کی نسبت صاحب طبقات اکبری نے یہ بھی لکھا ہے

"یہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے قلبی بغض رکھتا تھا اور حضرت شیخ کے ساتھ علانیہ اپنی عداوت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔

بہرحال یہ خاندان خلجی کے عروج و زوال کی داستان عبرت و بصیرت کا ایک مرقع ہے۔ ان کے عروج و زوال کے اسباب اس قدر واضح اور کھلے ہوئے ہیں کہ اُن کی مزید تشریح کی کوئی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں خسرو خاں محض نام کا مسلمان تھا ورنہ وہ دل سے ہندو تھا اور بقول ضیاء الدین برنی کے

"اُس کا اصل مقصد یہ تھا کہ شمالی ہندوستان میں پھر از سر نو ہندوؤں کی مضبوط حکومت قائم کرے۔ چنانچہ اُس نے علاء الدین خلجی کے گھرانے کے ایک ایک بچہ کو قتل کرنے کے بعد اپنی اسلام دشمنی کا اظہار علانیہ شروع کر دیا اسلامی شعائر بند کرا دیئے گئے۔ مسجدوں کو بُت کدہ بنایا گیا۔"

اور انتہا یہ ہے کہ فرشتہ کے بیان کے مطابق

"ہندو علانیہ قرآن مجید کو بجائے کرسی کے استعمال کرکے اُس پر بیٹھتے تھے" [2]

خواجہ نظام الدین احمد کا بیان ہے

"چوں اکثر برادراں ہندو بودند شعار مسلمانی تنزل نمودہ رسوم ہندوانی رونق در دولت تمام پیدا کرد و بت پرستی و تخریب مساجد شائع شد" [3]

---

[1] فرشتہ و طبقات اکبری [2] تاریخ فرشتہ ج ا ص ۲۴۷ [3] طبقات اکبری ج ا ص ۱۸۶

خاندانِ تغلق

خلجیوں نے اپنے کیے کی سزا پائی اور دنیا کی لوح سے اُن کا نام و نشان حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ لیکن شہاب الدین غوری اور قطب الدین کے دست و بازو اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے انفاسِ قدسیہ نے اسلام کی جو شمع اس تیرہ زار کفر و شرک میں روشن کی تھی وہ ایسی نہ تھی کہ ایک بد طینت اور کمینہ انسان کے پھونکیں مارنے سے بجھ سکتی۔ چنانچہ خسرو خاں کو تختِ حکومت پر بیٹھے ابھی پانچ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ غازی ملک فخر الدین جو بعد میں سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا اور جو اُس زمانہ میں پنجاب کا گورنر تھا ایک لشکرِ جرار و کثیر کے ساتھ سیل تند و تیز کی مانند دہلی کی طرف بڑھا اور ان تمام لعنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتا ہوا لے گیا۔ خسرو خاں اور اُس کے حوالی و موالی سپرد تیغ کر دیے گئے اور اس طرح اسلام اور مسلمانوں کے مطلع حیات پر مصائب و آلام کے جو بادل چھا گئے تھے وہ یک بیک چھٹ گئے۔

امیر خسروؒ نے اس موقع پر ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں فرماتے ہیں۔

حامیِ اسلام تغلق شاہ کہ انجم سالہا

چرخ می زد تا فلک زیں گونہ دیں پرور کشید

غازی ملک کے اس کارنامہ سے دہلی کے چھوٹے بڑے سب کو بڑی مسرت ہوئی اور انھوں نے حاضر ہو کر مبارک باد پیش کی۔ دوسرے دن غازی ملک نے کوشک ہزار ستون میں اجلاس کیا۔ تمام بڑے بڑے امرا اور اعیان و ارکان موجود تھے۔

امرار نے غیاث الدین کے بہادرانہ کارناموں کا شمار کر کے باصرار تمام کہا کہ اب تختِ شاہی پر جلوس کرنے کا حق آپ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے۔ تغلق نے اس کے جواب میں ایک نہایت موثر تقریر کی جس کا خلاصہ امیر خسرو کے بیان کے مطابق یہ ہے۔

"میرا تاج و تخت میرا تیر و کمان ہے۔ خسرو خاں کے انسانیت سوز مظالم کو سن کر دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہوگئی اور مجھے اپنی زندگی پر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت تین باتوں کا عزم صمیم کر لیا۔ ایک یہ کہ دین اسلام کو اس کفرزار میں دوبارہ زندہ کروں

نخست آنکہ اندریں خاک خطرناک — زگردِ کفر نورِ دیں شود پاک

بکوشم بہرِ دین مصطفیٰ را — کہ از سر گردد اسلام آشکارا

دوسرے یہ کہ اس سرزمین کو اس کمینہ اور بدذات ہندو بچہ کے ہاتھ سے چھین کر اُن شہزادوں کو مراتب سلطنت پر متمکن کردوں جو اس کے اہل ہیں۔ اور تیسرا عزم یہ تھا کہ جن بدبختوں اور نمک حراموں نے نسلِ شاہی کو اس بے رحمی سے برباد کیا ہے انہیں کیفرِ کردار کو پہنچاؤں۔ یہ تینوں ارادے محض خدا کی رضا جوئی کے لیے تھے اور خدا کا بڑا فضل و کرم ہے کہ میری مضبوط ہمت نے ان تینوں عزائم کو پورا کیا۔ میں تختِ شاہی کا جویا نہیں ہوں اور سوائے دینی جہاد کے تلوار نہ کھینچوں گا۔ اب اگر نسلِ شاہی میں کوئی شخص بھی زندہ ہے تو یہ تختِ شاہی اسی کے نام لکھا جائے۔ اور اگر ان میں سے کوئی زندہ نہیں بچا ہے تو یہاں اور بہت سے بڑے بڑے امیر موجود ہیں۔ مجھے اپنا گھوڑا اور دیپال پور کا ویرانہ سب سے زیادہ پسند ہے۔

من و رخشیکہ دو بیرانہ پوید

سریر شاہی آنکہ ہر کہ جوید

اس تقریر کے بعد اکابر ملک نے تغلق کے پاؤں چومے اور بڑے اصرار سے کہا بادشاہی آپ کے لیے

۱؎ مثنوی تغلق نامہ ص ۱۴۱

ہی سزاوار ہے۔ تغلق نے پھر انکار کیا آخر بڑے ردوکد کے بعد اس نے بادشاہ ہونا منظور کر لیا۔ چنانچہ یکم شعبان ۷۲۰ھ کو صبح کے وقت تخت شاہی پر جلوس کیا اور سلطان غیاث الدین شاہی خطاب قرار پایا۔

خاندانِ تغلق غیاث الدین تغلق سے اب ایک نئے خاندان کی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے جسے خاندانِ تغلق کہتے ہیں غیاث الدین ایک غریب گھر میں پیدا ہوا۔ ذاتی اوصاف و کمالات کے باعث ترقی کرتے کرتے اس مرتبہ تک پہنچا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے "یہ بادشاہ بڑا حلیم اور بردبار تھا سخاوت اور عقل بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ علاوہ بریں پاک باز اور نیک طینت بھی تھا پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا اور صبح سے شام تک دیوان عام میں بیٹھ کر رعایا کی پرسش اور ملکی و مالی مشکلات کو حل کرنے میں اپنا سارا وقت صرف کرتا تھا" [۱] تخت نشین ہونے کے بعد خسرو خاں کے نامی گرامی اعوان و انصار کو سپرد تیغ کیا اور خاص خسرو خاں کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ قصر ہزار ستون میں ٹھیک اس جگہ پر جہاں اس بدبخت نے اپنے آقا و ولی نعمت کو قتل کرایا تھا اس کو بھی قتل کرایا اور اُسی طرح اس کا سر کاٹ کر نیچے پھنکوا دیا [۲]

ان فتنہ پردازوں کا قلع قمع کرنے کے بعد وہ ملک کے اصلاحی اور انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوا تو بقول نظام الدین احمد بخشی کے "جو کام دوسروں سے سالہا سال میں انجام پذیر ہو سکتے تھے وہ اس نے ایک ہفتہ میں انجام دیدیے" [۳] اپنی رعایا میں جس شخص کو پریشان حال دیکھتا اُس کا حال پوچھتا اور اس کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتا تھا، جو امر خلق کی تکلیف کا باعث ہو سکتا تھا اس سے احتراز کرتا اور جو شخص مخلص نظر آتا اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ علاوہ بریں۔

"در معاملاتِ جہاں داری اعتدال را کار فرمودے و از افراط و تفریط اجتناب نمودے" [۴]

غیاث الدین نے اور امور کے ساتھ ملک کے نظام مالی کی بھی اصلاح کی اس میں بھی اس نے میانہ روی کو

---

۱ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲ (اردو ترجمہ)
۲ مثنوی تغلق نامہ ص ۱۵۱
۳ طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۹۱
۴ ایضاً ۱۹۲

ملحوظ رکھا تھا اگر کوئی سرکاری گماشتہ مقررہ محصول سے زیادہ وصول کرلیتا تو اسے الزام ثابت ہو جانے کے بعد سخت سزا دی جاتی تھی۔ خسرو خاں نے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے خزانہ شاہی کو بے دریغ لٹایا تھا اس خزانہ کی رقوم جس جس کے پاس تھیں اور بادشاہ کو اس کا علم ہو گیا انہیں واپس لے لیا اور روپیہ کو خزانہ میں داخل کر دیا۔

علماء اور مشائخ وصوفیا کا بڑا قدردان تھا۔ محل میں خوشی کی کوئی تقریب ہوتی تو اعیان و امراء دربار کے ساتھ ان حضرات کو بھی مدعو کرتا اور بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آتا۔ بادشاہ کے حسن نیت و عمل کا ثمرہ یہ ہوا کہ نظام الدین احمد بخشی کے بقول" اہلِ عالم میں مساوات قائم ہو گئی اور سرکشی و بغاوت کا نام فنا ہو گیا۔ مغل جو ہندستان کے لیے ایک مستقل مصیبت بنے ہوئے تھے ان کا راستہ بھی اس طرح بند کیا کہ تغلق کے دور سلطنت میں ان کو ہندستان میں آنے کا تصور بھی نہیں ہوا۔ غیر معمولی شجاعت اور اعلیٰ درجہ کی سیاست کے ساتھ اسے عمارتوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ دہلی میں قلعۂ تغلق آباد اسی کی یادگار ہے۔ امور سلطنت اور ذاتی معاملات میں شریعت اسلام کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ صاحب طبقات اکبری کے الفاظ یہ ہیں

> "باوامر ونواہی تقید تمام داشت۔ وبیش تر اوقات او صرف بہ عبادات شدے وبقیام شب و مواظبت شغل اشتغال نمودے۔ دگرد مسکرات نہ گشتے ودر منع شراب مبالغہ فرمودے"۔ [1]

سلطان کی نسبت عام صلحاء اور انصاف پسند لوگوں کی رائے کیا ہے اس کا اندازہ ضیاء الدین برنی کے اس بیان سے ہوسکتا ہے کہ" میں ضیاء الدین برنی مولف تاریخ فیروز شاہی ہوں۔ میں نے بہت سے ایسے تجربہ کار حضرات سے جن کی چشم عاقبت بیں انصاف کے سرمہ سے سرگیں تھی۔ سنا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کی عام دینی اور دنیوی خیر خواہی اور عام سلامت طلبی کی رو سے۔ دہلی میں کسی بادشاہ کو سلطان تغلق شاہ کی مانند تخت سلطنت پر متمکن نہیں دیکھا اور شاید اس کے بعد بھی اس جیسا بادشاہ تخت گاہ

---

[1] ج ۱ ص ۱۹۳ - ۱۹۴

دہلی پر نہ بیٹھے" ؎۱

لیکن سلطان کو تخت پر بیٹھے ابھی کچھ اوپر چار سال ہی ہوئے تھے کہ ناگاہ پیک اجل آپہنچا حکام بنگالہ کی سرکوبی اور رعایا پر ظلم وستم کی ان کو سزا دے کر واپس آرہا تھا کہ تغلق آباد سے تھوڑے فاصلہ پر ایک قصر میں جو عارضی طور پر اس کے بیٹے محمد تغلق نے باپ کے استقبال کے لیے بنایا تھا قیام کیا۔ یہاں سلطان کھانے سے فارغ ہو کر ابھی ہاتھ بھی نہ دھونے پایا تھا کہ اچانک چھت گر پڑی اور سلطان اس کے نیچے دب کر اسی وقت جاں بحق ہو گیا یہ ناگوار واقعہ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء میں پیش آیا۔ اسی سال اتفاق سے حضرت سلطان نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو رحمہم اللہ نے وفات پائی۔ بقول ضیاء الدین برنی کے "صاعقہ بلائے آسمانی بر زمینیاں نازل شد" ؎۲

سلطان محمد بن تغلق | غیاث الدین تغلق کے بعد اُس کا بیٹا محمد شاہ تخت سلطنت پر بیٹھا جس کی شخصیت مورخین کے لیے ایک عجیب وغریب معمہ اور پہیلی رہی ہے۔ وہ نہایت بیدار مغز، مدبر، سیاست داں اور جری تھا۔ کہ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے "جامۂ جہانبانی، قباء جہانداری بر قد و قامت او دوختہ بود" پھر لکھتا ہے کہ گویا اورنگِ سلطنت اور تخت بادشاہی اسی کے لیے پیدا کیا گیا تھا"۔ ؎۳ سخاوت اور دریادلی کا یہ عالم تھا کہ "ایک ادنیٰ فقیر کو شاہی خزانہ دیدیتا اور پھر بھی اس کو اپنا عطیہ کم معلوم ہوتا تھا" سخاوت کے وقت اپنے اور پرائے فقیر اور امیر سب اس کی نظر میں یکساں ہوتے تھے ؎۴ نظام الدین احمد بخشی کا بیان ہے، افاضل اور اہل ہنر میں سے جو کوئی اس کی بارگاہ کا رخ کرتا تھا طرح طرح کے انعامات واکرامات سے سرفراز ہوتا اور خراسان، عراق، ماوراء النہر اور دوسرے اطراف واکناف عالم سے جو کوئی اس کے دامنِ کرم میں پناہ لیتا دربار شاہی کی طرف سے اُس پر اس قدر احسانات کیے جاتے کہ پھر عمر بھر اسے کسی چیز کی طلب اور احتیاج باقی نہیں رہتی تھی" ؎۵ ذہانت اور طباعی کی یہ شان تھی کہ

؎۱ تاریخ فیروز شاہی ؎۲ ایضاً ص ۴۵۲ ؎۳ ایضاً ص ۴۵۷

؎۴ تاریخ فرشتہ اردو ترجمہ ج ۲ ص ۹

؎۵ طبقات اکبری ج ۱ ص ۱۹۹

ایک شخص کو دیکھکر پہلی نظر میں ہی اس کی اچھائیاں اور برائیاں بتا دیتا اور قبل اس کے کہ یہ کچھ کہے وہ اس کے دل کی بات سے آگاہ ہوجاتا تھا[۱] پھر وہ علم تاریخ کا بڑا ماہر تھا۔ حافظہ اس درجہ قوی اور مضبوط تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتا عمر بھر نہ بھولتا تاریخ کے علاوہ فلسفہ اور معقولات کے تمام علوم سے عموماً اور طب، حکمت، نجوم، ریاضی اور منطق سے خصوصاً بڑی دلچسپی تھی اور ان علوم کا وہ اچھا ماہر تھا فلسفہ کا شوق اس قدر تھا کہ حکومت کے زمانہ میں بھی اُس کے اوقات کا اکثر حصہ معقولات کی کتابوں کے مطالعہ میں ہی صرف ہوتا تھا۔ اس کی تقریر بھی بے حد فصیح اور کلام شیریں تھا۔ عربی اور فارسی کے خطوط اور مراسلے فی البدیہ ایسے قابلانہ لکھتا تھا کہ بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ اس کا خط بھی نہایت پاکیزہ اور عمدہ تھا۔ نامی گرامی خوشنویس اُس کا لوہا مانتے تھے[۲]

ان علمی اور دماغی کمالات کے ساتھ دینی شغف وانہماک اور مذہب کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ نمازِ روزہ کے علاوہ مستحبات ونوافل اور وظائف واوراد تک کا اہتمام اور ان کی پابندی کرتا اور ممنوع ونشہ آور چیزوں سے اور ہر اُس فعل سے کہ جس پر معصیت کا اطلاق ہوسکتا ہے پرہیز کرتا تھا[۳] رعایا سے بھی اسی طرح سختی سے احکام شرع کی پابندی کراتا تھا۔ اُس نے نماز کی تاکید اس حد تک کر رکھی تھی کہ ابن بطوطہ کا بیان ہے" سلطان کا حکم تھا جو شخص جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھے اس کو سزا دی جائے اُس نے بہت سے لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا کہ جو شخص جماعت کے وقت بازار میں ملے اس کو پکڑ لائیں۔ سلطان کا حکم تھا کہ ہر شخص نماز اور اسلام کے احکام سیکھے چنانچہ لوگ بازاروں میں نماز کے مسائل یاد کرتے پھرتے اور انہیں کاغذوں پر لکھواتے تھے[۴] حکم شاہی کا یہ اثر ہوا کہ ڈوم ڈھاری عورتیں تک نماز کی پابند ہوگئیں۔ ابن بطوطہ نے امیر سیف الدین کی شادی کے حالات میں لکھا ہے" میں نے وہاں دیکھا اذان ہوتے ہی ہر ایک ڈوم وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔

[۱] طبقات اکبری ج ۱ ص ۲۰۰ [۲] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰ [۳] طبقات اکبری ص ۱۹۹
[۴] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۱

نماز روزہ کی پابندی کے علاوہ سلطان عام سیاسی اور ملکی معاملات میں بھی احکام شرع کا احترام کرتا اور اُن کا پاس ادب اس حد تک ملحوظ رکھتا تھا کہ کسی شخص کو قتل کرنے سے پہلے اس کے جواز کا فتویٰ علماء سے لیتا اور اس سلسلہ میں بسا اوقات اُن سے مباحثہ اور مناظرہ کرتا تھا اس نے علماء سے کہہ رکھا تھا" اگر کسے بناحق کشتہ شود فروگذاشت از شما خواہد بود و خون آں کس بر گردن شماست"[۱]

ابن بطوطہ لکھتا ہے میں نے سلطان محمد بن تغلق سے زیادہ منصف اور عدل گستر کوئی نہیں دیکھا" ایک مرتبہ ایک ہندو امیر نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اُس کے بھائی کو بلا وجہ مار ڈالا ہے۔ قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا تو بادشاہ بغیر کسی ہتیار کے قاضی کے سامنے عام ملزموں کی طرح حاضر ہوا اور قاضی کو سلام کیا اور تعظیم بجالایا پہلے سے حکم تھا بادشاہ عدالت میں حاضر ہو تو قاضی اُس کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہو۔ مقدمہ سنایا گیا۔ آخر قاضی نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ پر جرم ثابت ہے اسے چاہیے کہ مدعی یعنی ہندو امیر کو راضی کرے ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔ چنانچہ سلطان نے امیر کو رضامند کر لیا اور قاضی نے اسے بری کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ ایک امیر کے لڑکے نے دعویٰ کیا کہ بادشاہ نے اس کو بلا سبب مارا ہے۔ قاضی کے سامنے معاملہ گیا تو اس نے حکم دیا کہ بادشاہ یا تو لڑکے کو راضی کرے ورنہ قصاص دے۔ ابن بطوطہ خود اپنی آنکھوں دیکھی کہتا ہے کہ" میں نے دیکھا۔ بادشاہ نے لڑکے کو دربار میں بلا کر اُس کے ہاتھ میں چھڑی دی اور کہا اپنا بدلہ لیلے اور اُس کو اپنے سر کی قسم دلائی کہ جیسا میں نے تجھ کو مارا ہے تو بھی مجھے مار۔ چنانچہ لڑکے نے ہاتھ میں چھڑی لے کر اکیس چھڑیاں بادشاہ کے ماریں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کی کلاہ بھی سر سے گر پڑی"[۲]

علاوہ بریں اُس کی ہمت اور عالی حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ فرشتہ اور ملا نظام الدین احمد بخشی کے قول کے مطابق ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی اُس کے لیے بساط شطرنج سے زیادہ نہ تھی[۳] ۷۳۹ھ

[۱] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی
[۲] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۰
[۳] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۹

پس اُس نے ایک لاکھ کا لشکر جرار اپنے بھانجہ خسرو ملک کی سرکردگی میں چین فتح کرنے کے لیے آسام کے راستہ سے روانہ کیا اس کے علاوہ ایران فتح کرنے کے لیے بھی اس نے ایک فوج بھیجی تھی لیکن یہ دونوں مہم ناکام رہیں۔

ان صفات وکمالات اور خوبیوں کی وجہ سے قلیل مدت میں ہی اس نے وہ تمام صوبے جن کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا ان کو منظم اور مضبوط کیا۔ مال گذاری کا نظم اس قدر بہتر ہوگیا کہ صاحب طبقات اکبری کا بیان ہے۔

"واستقامت ولات وعمال بحدے رسیدہ بود کہ ہیچ یک از مقدمان یا متمردان آں نواحی را قدرت آں نبود کہ یک درم از مال دیوانی بطریق اخفا یا تمردنگاہ دارند وجمیع رایان وزمینداران ممالک کمرخدمت بستہ دائم بدرگاہ او حاضر مے بودند وآں قدر اموال از اطراف ممالک آمدن گرفت کہ باوجود افراط بذل وکثرت عطایائے سلطان محمد در خزانہ کمی ظاہر نہ شد" [1]

یہ امر خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس درجہ عمدہ مالی بند وبست مضبوط انتظام مال گذاری اور سخاوت وفیاضی کے باوجود سلطان اس بات کا بھی خیال رکھتا تھا کہ خزانہ میں کوئی پیسہ ناجائز ذریعہ سے نہ آئے چنانچہ ابن بطوطہ کا بیان ہے۔

"۱۳۴۱ء میں بادشاہ نے حکم دیا کہ سوا زکوٰۃ اور عشر کے اور سب محصول اور ڈنڈ معاف کردیے جائیں" [2]

دادرسانی اور عدل وانصاف کے لیے ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات کو دیوان خانہ کے سامنے ایک میدان میں بیٹھتا تھا اور اس روز اس کے سامنے فقط امیر حاجب، خاص حاجب، سید الحجاب اور شرف الحجاب یہ چار شخص ہوتے تھے۔ اور سب کو عام اجازت تھی کہ جس کسی کو جو شکایت ہو وہ ان چاروں میں سے کسی کے پاس جاکر اس شکایت کو قلم بند کرادے۔ جب یہ سب شکایتیں قلمبند ہوجاتی

[1] طبقات اکبری ج ۱ ص ۲۰۰   [2] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۱

تھیں تو بادشاہ عشا کے بعد خود ان کا مطالعہ کرتا تھا اور اگر اس کو یہ پتہ چلتا کہ ان لوگوں میں سے کسی نے کسی مستغیث کی شکایت قلم بند کرنے میں تساہل اور سہل انگاری سے کام لیا تو وہ اس پر سخت خفا اور ناراض ہوتا تھا۔ لہ

استبداد اور تلون مزاجی

ان خوبیوں اور کمالات و اوصاف کے باوجود سلطان محمد بن تغلق انتہا درجہ کا مستبد تشدد پسند اور متلون المزاج بھی تھا۔ اسی باعث اس کی شخصیت مورخین کے لیے ایک عجیب و غریب معمہ رہی ہے۔ اُس کی تلون مزاجی اور استبداد کا سب سے زیادہ افسوسناک اور حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اسے دفعۃً یہ خیال آیا کہ سارا ہندوستان دہلی کی سلطنت کا غاشیہ بردار ہو چکا ہے اس بنا پر مناسب یہ ہے کہ پائے خلافت کوئی ایسا مقام مقرر کیا جائے جسے ممالک محروسہ کے تمام شہروں سے وہی نسبت ہو جو مرکز کو دائرہ کے خطوط سے ہوتی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر کچھ لوگوں نے اجین کا نام لیا مگر بادشاہ کو آب و ہوا کے لحاظ سے دیوگڈھ زیادہ پسند تھا اس لیے اس نے حکم دیدیا کہ تمام اہالیان دہلی بغیر کسی استثنار کے دیوگڈھ جا کر آباد ہوں۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ دہلی بالکل ویران اور اجاڑ ہوگئی انسانوں کی بجائے درندوں اور وحشی جانوروں کا مسکن بن گئی اور اُدھر دیوگڈھ دولت آباد کے جدید نام سے آباد ہو کر ایک نہایت عالی شان و پرشکوہ اور بارونق شہر بن گیا۔ فرشتہ کا بیان ہے" پائے خلافت کے اس تغیر و تبدل سے رعایا کے حالات میں بھی ایک عظیم الشان تغیر اور مہمات سلطنت میں ابتری پیدا ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد پنجاب اور ملتان میں گڑبڑ ہوئی اور سلطان اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے خود ادھر آیا تو اب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے دولت آباد میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص بھی دہلی جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ اس اعلان کے بعد بہت سے لوگ بصد ہزار دقت دہلی آئے اور یہ شہر پھر آباد ہو گیا۔ عام مورخین نے اس واقعہ کو محمد بن تغلق کی تلون مزاجی اور بعض بعض نے تو اس کو دیوانہ پن سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن ہمارے دوست پروفیسر خلیق احمد نظامی ایم اے اپنے فاضلانہ مقالہ سلطان محمد بن تغلق کے مذہبی رجحانات مطبوعہ مجلہ برہان بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں لکھتے ہیں کہ سلطان نے یہ ....

لہ سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۱

جو کچھ کیا اشاعتِ اسلام کے جذبہ سے کیا تھا۔ چنانچہ رقم طراز ہیں۔

"اس کی سیاسی بصیرت نے بتا دیا تھا کہ اس جگہ مسلمانوں کی آبادی نہ ہوگی وہاں اسلامی سلطنت کی بنیادیں استوار نہ ہو سکیں گی اور اس سلسلہ میں ہر کوشش کاہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق ہوگی۔ چنانچہ دکن کے مسئلہ پر جب اس نے غور کیا تو اس کی دوربین نظر اسی طرف گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیش رو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر براہ راست حکومت نہ کر سکے۔ علاء الدین جیسے بادشاہ نے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کر لیا اس کی نظر فوراً تہ تک پہونچ گئی اور سمجھ گیا کہ اس خطہ میں جب تک مسلمان آبادی نہ ہوگی دہلی سے حکومت کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا چنانچہ اس نے کوشش کی کہ علماء و مشائخ کو دکن بھیجا جائے تاکہ وہاں پہونچ کر تبلیغ اسلام کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں۔ جس کو تبدیلی دارالسلطنت کے نام سے اب تک سنتے چلے آئے ہیں وہ کیا چیز تھی؟ حقیقت میں اسی سلسلہ کی ایک کوشش تھی جس کو مورخوں نے اس انداز میں پیش کیا کہ ایک مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئی۔ سلطان محمد بن تغلق نے اپنا دارالسلطنت دہلی سے تبدیل نہیں کیا تھا اس نے صرف علما اور مشائخ کو دیوگیر بھیجا تھا تاکہ وہ وہاں جاکر تبلیغ اسلام کریں۔ اس کی فوج، خزانے اور دفاتر سب دہلی میں ہی رہے۔ . . . .

سلطان نے جس مقصد کے لیے بزرگان دہلی کو دیوگیر بھیجا تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ میر خورد نے لکھا ہے" دیوگیر روانگی سے قبل سلطان نے ایک دربار عام کیا اور منبر پر کھڑے ہوکر لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی اس جلسہ میں مولانا فخرالدین مولانا شمس الدین یحییٰ اور شیخ نصیرالدینؒ چراغ دہلوی بھی موجود تھے۔"

(سیر الاولیا از میر خورد ص ۲۳۹)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر مہدی حسین نے اپنی کتاب "عروج وزوال محمد بن تغلق" میں ثابت کیا ہے کہ
صرف مسلمان ہی دیوگیر بھیجے گئے تھے۔ اس کی تصدیق برنی، مبزور دا اور عصامی کے
بیانات سے ہوتی ہے"

اس کے بعد موصوف نے ان تینوں سے اقتباسات پیش کیے ہیں جنہیں ہم بخوف طوالت ترک کرتے ہیں۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اگر محمد بن تغلق نے یہ سب کچھ اشاعتِ اسلام کے جذبہ سے ہی کیا تھا پھر بھی اس نے جس طرح کیا وہ اس کی تلون مزاجی، تشدد پسندی اور استبداد پروری کا آئینہ دار ہے اور یہ اور زیادہ لائق افسوس ہے کہ نیت بخیر ہونے کے باوجود اس نے عملی شکل ایسی اختیار کی جس سے بجائے فائدہ کے دہلی کی مرکزیت اور اسلامی اقتدار کو نقصانِ عظیم پہونچا اور تمام ملک میں بے اطمینانی، بیزاری اور بے چینی پھیل گئی۔

اس کے زمانہ میں دہلی اور اس کے اطراف واکناف میں ایک مرتبہ قحط اس قدر شدید پڑا کہ سترہ روپیہ کو بھی ایک سیر غلہ میسر نہیں آتا تھا اور ملک کے چوپائے اور لوگ بھوک سے فنا ہوگئے تھے۔ سلطان نے اس صورت حال کی تلافی کرنی چاہی اور کسانوں کاشتکاروں کے ساتھ تھوڑی بہت مراعات بھی کیں لیکن اس کا جبلی جبر وتشدد پھر بھی کم نہ ہوا۔ مورخ فرشتہ اس خاص زمانہ کے حالات لکھتے ہوئے کہتا ہے "پایۂ خلافت اور اس کے گردونواح میں حقیقی اور مجازی دونوں خداؤں کے قہر وغضب کی تلواریں نیام سے باہر نکلی ہوئی تھیں"[۱] بڑی بڑی فوجی معرکہ آرائیوں اور دوسرے اسباب کے باعث خزانہ شاہی خالی ہو چلا تھا اس کو پُر کرنے کے لیے ایک طرف تو اس نے زمین کا لگان عام لوگوں اور خصوصاً ہندوؤں پر اس قدر زیادہ لگا دیا کہ تنگ آکر بہت سے لوگ اپنے گھروں مویشیوں اور کھیتوں کو آگ لگا کر جنگلوں میں جا بسے۔ اور دوسری جانب اس نے تانبہ کے سکے رائج کر دیے جن کو بیرونی ممالک کے سوداگروں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت رُک گئی

[۱] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۴۳

بازار سرد۔ اور کاروبار تباہ و برباد ہو گئے اور گداگری عام ہو گئی۔ [1]

اس عام بدنظمی، ابتری اور اضطراب و بے اطمینانی کا ملک کی سیاست اور اس کے نظم و نسق پر بہت برا اثر ہوا کئی صوبے دہلی کی مرکزیت سے الگ ہو گئے۔ علی الخصوص جنوبی ہند کے بعض علاقے تو ایسے آزاد ہوئے کہ پھر مسلمانوں کو ان کا فتح کرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ وجیانگر کی وسیع ہندو سلطنت اور دکن میں مسلمان بہمنی سلطنت ان دونوں کی بنیاد بھی سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں ہی پڑی۔ اور سلطان علاء الدین خلجی کے عہد حکومت کی بہ نسبت محمد بن تغلق کے عہد میں دہلی کا دائرۂ اثر سمٹتے سمٹتے بہت مختصر رہ گیا۔

جہاں تک وقت کے بعض مشائخ و صوفیائے کرام کا تعلق ہے۔ سلطان کا رویہ اُن کے ساتھ بھی اچھا نہیں تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق سلطان یہ چاہتا تھا کہ ان مشائخ اور علمائے کرام سے جن میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی تھی اپنے بعض نجی کام لے۔ حضرت چراغ دہلوی نے اس سے انکار کیا تو اس نے انہیں قید کر دیا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ عبرت انگیز اور سبق آموز واقعہ حضرت شیخ شہاب الدینؒ جو شیخ الاسلام جام زندہ پیل کی اولاد میں سے تھے اور دہلی کے کبار مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ شیخ شہاب الدین بادشاہ کے ظلم و استبداد سے تنگ آکر دہلی سے باہر چھ کوس کے فاصلہ پر ایک غار میں مقیم ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے ان کو بلایا تو انہوں نے حاضر ہونے سے انکار کیا اور کہا کہ "میں اس ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہیں کروں گا" بادشاہ نے ان کو دربار میں پکڑ بلوایا اور پوچھا کیا تو مجھے ظالم کہتا ہے" شیخ نے جواب دیا" ہاں تو ظالم ہے اور تونے فلاں فلاں ظلم کیے ہیں، اس سلسلہ میں شیخ نے شہر دہلی کے اجاڑنے اور یہاں کے لوگوں کو دولت آباد لیجانے کا بھی ذکر کیا" سلطان محمد بن تغلق نے اپنی تلوار نکال کر صدر جہاں کے ہاتھ میں دی اور کہا کہ مجھے ظالم ثابت کر اور میری گردن اس تلوار سے اڑا دے" شیخ نے فرمایا" جو شخص تجھ پر ظالم ہونے کی شہادت دے گا وہ خود قتل کیا جائے گا لیکن تو خود خوب جانتا ہے کہ تو ظالم ہے" اب بادشاہ

[1] فرشتہ و طبقات اکبری

نے شیخ کو پابزنجیر اور دست بستہ کرنے کا حکم دیا۔ چودہ روز اسی طرح گذر گئے کہ شیخ نے نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔ چودھویں دن بادشاہ نے شیخ کے پاس کھانے کا کچھ سامان بھیجا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے کہ میرا رزق اب زمین سے اٹھ گیا ہے۔ بادشاہ کا کھانا اس کے پاس ہی لیجاؤ۔ یہ سُن کر سلطان اور برافروختہ ہوا اور حکم دیا کہ شیخ کو جبراً گوبر کھلایا جائے۔ چنانچہ چند بدبختوں نے شیخ کو زبردستی زمین پر چت لٹا کر اس غیر انسانی حکم شاہی کی تعمیل کی۔ اس واقعہ کے دوسرے دن شیخ کو قاضی صدر جہاں کے پاس لے گئے اور وہاں تمام لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ اپنا قول واپس لے لیجیے لیکن شیخ نہ مانے اور آخر ان کا سر سپرد تیغ کر دیا گیا۔ [1]

عہدِ حاضر کے بعض مورخین نے سلطان کے دامن سے اس دھبہ کو دھونے کی سعی کی ہے لیکن بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان کا مذہبی تعصب، تفلسف، تشدد پسندی۔ اور مزاج کی انانیت اور اس کا دماغی عدم توازن بھی چند چیزیں ہیں جو اس کے زوال کا سبب بنیں۔ بادشاہ کو ملک کے حالات کی ابتری اور روز بروز ان کے بگڑتے جانے کا خود بھی احساس تھا چنانچہ اس نے ضیاء الدین برنی سے جو اس عہد کے مشہور مورخ تھے کہا کہ میری سلطنت کے ہر عضو میں مختلف امراض پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر ایک کا علاج کرتا ہوں تو دوسری بیماری بڑھتی ہے۔ تم نے چونکہ تاریخ کا کافی مطالعہ کیا ہے اس لیے بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ برنی کہتے ہیں "میں نے جواب دیا اگر کسی بادشاہ سے اس کی رعایا نفرت کرنے لگے اور ملک میں فساد کی آگ بھڑک اٹھے تو مناسب یہی ہے کہ بادشاہ اپنے بھائی یا بیٹے کو اپنا جانشین بنا کر خلوت گزین ہو جائے اور اگر تخت سلطنت چھوڑنا گوارا نہ ہو تو ان باتوں سے پرہیز کرے جن سے رعایا کی نفرت میں روز بروز اضافہ ہو" سلطان نے جواب دیا "میرا نہ کوئی فرزند ہے جو میرا قائم مقام ہو سکے اور نہ میں سیاست سے کنارہ کش ہو سکتا ہوں اب جو کچھ ہونا ہے ہو مجھے اس کی پروا نہیں ہے"۔

آخر انہیں افسوسناک حالات میں جب کہ ملک برباد، خزانہ خالی، رعایا پریشان حال، جگہ

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۱۳۷ - ۱۳۹

جگہ بغاوتوں اور حکومت دہلی کی مخالفت کا بازار گرم تھا۔ ستائیس برس بادشاہت کرنے کے بعد ۲۱ر محرم الحرام ۷۵۲ھ مطابق ۱۳۵۱ء کو شدید بخار میں مبتلا ہو کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ فرشتہ نے اس موقعہ پر حسب ذیل تین شعر لکھے ہیں جو خود سلطان نے عین عالم نزع میں کہے تھے۔

بسیار دریں جہاں چمیدیم — بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم — ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر — چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

سلطان فیروز شاہ تغلق | محمد بن تغلق کی وفات کے بعد اس کے چچازاد بھائی فیروز شاہ نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا۔ فیروز شاہ سلطان غیاث الدین تغلق کے حقیقی بھائی سپہ سالار رجب کا بیٹا تھا اور دیبال پور کے ایک راجہ رانا مل بھٹی کی لڑکی کے بطن سے جو اپنے باپ کے گھر بی نائلہ کے نام سے مشہور تھی لیکن سپہ سالار رجب سے شادی کے بعد کدبانو کہلاتی تھی۔ ۷۰۹ھ میں پیدا ہوا۔ ابھی اس کی عمر سات برس کی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا اس کے بعد چچا یعنی سلطان غیاث الدین تغلق نے اسے اپنی نگرانی اور تربیت میں لے لیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے جلوس کے وقت فیروز شاہ کی عمر چودہ سال کی تھی۔ نیک سیرت چچا ہونہار بھتیجہ پر اس قدر مہربان تھا کہ مدت حکومت و سلطنت میں وہ ہمیشہ بھتیجہ کو اپنی خدمت میں رکھتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیروز شاہ آئینِ جہانداری و قوانین شہریاری سے اچھی طرح باخبر ہو گیا۔ سلطان تغلق کی وفات کے بعد محمد بن تغلق تخت پر بیٹھا تو یہ بھی اپنے چچازاد بھائی پر اس کی غیر معمولی سعادت مندی اور نیک طینتی کے باعث بڑا مہربان رہا۔ یہاں تک کہ اس نے فیروز شاہ کو نائب امیر حاجب مقرر کر کے نائب باربک کا خطاب عطا کیا۔ عفیف شمس سراج کا بیان ہے کہ سلطان محمد فیروز شاہ کو ہر وقت اپنے روبرو رکھتا تھا۔ اور اگرچہ وہ کبھی کبھی فیروز شاہ پر بے حد سختی بھی کرتا تھا اور اس سے محنت و مشقت بھی کراتا تھا لیکن اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ فیروز شاہ معاملات جہانداری میں پختہ اور ماہر ہو جائے [1]

[1] تاریخ فیروز شاہی مقدمہ اول و دوم

جب سلطان محمد مرض وفات میں مبتلا ہوا تو فیروز شاہ نے اس کی بڑی خدمت کی اور سلطان نے وصیت کی کہ میرے بعد فیروز شاہ کو بادشاہ بنایا جائے۔ لیکن جب سلطان محمد بن تغلق کی وفات کے بعد اس کی خواہش کے مطابق علمائے کرام، مشائخ عظام اور دوسرے اعیان وامراء نے متفق ہو کر فیروز شاہ سے تخت نشینی کی درخواست کی تو اس نے کہا "میں حج و زیارت حرمین شریفین کا ارادہ کر چکا ہوں اس لیے میرے علاوہ کسی اور کو اس منصبِ جلیل کے لیے منتخب کیا جائے" لیکن اس وقت ملک کے حالات بڑے ابتر تھے۔ دہلی میں اور دوسرے علاقوں میں مغلوں نے شورش پیدا کر رکھی تھی۔ پھر یہی واقعہ ہے کہ سلطنت کے لیے فیروز شاہ تغلق سے زیادہ موزوں اور مناسب کوئی دوسرا شخص مل بھی نہیں سکتا تھا اس بنا پر سب علما اور مشائخ نے جن میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ اور مخدوم زادہ عباسی کے نام زیادہ نمایاں ہیں اور دوسرے خوانین و ملوک نے یک آواز ہو کر فیروز شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور امیر تاتار خاں جو اس مجمع میں سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا اس نے خود فیروز شاہ کا بازو پکڑا اور اس کو زبردستی تختِ سلطنت پر بٹھا دیا بادشاہ کی نیک طینتی، پاک باطنی اور خدا ترسی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ زبردستی تختِ سلطنت پر بٹھایا جانے لگا تو اس نے کہا "اچھا! اگر یہ بارِ گراں تم میری گردن میں ڈالتے ہی ہو تو ذرا صبر کرو کہ میں وضو کر لوں۔ چنانچہ اس نے وضو کی۔ دو رکعتیں نماز کی پڑھیں اور پھر دیر تک بارگاہ خداوندی میں سر بسجدہ رہ کر یہ دعا کرتا رہا کہ بار الٰہا! ممالک کا اطمینان اور رفاہیت اور عالم کا انتظام و توفیقِ جہانداری انسان کے اندازۂ قوت سے باہر ہے نظام عالم کا انحصار تیرے حکم پر ہے۔ خداوندا! تو ہی میری قوت و پناہ ہے۔[1]

سلطان فیروز شاہ تغلق نے تقریباً اڑتیس سال (از ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) حکومت کی لیکن حق یہ ہے کہ اس نے بحیثیت ایک مسلمان بادشاہ کے سلطنت کا حق ادا کر دیا۔ بقول ایک یورپین مورخ کے وہ اپنی مملکت کی توسیع کا اتنا خواہاں نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے مذہب کی اشاعت کا

---

[1] تاریخ فیروز شاہی شمس عفیف مقدمہ سوم

آرزومند تھا ئے۔ اس کا عہد ملک میں عام امن وامان، رفاہیت وطمانیت اور رعایا پروری کے اعتبار سے دلی سلطنت کا ایک عہد زرین ہے۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جنہیں محمد بن تغلق نے بغیر کسی معقول وجہ کے قید کر رکھا تھا اور جو لوگ بے گناہ قتل کیے گئے تھے ان کے وارثوں کو خون بہا دیا۔ جن لوگوں کی جائداد جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں ان کو واگذار کیا اور جن پر بڑے بڑے بھاری محصول اور ٹیکس لگا دیے گئے تھے انہیں اس بارِ گراں سے نجات دی۔

سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں بہت سے صوبے خود مختار اور آزاد ہو گئے تھے اور دلی کی سلطنت کا حلقہ اثر مختصر ہو گیا تھا فیروز شاہ نے ان کو فتح کرنے کے بجائے ان کی آزادی تسلیم کر لی۔ بنگال کو البتہ بادل ناخواستہ فتح کرنا چاہا مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی تمام تر توجہ اس پر مرکوز تھی کہ جتنے حصہ پر اس کا قبضہ تھا اس میں ایک خالص اسلامی طرز کی حکومت کو رواج دے اور احکام شریعت کا نفاذ کرے۔

اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے حسبِ ذیل اہم کام انجام دیے۔

(۱) پہلی بادشاہتوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوتے تھے اس نے ان سب کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے تمام خدم وحشم کو تنخواہ دار مقرر کیا اور یہ قاعدہ جاری کیا کہ اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کی وجہ معاش اس کے فرزند کی طرف منتقل کر دی جائے اگر اولادِ نرینہ نہ ہو تو داماد کو۔ اور اگر داماد بھی نہ ہو تو غلام کو۔ اور اگر مرنے والے کا غلام بھی نہ ہو تو اس کے دوسرے اعزہ کی طرف اسے منتقل کر دیا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول عفیف (شمس سراج) کے "رعایائے سلطنت اور آبادی میں اتنا اضافہ ہوا کہ ہر قطعہ ملک میں ہر چار کوس پر ایک گاؤں آباد ہو گیا اور ہر شخص کے پاس سونے چاندی اور دوسرے اسباب راحت وآسائش کا انبار لگ گیا۔

(۲) خطبہ میں سلاطین اسلام کے نام نہیں لیے جاتے تھے فیروز شاہ نے حکم دیا کہ ان کے نام لیے جائیں۔

History of India, Page 109 By Dela Fass, ۵۱

(۳) پہلے سے جو ناجائز اور غیر شرعی ٹیکس جاری تھے ان کو یک قلم ختم کر دیا جو عامل ایک حبہ بھی ناجائز ٹیکس کا لیتا تھا اسے شدید ترین سزا دی جاتی تھی۔

(۴) پہلے یہ رواج تھا کہ مال غنیمت کا صرف ایک خمس سپاہیوں میں تقسیم ہوتا تھا اور باقی سب خزانہ میں داخل کر دیا جاتا تھا سلطان نے شرعی حکم کے مطابق تاکید کی کہ صرف ایک خمس خزانہ میں داخل کیا جائے اور باقی سب لشکریوں میں بانٹ دیا جائے۔

(۵) جو لوگ ملک میں الحاد و زندقہ اور بے دینی کی اشاعت کر رہے تھے ان کو سخت ترین سزائیں دیں ان کی کتابوں کو جلایا اور اس طرح ملک سے ان کا اثر بالکل ناپید کر دیا۔

(۶) مسلمانوں میں جو غیر شرعی اور ناجائز رسوم رائج تھے۔ مثلاً عورتوں کا قبروں پر جانا۔ تصویریں کھچوانا اور ان کا گھروں میں رکھنا۔ سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال وغیرہ ان تمام کی سخت ممانعت کر دی اور شاہی محلات تک سے اس قسم کی تمام تصویریں اور برتن وغیرہ پھنکوا دیے

ان اصلاحات کے علاوہ اس نے تعمیری کام بھی بہت کیے مدارس اور مساجد کی تعمیر کرائی۔ علما اور مشائخ کی زیادہ سے زیادہ قدر دانی کی۔ کتابیں ادھر اُدھر سے فراہم کیں۔ علم و ادب کو فروغ دیا۔ سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ تاتارخانیہ اور اس کے علاوہ فقہ فیروز شاہی دونوں اسی کے عہد کے کارنامے ہیں۔ بادشاہ نے فتوحاتِ فیروز شاہی کے نام سے خود ۳۲ صفحات کا ایک رسالہ لکھا تھا جو فیروز شاہ کے کوٹلہ میں ایک ستون پر کندہ بھی کرایا گیا تھا اس میں فیروز شاہ نے خود اپنی رائج کردہ اصلاحات اور اپنے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔

علاوہ بریں اس نے جگہ جگہ شفاخانے بنوائے کارواں سرائیں تعمیر کیں۔ حوض بنوائے نہریں نکالیں۔ سڑکیں بنائیں اور سینکڑوں کام رفاہ عام کے کیے۔

فرشتہ نے فیروز شاہ کے رفاہ عام کے کاموں کے اعداد نقل کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) بندجو	۵۰	عدد
(۲) مسجدیں	۴۰	"
(۳) مدارس	۳۰	"
(۴) خانقاہیں	۲۰	"
(۵) محلات اور قصر	۱۰۰	"
(۶) شفاخانے	۵	"
(۷) مقبرے	۱۰۰	"
(۸) حمام	۱۰	"
(۹) کنویں	۱۵۰۰	"
(۱۰) پُل	۱۰۰	"

اس کے بعد فرشتہ لکھتا ہے" ان کے علاوہ بے شمار باغات رعایا اور ملک کے فائدے کے لیے بنوائے۔ بادشاہ نے ہر عمارت کو تعمیر کرکے اس کے مخارج کے لیے آمدنی وقف کی اور ہر وقف کے لیے ایک دستاویز لکھ کر اس کے اجرا کے احکام نافذ کیے۔ فیروزشاہ نے علما اور فقہا سے مشورہ کے بعد ہندوؤں کو ذمی قرار دے کر ان پر جزیہ مقرر کیا تھا اور اس کے بدلے ان کو وہ تمام شہری حقوق دیے گئے تھے جو اسلام اہلِ ذمہ کے لیے قرار دیتا ہے"۔

آخر نوے برس کی عمر پا کر ۳۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۸۷ء میں وفات پائی۔

امیر تیمور فیروزشاہ تغلق کی وفات کے بعد پورا ملک بغاوت اور طوائف الملوکی کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ نو برس کی مدت میں یکے بعد دیگرے کئی مدعیانِ سلطنت اٹھے اور تختِ حکومت پر

ل یہ سب معلومات تاریخ فیروزشاہی عفیف شمس سراج اور تاریخ فرشتہ سے جس نے فتوحات فیروزشاہی کا خلاصہ خود فیروزشاہ کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ماخوذ ہیں۔

قابض ہو ہو کر قتل کر دیے گئے پہلے اس کا پوتا تغلق شاہ تخت نشین ہوا اور غیاث الدین تغلق شاہ کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ ایک سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ قتل کر دیا گیا اور اس کا چچا زاد بھائی ابوبکر شاہ بادشاہ ہوا لیکن ڈیڑھ برس کے بعد ناصر الدین محمد نے اسے قتل کرا دیا اور خود تخت سلطنت پر قابض ہوا اس نے چھ برس سات مہینے حکومت کی۔ اب اس کا بیٹا ہمایوں خاں سلطان سکندر شاہ کے نام سے بادشاہ ہوا لیکن ڈیڑھ مہینہ بعد ہی ایک شدید مرض میں گرفتار ہو کر چل بسا۔ اب امیروں میں سخت اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جائے۔ اس اختلاف نے اتنا طول کھینچا کہ پندرہ روز تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور تخت سلطنت لاوارث پڑا رہا۔ آخر ایک مشہور امیر خواجہ جہاں کی کوشش سے ناصر الدین محمد کا سب سے چھوٹا بیٹا محمود جمادی الاولیٰ ۷۹۶ھ میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اور ناصر الدین کے لقب سے مشہور ہوا۔ چند دنوں بعد ہی ایک امیر سعادت خاں باغی ہو گیا اور اس نے سلطان فیروز شاہ تغلق کے پوتے نصرت خاں کو دہلی کے تخت پر بٹھانے کے لیے جد و جہد کی۔ سعادت خاں تو مارا گیا لیکن فیروز آباد کے امیروں نے نصرت خاں کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ دہلی میں محمود تغلق بادشاہ تھا اور فیروز آباد میں نصرت خاں اس طرح گویا ایک ہی تخت پر دو بادشاہ حکمرانی کر رہے تھے۔ اس صورت حال نے دہلی سلطنت کو بالکل کمزور کر دیا۔ ملک میں ہر طرف بد امنی اور شورش پھیل گئی۔ بنگال، جون پور، سندھ، گجرات، مالوہ اور دکن اگرچہ یہاں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں لیکن یہ صوبے بالکل آزاد اور خود مختار تھے۔ دہلی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا راجپوتانہ اور جنوبی ہند میں ہندوؤں کی مضبوط حکومتیں قائم تھیں۔ اس طرح ظاہر ہے دہلی سلطنت کا اقتدار ہی کیا ہو سکتا تھا۔ اور تھوڑا بہت اگر کچھ تھا بھی تو اسے تیمور لنگ نے ۸۰۰ھ میں حملہ کر کے برابر کر دیا۔

عجیب بات ہے تیمور اپنے ملفوظات میں ہندوستان پر اپنے حملہ کے دو مقصد بیان کرتا ہے۔ ایک دشمنانِ اسلام بت پرستوں سے جنگ کرنا اور دوسرا یہ کہ بت پرستوں کے مال و دولت کو لوٹ کر اسلام کی سپاہ کے لیے اسباب معیشت فراہم کرنا۔ لیکن تیمور کا حد سے زیادہ ظلم و ستم

اس کی غیر انسانی حرکات اور دہلی میں کئی روز تک قتلِ عام کرنے کے بعد اس کو لوٹ کھسوٹ کر واپس چلا جانا اور دہلی کے علاوہ ہندوستان کے بھی دوسرے شہروں میں اور ان کے علاوہ ایران، انگورہ وغیرہ ممالک میں خود مسلمانوں کو انتہائی بے دردی اور سفاکی سے قتل کرنا۔ یہاں تک کہ بعض بعض جگہ مقتولین کے سروں کا مینار بنانا انگورہ میں سلطان بایزید یلدرم ایسے مجاہد اسلام سے جنگ کرنا اور پھر گرفتار کرنے کے بعد اسے ایک پنجرہ میں بند رکھنا یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کے اعمال و افعال کا محرک کوئی اسلامی جذبہ کس حد تک ہو سکتا ہے! تیمور کے محاصرۂ دہلی سے ایک روز پہلے ہی محمود تغلق گجرات بھاگ گیا۔ اب اہلِ شہر نے کچھ دیر تیمور کی مقاومت کی۔ آخر اس شرط پر کہ ان کی زندگیاں محفوظ رہیں گی انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ لیکن چنگیز خاں کے جانشین نے اس شرط پر اس طرح عمل کیا کہ سقوطِ دہلی کے بعد اس نے قتلِ عام کا حکم دیدیا۔ بازار سڑکیں اور گلی کوچے لاشوں سے پٹ گئے۔ آخر کار شہر کو ایک ویرانہ بنا کر پندرہ دن کے بعد یہاں سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد محمود تغلق کے وزیر ملو اقبال نے موقع پا کر دہلی پر قبضہ جما لیا اور حکومت کرنے لگا۔ ۱۴۰۵ء میں اس کے خلاف بغاوت کا ایک شدید طوفان اٹھا اور یہ قتل کر دیا گیا۔ اب لوگوں نے محمود تغلق کو گجرات سے بلا کر پھر اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا اس نے ۱۴۱۲ء تک حکومت کی لیکن اب اس کے پاس دہلی کی گذشتہ وسیع سلطنت میں سے لے دے کے صرف ایک شہر دہلی رہ گیا تھا اس بنا پر اس نے بادشاہ کا لقب بھی پسند نہیں کیا۔

خاندان سادات از ۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۱ء

محمود تغلق کی وفات کے بعد ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ یہاں تک کہ ۱۴۱۴ء میں خضر خاں جو سندھ کا گورنر تھا دہلی پہنچا اور اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس کے تین جانشین پے در پے تختِ سلطنت پر بیٹھے لیکن ان کا رقبہ سلطنت دہلی اور اس کے قرب و جوار پر مشتمل تھا اور پھر ان کا وقت زیادہ تر مسلمان ہمسایہ حکومتوں کے ساتھ جنگ و جدل کرنے ہی میں صرف ہوا۔ خضر خاں کا خاندان اس لیے خاندانِ سادات کہلاتا ہے کہ خضر خاں ملک سلیمان کا بیٹا تھا اور وہ سید ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ فرشتہ نے اس دعویٰ کی صداقت کو ثابت

کرنے کے لیے تاریخ مبارک شاہی کے حوالہ سے دو دلیلیں نقل کی ہیں لیکن دونوں نہایت کمزور اور لغو ہیں۔

اس خاندان کا آخری فرماں روا سلطان علاء الدین بن سلطان محمد شاہ تھا لیکن اپنے باپ کی طرح یہ بھی نہایت ناکارہ اور راحت پسند تھا۔ ایک مرتبہ بدایوں گیا تو وہاں کی آب و ہوا اس قدر مرغوب طبع ہوئی کہ وہیں مستقل سکونت کا ارادہ کرلیا۔ حالانکہ یہاں دہلی میں سخت بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ دہلی حکومت کا رقبہ سمٹتے سمٹتے بہت ہی مختصر رہ گیا تھا ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ بہلول لودھی جو پنجاب کا گورنر تھا دہلی پہونچ کر شہر پر قابض ہوگیا اور اس نے علاء الدین کو بدایوں لکھا کہ میں نے دہلی آکر یہاں کے تمام بگڑے ہوئے کام سنوار دیے ہیں اور خطبہ سے آپ کا نام نہیں نکالا ہے۔ علاء الدین نے جواب میں لکھا "میرے باپ نے تم کو بیٹا بنایا تھا اور میں تم کو اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں اب میں دہلی کی سلطنت بخوشی تمہارے حوالہ کرتا ہوں اور خود بدایوں پر قناعت کروں گا۔"[1] چنانچہ ۸۵۵ھ مطابق ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی دہلی کا مستقل فرماں روا ہوا اور اب افغانوں کی دہلی پر حکومت کی بنیاد پڑی۔

لودھی خاندان بہلول لودھی واقعی ایک قابل بادشاہ تھا اس نے دہلی کی عظمتِ گذشتہ کو واپس لانے کی بڑی کوشش کی آس پاس کے علاقوں کو بھی فتح کیا اور ۱۴۷۸ء میں جونپور کو بھی فتح کرلیا۔ ۱۴۸۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا سلطان سکندر لودھی جانشین ہوا اب اُس کے قبضہ میں ایک ایسی سلطنت تھی جو پنجاب اور صوبہ متحدہ پر تو مشتمل تھی ہی۔ اس کے عہدِ حکومت میں بہار کا اس میں اور اضافہ ہوگیا۔ اور اس نے اپنا دارالخلافت آگرہ کو قرار دیا اس میں شک نہیں کہ سکندر لودھی بڑا بیدار مغز اور قابل بادشاہ تھا۔ علاوہ بہادر اور جری ہونے کے علمی ذوق سے بھی بہرہ وافر رکھتا تھا اس کے عہد میں شیخ عبداللہ ایک فاضل تھے۔ سکندر لودھی ان کے درس میں خود شریک ہوتا تھا اور اس خیال سے کہ اس کی موجودگی کے باعث نظامِ درس میں کوئی

[1] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۲۳

خلل پیدا نہ ہو مدرسے متصل ایک گوشۂ مسجد میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور تقریر درس سنتا رہتا تھا اس ذوق کے باعث علما و فضلا کی بڑی قدردانی کرتا تھا مولانا رفیع الدین شیرازی محدث شیراز سے تشریف لائے تو سکندر نے ان کی بڑی قدر کی اور انہوں نے آگرہ میں مدتوں حدیث کا درس دیا۔ نماز روزہ کا پابند تھا۔ احکامِ شرع کا حتی الوسع لحاظ رکھتا تھا وہ خود شاعر بھی تھا گلرخی تخلص تھا اُس کے عہد میں فارسی زبان کو بڑی ترقی ہوئی متعدد عمدہ اور قابلِ قدر کتابیں بھی لکھی گئیں لیکن افسوس ہے کہ مزاج میں درشتی بہت زیادہ تھی۔ اس بنا پر ہندو عام طور پر اس سے خوش نہیں تھے اس کے عہد کا ایک نہایت افسوسناک واقعہ بدہن برہمن کا قتل ہے اس نے بعض اور مفکرین کی طرح ایک مرتبہ یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام اور ہندو مذہب بنیادی طور پر دونوں ایک ہی ہیں۔ سکندر لودھی نے بدھن برہمن کا یہ عقیدہ علما کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا۔ یہ جماعت کس قسم کے وسیع النظر اور صحیح العلم علما پر مشتمل تھی اس کا اندازہ ان کے اس فیصلہ سے ہو سکتا ہے کہ برہمن نے چونکہ اسلام کی صداقت کا اقرار کر لیا ہے اس بنا پر وہ مسلمان ہو گیا۔ اب اس کے بعد اگر وہ ہندو مذہب کی صداقت کا بھی اقرار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام سے روگردانی اختیار کرتا ہے۔ اور اس بنا پر سزائے ارتداد یعنی قتل کا مستحق ہے چنانچہ علمائے کرام کے اس عجیب و غریب فیصلہ کے مطابق کہ اسلام کی صداقت کا کیوں اقرار کرتا ہے بدھن برہمن قتل کر دیا گیا ۹۲۳ھ مطابق ۱۵۱۷ء میں تقریباً تیس سال حکومت کرنے کے بعد ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر آگرہ میں وفات پائی۔

بابر سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کے عہد میں ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ہوئیں طوائف الملوکی عام ہو گئی۔ اسی سلسلہ میں پنجاب کے گورنر دولت خاں نے بادشاہ کابل کو لکھا کہ اس وقت ہندوستان پر حملہ کر کے قبضہ کر لینا بہت آسان ہے۔ بابر اس موقع کا منتظر تھا ہی اور تیمور کی نسل میں سے ہونے کے باعث دہلی کی سلطنت کو وہ اپنا موروثی حق بھی سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک جرار فوج لے کر کابل سے روانہ ہوا اور پنجاب کو روندتا ہوا

آگے بڑھا ادھر ابراہیم لودھی ایک عظیم الشان لشکر اور بڑے ساز و سامان کے ساتھ دہلی سے روانہ ہوا۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی جو اگرچہ مختصر تھی مگر نہایت ہولناک تھی، ایک دن کی جنگ میں ہی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بابر کے حق میں ہو گیا اس ایک دن کی جنگ میں ابراہیم لودھی کے ساتھ اس کی فوج کے پندرہ ہزار آدمی بھی مارے گئے اب بابر دہلی کی طرف روانہ ہوا اور بغیر کسی مزاحمت کے اس پر قابض ہو کر اپنے شہنشاہِ ہندوستان ہونے کا اعلان کر دیا یہ واقعہ ۱۵۲۶ء کا ہے یہاں سے فارغ ہو کر اس نے آگرہ پر قبضہ کیا ابراہیم لودھی کے گھر والوں کو گرفتار کر لیا۔ افغانوں نے دہلی اور آگرہ سے دست بردار ہو کر جونپور میں اپنی حکومت قائم کرنی چاہی لیکن ان کو یہاں بھی شکست ہوئی۔ بابر اور ہمایوں افغانوں کی مہم سے ابھی پورے طور پر فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا راجپوتوں کی ایک عظیم الشان فوج لیکر بڑے طمطراق کے ساتھ بابر سے لڑنے کے لیے آگرہ کی طرف بڑھا ابراہیم لودھی کا بھائی محمود لودھی بھی ایک بڑے لشکر کے ساتھ رانا سانگا سے مل گیا تھا۔ آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے میدان میں جنگ ہوئی یہی وہ جنگ ہے جس میں بابر نے شراب نوشی اور دوسرے منکراتِ شرع سے توبہ کر کے بارگاہِ ایزدی میں صدق دل سے اپنی فتح کے لیے دعا کی ہے۔ راجپوت دم توڑ کر لڑے اور شروع شروع میں میدان کا پلڑہ انہیں کی طرف جھکتا ہوا نظر بھی آتا تھا۔ لیکن انجام کار اسلامی فوج کو شاندار فتح ہوئی بابر نے راجپوتوں کا تعاقب کیا اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک کہ ان لوگوں کی طاقت و قوت کے مراکز پر قبضہ نہیں کر لیا۔ ۱۵۲۹ء میں بابر نے بہار پر بھی قبضہ کر لیا اور اب اس کی سلطنت ایک طرف بخارا سے ملتان تک اور دوسری جانب بحر عرب سے بہار کی مشرقی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۵۳۰ء مطابق ۹۳۷ھ میں بابر نے مختصر علالت کے بعد آگرہ میں وفات پائی لاش کابل میں لاکر دفن کی گئی۔ بہشت روزی باد تاریخ وفات ہے

بابر کے اوصاف و کمالات — مغلیہ خاندان میں بڑے بڑے نام ور بادشاہ پیدا ہوئے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مختلف حیثیتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کے باعث جو جامعیت اور

دل کشی بابر کی ذات میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ وہ بارہ برس کی عمر میں بادشاہ ہوا اور اڑتیس سال تک حکمرانی کی، وہ ایک طرف نہایت بہادر، جری، فنونِ سپہ گری کا ماہر تھا اور دوسری جانب علم وادب کا دلدادہ اور موسیقی میں حصہ وافر رکھتا تھا۔ علم الانشا میں اس کے ذوقِ اختراع کا یہ عالم تھا کہ اس نے خطِ بابری کے نام سے ایک مستقل خط ایجاد کیا اور اس خط میں قرآن مجید کے کئی نسخے لکھ کر اس نے مکہ معظمہ بھیجے اس نے تزک بابری کے نام سے اپنے عہدِ حکومت کے واقعات وحالات بھی ترکی زبان میں قلم بند کیے تھے جس کا فارسی ترجمہ بادشاہ اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خان خاناں نے کیا تھا۔ علاوہ نثر نویس، خوش خط اور ادیب ہونے کے وہ شاعر بھی تھا چنانچہ اس کا یہ شعر جو کابل میں بابر کے ہی بنوائے ہوئے ایک حوض کے کنارے کندہ ہے۔ عام طور پر بہت مشہور ہے۔

نوروز و نوبہار دمے و دل رباخوش است
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست،

اگرچہ اسے ہندوستان میں چین سے رہنے اور اطمینان سے حکومت کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ تاہم اس نے چند دنوں میں ہی یہ معلوم کر لیا تھا کہ ہندوستان میں کوئی حکومت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک کہ یہاں کے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی رعایت کرکے ان کے ساتھ ملاطفت اور رواداری کا معاملہ نہ کیا جائے چنانچہ اس نے مرض الوفات میں ہمایوں کو اپنا جانشین بناتے ہوئے وصیت کی کہ "ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں اور یہ اللہ تعالےٰ کی بڑی عنایت ہے کہ اس نے تمہیں اس ملک کا بادشاہ بنایا اب تمہیں چاہیئے کہ حسب ذیل باتوں کا خیال رکھو

(۱) مذہبی تعصب کو اپنے دل میں جگہ مت دو۔ اور لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی رسوم کا خیال رکھتے ہوئے رورعایت کے بغیر سب قوموں کے ساتھ پورا انصاف کرو۔

(۲) گاؤ کشی سے خاص طور پر پرہیز کرو۔ تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں لوگوں کے دل میں جگہ ملے

اور وہ دل سے تمہاری اطاعت کریں۔ بادشاہ اور رعایا کے تعلقات خوش گوار رہیں اور ملک میں امن وامان قائم رہے۔

(۳) تمہیں کسی قوم کی عبادت گاہ کو مسمار نہیں کرنا چاہیے اور ہمیشہ سب کے ساتھ پورا انصاف کرنا چاہیے۔

(۴) شیعہ سنی اختلافات کو ہمیشہ نظر انداز رکھو کیونکہ اس سے اسلام کمزور ہو جائے گا۔

(۵) اسلام کی اشاعت ظلم وستم کی تلوار کے مقابلہ میں لطف واحسان کی تلوار سے زیادہ بہتر طریقہ پر ہو سکے گی۔

(٦) اپنی رعایا کی مختلف خصوصیات کو سال کے مختلف موسم سمجھو تاکہ حکومت بیماری اور ضعف سے محفوظ رہ سکے۔ [۱]

ان اوصاف وکمالات کے باوجود وہ نماز روزہ کا بھی بڑا پابند تھا فرشتہ کا بیان ہے "فردوس مکانی (بابر) حنفی المذہب مجتہد تھے۔ نماز کبھی قضا نہیں کی اور ہر جمعہ کو پابندی سے روزہ رکھتے تھے"[۲]

ہمایوں بابر کے انتقال کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے۔ ہمایوں جو بھائیوں میں سب سے بڑا تھا دہلی کا بادشاہ ہوا۔ کامران کے حصہ میں افغانستان اور پنجاب کی حکومت آئی باقی دو اور بھائی ہمایوں کے ماتحت صوبوں کے گورنر مقرر ہوئے۔ لیکن ہمایوں غریب کو بھائیوں کی رقابت اور اندرونی شورشوں کے باعث چین سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ افغانوں کو اگرچہ شکستِ فاش ہو چکی تھی تاہم شیر شاہ سوری نے اپنی قوت بہار میں جمع کر لی تھی اور بعد میں بنگال کو بھی فتح کر کے اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

ہمایوں گجرات کی ایک مہم میں مشغول تھا کہ اسے یہ اطلاع ملی اور وہ فوراً مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہت کچھ داؤ پیچ کے بعد ۱۵۹۳ء میں بمقام بکسر دونوں فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل خیمہ فگن ہوئیں۔ صلح کی بات چیت ہو رہی تھی کہ افغانوں نے ازراہِ فریب ہمایوں کے لشکر پر

[۱] بحوالہ حشمتہ کوثر از محمد اکرام صاحب آئی سی ایس ص ۴۵۰ [۲] تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۲۷

حملہ کر دیا جس سے اہلِ لشکر میں سخت ابتری پھیل گئی۔ ہمایوں بھی جان بچا کر آگرہ پہنچا اور دوبارہ جنگ کی تیاری میں مشغول ہوگیا۔ ۱۵۴۰ء میں بمقام قنوج مغل اور افغان دونوں میں پھر جنگ ہوئی اور اس مرتبہ ہمایوں کو ایسی شکست ہوئی کہ اسے مع اہل وعیال ایران میں شاہ طہماسپ کے زیرِ دامانِ کرم پناہ لینی پڑی۔ پریشانیوں کے اسی دور میں ۹۴۹ھ مطابق ۱۵۴۲ء بمقام امرکوٹ جلال الدین محمد اکبر حمیدہ بانو بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔

شیر شاہ اور سوری خاندان

قنوج کی جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد شیر شاہ دہلی پہونچا اور اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا۔ شیر شاہ کا نام فرید خاں اور باپ کا نام حسن خاں تھا اور افغانان روہ کی نسل سے تھا۔

فرید خاں کی نشو ونما جون پور میں ہوئی جہاں اس زمانہ میں علما اور فضلا کا ایک بڑا اجتماع تھا۔ اس بنا پر فرید خاں نے بھی یہاں رہ کر اس زمانہ کا متداول درس فارسی یعنی گلستاں، بوستاں، اور سکندر نامہ پڑھا اور پھر کافیہ اس کے حواشی اور دوسری کتابوں کا درس لیا ان کے علاوہ نظم ونثر اور علم تاریخ میں بھی وہ اچھی دستگاہ رکھتا تھا علم وفضل کے علاوہ وہ انتظام وانصرام امورِ مملکت کی بڑی اچھی استعداد رکھتا تھا اسی بنا پر وہ ایک معمولی جاگیر دار کے مرتبہ سے ترقی کر کے دہلی کا بادشاہ بن گیا اور اگرچہ وہ صرف پانچ سال بادشاہت کر سکا یعنی ۱۵۴۰ء سے ۱۵۴۵ء تک اور اس مدت میں بھی اس کو لڑائیوں سے فرصت نہیں ملی تاہم اس نے سلطنت کے انتظام میں متعدد نمایاں اور قابل قدر اصلاحات کیں جن کو بعد میں اکبر نے اور دوسرے مغل بادشاہوں نے اختیار کیا۔ محمد اکرام صاحب آئی سی ایس لکھتے ہیں شیر شاہ نے ملک کو کئی اضلاع میں تقسیم کیا۔ ہر ضلع کے پرگنے مقرر کیے۔ ہر پرگنہ میں ایک فوجی افسر، ایک خزانچی، ایک منصف اور دو محاسب ہوتے تھے جن میں سے ایک فارسی میں حساب رکھتا تھا اور دوسرا ہندی میں۔ تمام زمین کی پیمائش کی گئی اور اس کے مطابق

لہ روہ وہ کوہستانی ممالک ہیں جن کا سلسلہ طول میں سواد و بجور سے لے کر مضافات بکر تک اور عرض میں حسن ابدال سے لے کر کابل تک پھیلا ہوا ہے۔ روہ میں افغانوں کے مختلف فرقے آباد ہیں جن میں سے ایک قبیلہ کا نام سور ہے (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۲۵۰)

نگاں مقرر ہوا ان دنوں موجودہ مال گزاری کا جو سلسلہ انگریزی حکومت نے شروع کر رکھا ہے حقیقتاً شیر شاہ سوری کے اصولوں پر قائم ہے جن کی تدوین اکبر نے کی اور جن میں اکبر کے قابل دیوان خواجہ شاہ منصور نے دہ سالہ بند وبست کا اضافہ کیا۔ زراعت پیشہ لوگوں کی بہبودی کے علاوہ شیر شاہ نے تجارت پر بہت توجہ دی۔ اس نے چنگی اور اس طرح کے کئی محصول جن سے تجارت میں مشکلات پیدا ہوتی تھیں موقوف کر دیے۔ سامانِ تجارت اور مسافروں کی سہولت کے لیے تمام ملک میں سڑکیں بنوائیں۔ ایک سڑک اٹک سے ڈھاکہ تک جاتی تھی۔ دوسری آگرہ سے برہان پور تک۔ تیسری آگرہ سے چتوڑ تک اور چوتھی لاہور سے ملتان تک۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگوائے جابجا سرائیں بنوائیں جن میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ٹھیرنے کا بند وبست تھا۔ اس کے عہد میں ملک میں امن و امان کا اس قدر دور دورہ . . . تھا کہ بقول فرشتہ "مسافر جنگل اور بیابان میں بھی بے کھٹکے اپنا اسباب سرہانے رکھ کر آرام و اطمینان سے رات بھر سوتے تھے"[1] جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے شیر شاہ کا نام فرید خاں تھا۔ بہار میں جب کہ وہ وہاں کے حاکم سلطان محمد خاں کے دربار کا ملازم تھا ایک مرتبہ اس نے شیر کا پیدل شکار کیا اس پر اس کو شیر خاں کا خطاب دیا گیا پھر بعد میں جب وہ ہندوستان کا خود مختار بادشاہ بنا تو اس نے شیر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ ۱۵۴۵ء میں جب کہ وہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے پڑا تھا اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو کر شدید زخمی ہوا مگر اس کے حکم کے مطابق فوج برابر جنگ کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر اس نے قلعہ کی مہم سر ہو جانے کا مژدہ سنا اور دنیا سے چل بسا۔ اب اس کا دوسرا بیٹا اسلام شاہ جو عام طور پر سلیم شاہ کے نام سے معروف ہے تخت نشین ہوا اس نے بڑی حد تک باپ کی روایات کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھا بلکہ انہیں ترقی دی۔ نو سال کی حکومت کے بعد ۹۶۰ھ مطابق ۱۵۵۲ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد سلیم شاہ کا برادر نسبتی مبارز خاں محمد شاہ عادل کے نام سے تخت پر بیٹھا۔ یہ نہایت نالائق اور بد قماش و بد اطوار شخص تھا۔ اس نے سلیم شاہ کی وفات کے تین دن بعد ہی محل شاہی میں گھس کر سلیم شاہ کے کم سن بچے کو جس کا نام

[1] موج کوثر ص ۳۶۰

فیروز خاں تھا اور جو خود اس کا بھانجہ ہوتا تھا، سلطنت کو محفوظ رکھنے کے لالچ میں نہایت بے رحمی اور سفاکی سے قتل کیا بچہ کی ماں ہرچند بھائی کے سامنے گریہ وزاری کرتی رہی مگر اس نابکار پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ طبیعت کا بڑا کمینہ اور عیش و ہوا پرستی کا بندہ تھا۔ چنانچہ فرشتہ کا بیان ہے "اس نے اپنی نا قابلیت کی وجہ سے رذیل، کمینہ طبیعت اشخاص کی دست گیری کی اور سلطنت کے عمدہ عمدہ عہدے ان کے سپرد کیے" اس سلسلہ میں اس نے ایک اچھوت ہندو کو جس کا نام ہیمو تھا اور جو قوم کا بقال اور ریواڑی کا باشندہ تھا کوتوال بازار مقرر کیا جو ترقی کرتے کرتے وزیر اعظم کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ عادل شاہ جسے لوگ عدلی کہنے لگے تھے شب و روز عیش و عشرت میں مشغول رہتا تھا اور ہیمو بقال تمام و کمال امور سلطنت کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ افغان سردار ایک ہیچ ذات ہندو کی سرداری کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے انہوں نے بغاوتیں برپا کر دیں لیکن ہیموان سب کو دبا دینے میں کامیاب رہا۔ لیکن جن دنوں ہیموان بغاوتوں کے فرو کرنے میں مصروف تھا۔ ہمایوں شاہ ایران کی مدد سے کابل کا بادشاہ ہو چکا تھا اور ہندوستان کے حالات سے برابر باخبر رہتا تھا۔ چنانچہ موقع پا کر ۱۵۵۵ء میں اس نے ہندوستان پر فوج کشی کی اور سرہند میں گورنر پنجاب سکندر کو شکستِ فاش دے کر دہلی کی طرف بڑھا اور بغیر کسی مقابلہ کے بارہ برس کے بعد پھر اس پر قابض ہو گیا۔ لیکن تخت نشینی کے چھ مہینہ بعد ہی ۷ ربیع الاول ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۶ء اپنے کتب خانہ پر چڑھا اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر نیچے اترنے لگا ابھی ایک زینہ طے کیا تھا کہ موذن نے اذان دی بادشاہ اذان کے ادب سے وہیں بیٹھ گیا۔ ختم اذان کے بعد لاٹھی کا سہارا لے کر اٹھا لیکن سوءِ اتفاق سے لاٹھی ڈگمگا کر ہاتھ سے چھوٹی اور بادشاہ زینہ پر سے زمین پر آ رہا۔ بہت کچھ علاج معالجہ کیا گیا کوئی فائدہ نہ ہوا آخر ۱۱ ربیع الاول کو جان جان آفریں کے سپرد کر کے عالمِ فانی کو الوداع کہا۔ تاریخ وفات

ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

ہمایوں جرأت و ہمت اور شرافت و اخلاق کا ایک بہترین نمونہ تھا اس کے بھائیوں مرزا ہندال اور مرزا کامران نے ہمیشہ اس کے ساتھ ناانصافی اور ایذا رسانی کا معاملہ کیا۔ لیکن ہمایوں

نے درگزر سے کام لے کر ان کو معاف کر دیا۔ کامران کی چیرہ دستیاں اور شورش پسندی جب حد کو پہنچ گئی اور چغتائی امیروں نے اس کے قتل کا مشورہ دیا تو ہمایوں نے قتل نہیں کیا اور صرف آنکھوں میں سلائی پھروادی۔ ہمایوں کے حالات میں سب سے زیادہ مستند کتاب اس کی بہن گل بدن بیگم کا ہمایوں نامہ ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ طبیعت کا کس درجہ حلیم و بردبار شریف و متواضع اور مستقل مزاج و عالی حوصلہ شخص تھا اس کی دینداری اور مذہبی پابندی کے ثبوت کے لیے یہی واقعہ کچھ کم نہیں ہے جو بظاہر اس کی موت کا سبب ہوا۔ مورخ فرشتہ کا بیان تو یہاں تک ہے کہ ہمایوں بادشاہ ہمیشہ باوضو رہتے تھے اور بلا وضو خدا کا نام کبھی نہیں لیتے تھے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے میر عبدالحی صدر کو عبدل کہہ کر پکارا اور اس کے بعد وضو کر کے ان سے کہا کہ میں گفتگو کے وقت باوضو نہیں تھا اس لیے میں تمہیں تمہارے پورے نام سے نہیں پکار سکا۔ [1]

[1] تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۳۱۱ - ۳۱۲

مغلوں کا عہدِ حکومت

ہمایوں کی ہندوستان پر دوبارہ تخت نشینی کی تاریخ سے یعنی ۱۵۵۵ء سے ہندوستان میں مغلوں کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ خود ہمایوں کو یہاں کچھ زیادہ دنوں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تاہم نبیاد اسی کے ہاتھوں پڑی۔ بعد میں اکبر اور اس کے لائق اتالیق بیرم خاں نے عادل شاہ سوری کے وزیر ہیمو بقال[1] کو شکست دے کر خاندان سور کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح مغل خاندان کو یہاں اطمینان سے پاؤں جما کر حکومت کرنے کا موقع ملا۔

ہمایوں جب ایران سے ہندوستان آیا تو اس کے ساتھ ایرانی علما و فضلا امرا، اور سپاہیوں کا ایک عظیم لشکر تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اب ہندوستان کی اسلامی تہذیب میں ایرانی ثقافت و کلچر اور ایرانی احساسات و رجحانات کو بھی کافی دخل ہو گیا اور دونوں ملکوں میں ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا جس کا ہندوستان کی بعد کی اسلامی تہذیب و تاریخ پر بہت گہرا اور دور رس اثر ہوا۔

جلال الدین محمد اکبر

ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر اپنے اتالیق اور باپ کے وفا پرست رفیق بیرم خاں کے ساتھ پنجاب کی مہم میں مصروف تھا اس وقت اس کی عمر پورے چودہ برس کی بھی نہیں تھی لیکن باپ کے ساتھ یہ گرم و سرد روزگار کا عادی ہو چکا تھا پھر بیرم خاں ایسے قابل و لائق استاد کی تعلیم و تربیت نے اس کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ہندوستان کی بادشاہی کا بجا طور پر حق دار بنا دیا تھا۔ چنانچہ باپ کے انتقال کے بعد یہ تخت پر بیٹھا اور بیرم خاں کو اپنا وزیر اعظم اور سرپرست (   ) مقرر کیا۔ بیرم خاں اکبری عہد میں دو سال تک وزیر اعظم اور ریجنٹ کی حیثیت سے

[1] ہیمو بقال کے ساتھ اکبر کی یہ جنگ پانی پت کے میدان میں ۱۵۵۶ء میں ہوئی تھی۔

سلطنت کی شاندار خدمات انجام دیتا رہا۔ لیکن آخر کار اکبر اور بیرم خاں دونوں کے تعلقات بعض اسباب کی بنا پر کشیدہ ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب کہ بیرم خاں گجرات میں سفر حج پر روانہ ہونے کی تیاریاں مکمل کر رہا تھا کسی افغان نے اس کا کام تمام کر دیا اور اکبر نے ۱۵۶۰ء میں حکومت کا پورا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے کر اعلان عام کر دیا کہ اب صرف اسی کے احکام کی تعمیل کی جائے۔

اکبر نے اس کے بعد بھی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رکھا یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوتے اس کی مملکت مغرب اور شمال میں قندھار اور کابل سے لے کر مشرق میں بنگال اور اڑیسہ تک اور جنوب میں احمد نگر تک پھیل گئی لیکن اس نے . . . . . اپنے پیش رو شاہان دہلی کی طرح صرف صوبوں اور مختلف علاقوں کے فتح کر لینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے ان پر اپنا پورا اقتدار بھی قائم رکھا اور انتظام کی سہولت کے لیے اس کی صورت یہ کی کہ مملکت وسلطنت کو پندرہ صوبوں پر تقسیم کر کے ہر صوبہ کے لیے الگ الگ ایک گورنر مقرر کر دیا جس کے پاس فوجی اور شہری ہر قسم کے اختیارات ہوتے تھے لیکن اپنے طریق کار کے لیے اس کو مرکزی حکومت کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ پھر گورنر کی امداد و اعانت کے لیے ایک دیوان فوجدار اور ایک میر عدل مقرر ہوتا تھا۔ شہر کی پولیس کا افسر اعلیٰ ایک کوتوال ہوتا تھا۔ علاوہ بریں گاؤں کا انتظام خود زمینداروں اور کاشت کاروں کے مشورہ اور رائے سے کیا جاتا تھا۔

مالی انتظامات کے معاملہ میں اکبر نے زیادہ تر شیر شاہ سوری کی پیروی کی تھی ان انتظامات کا افسر اعلیٰ راجہ ٹوڈر مل تھا جس نے تجویز کی تھی کہ قابلِ زراعت زمینوں کی ہر سال پیمائش کی جائے لیکن چونکہ اس میں دشواریاں بہت تھیں اس لیے قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر سال کے بجائے ہر دس سال کے بعد زمین کی پیمائش کی جائے۔ پھر پیداوار کی مقدار کے اعتبار سے زمینوں کے مختلف مدارج مقرر کیے گئے تھے جن کی پوری تفصیل آئین اکبری میں درج ہے۔ بہر حال جہاں تک نظم و نسق مملکت کا تعلق ہے اکبر کا عہد حکومت بہت کامیاب رہا۔ اس کی سلطنت کافی وسیع بھی تھی

اور مختلف قوموں کے باہمی تعلقات بھی بڑے خوش گوار اور شگفتہ تھے۔

اکبر کی مذہبی بدعات اور اسلام کا انحطاط

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف قوموں کے باہمی تعلقات کی یہ خوش گواری اسلامی احکام و مسائل کی بہت کچھ قربانی کے بعد حاصل کی گئی تھی جس سے اسلام کو نقصان عظیم پہنچا۔ اکبر نے ہندو راجپوتوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے یہاں تک کیا کہ خود ہندو عورتوں سے شادی کی اور جہاں گیر کا بیاہ جودھ پور کے راجہ کی پوتی سے رچایا اور ہندوؤں کو بڑے بڑے ذمہ دار اور اعلیٰ عہدے تفویض کیے ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قصر شاہی میں ہندو تہذیب و تمدن کے اثرات غالب ہونے لگے اور بادشاہ کے مذہبی رجحانات بھی کچھ سے کچھ ہو گئے۔ عجیب بات ہے کہ اکبر تخت نشینی کے بیس سال بعد تک تو ایک کٹر مسلمان کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ساتھ اس کی عقیدت و ارادت کا یہ عالم ہے کہ آگرہ سے اجمیر تک پا پیادہ جاتا ہے۔ بچہ ہونے والا ہوتا ہے تو حاملہ بیوی کو برکت حاصل کرنے کے لیے حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کے حجرہ میں بھیج دیتا ہے۔ لباس زعفرانی پہننے پر صدر الصدور سر دربار ٹوکتے ہیں اور اس طرح کہ عصا کا ایک سرا بادشاہ کو مس کر جاتا ہے تو اکبر اسے پی جاتا اور صبر کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ عبادت گذاری کا یہ عالم ہے کہ "عبادت خانہ" کے ایک پرانے حجرہ میں اکیلا بیٹھا ہوا اوراد و وظائف اور مراقبوں اور دعاؤں میں مصروف رہتا ہے لیکن جب اس کی حالت میں انقلاب ہو جاتا ہے تو اب عالم ہی دوسرا نظر آتا ہے۔ محل شاہی میں ہندوانہ رسوم علانیہ اور کھلم کھلا ہو رہی ہیں۔ ہندو بیویوں کے لیے مندر بنائے جا رہے ہیں۔ بادشاہ نے انہیں خوش کرنے کے لیے ملک میں گاؤکشی ممنوع قرار دے دی ہے ہندوؤں کو جزیہ سے معاف کر دیا گیا ہے۔ پھر وہ کبھی آفتاب اور آگ کے سامنے سر عقیدت خم کرتا ہے اور کبھی ستاروں اور حضرت مریم کو بھی لائق پرستش سمجھنے لگتا ہے۔ غرض کہ مذہب کے باب میں وہ چند در چند ایسے باہم مختلف و متضاد رجحانات و عواطف کا مرکب بن جاتا ہے کہ اس پر یہ شعر صادق آنے لگتا ہے۔

کس کی ملت میں گنوں آپکو بتلا اے شیخ　　　تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو

اس انقلاب و تغیر کا باعث جہاں ہندوؤں کے ساتھ عام آزاد معاشرت اور ان کو ہر نوع خوش کرنے کا جذبہ ہے اس کا ایک بڑا سبب علمائے سوء کا دربار میں اجتماع، ان کی آپس کی چپلقش، وجاہت طلبی اور خود غرضی بھی تھی۔ اکبر کو علما اور مختلف مذاہب کے افاضل کے ساتھ گفتگو کرنے اور ان کے مباحثوں میں شریک ہونے کا شروع سے شوق تھا اس مجلس میں ہر مذہب کے علما اپنے مذہب کے محاسن بیان کرتے تھے اور اکبر کی طرف سے ان کو ایسا کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ ایک طرف اکبر ان سے متاثر ہوتا تھا اور دوسری جانب علمائے سوء کے طور طریق نے اس کو اسلام کی طرف سے ہی بددل کر دیا تھا۔ ان سب امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر عملاً ہی گمراہ نہ رہا اس کے اعتقاد میں بھی خلل آگیا اور اس نے یہاں تک ترقی کی کہ "دین الٰہی" کے نام سے ایک مستقل دین ہی ایجاد کر ڈالا اور اہلِ دربار کو مجبور کیا کہ وہ اسے قبول کر لیں۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایک طرف مذہبی اعتبار سے اس کا خبط اس درجہ ترقی پذیر تھا اور دوسری جانب وہ اپنے آپ کو دینی امور میں بھی واجب الاطاعت اور اپنی عقل کو معصوم عن الخطا اور قابلِ اجتہاد سمجھتا تھا اس سلسلہ میں واقعہ یہ ہے اس سے ایسی ایسی مضحکہ انگیز حرکتیں ہوئی ہیں کہ بے ساختہ ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔

ان وجوہ کی بنا پر اکبر کے عہدِ حکومت کا یہ زمانہ جو اس کی موت سے ایک سال قبل تک جاری رہا اسلام اور مسلمانوں کے لیے بڑا نازک وقت تھا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں اپنی دعوتِ تجدید و اصلاح کی . . . پوری قوت و طاقت کے ساتھ نہ اٹھتے تو اسلام اس ملک میں بالکل غریب الوطن ہو گیا تھا اور آج کا ہندوستان صحیح معنی میں ہندوستان ہوتا۔

اکبر کا انتقال | اکبر کی عمر کا آخری حصہ بڑی پریشانیوں میں گذرا جس کی بڑی وجہ اُس کے بیٹوں کا طرزِ عمل تھا۔ ۱۵۹۹ء میں کثرتِ شراب نوشی کے باعث شہزادہ مراد کا انتقال ہوا۔ ۱۶۰۱ء میں سلیم نے اس مذہبی طبقہ کی حمایت حاصل کر کے جو اکبر سے اس کے مذہبی عقائد کے باعث حد درجہ نالاں تھے، علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اکبر نے جلد ہی اس بغاوت پر قابو پا لیا اور پھر سزا دینے کی بجائے اُس کو بنگال اور اڑیسہ کا

گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن شہزادہ سلیم نے اب بھی اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ الہ آباد میں قیام کرکے شب و روز دادِ عیش و طرب دیتا اور باپ کے خلاف منصوبہ بندی کرتا رہتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اُس نے اکبر کے محبوب وزیر ابوالفضل کو قتل کرا دیا جس کی خبر سن کر اکبر کو بے حد رنج ہوا۔ اس واقعہ کے بعد شہزادہ دانیال بھی کثرتِ شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کے باعث دنیا سے چل بسا۔ ان مصائب کے علاوہ محل شاہی سازشوں کا ایک اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ کچھ لوگ مشورہ دیتے تھے کہ شہزادہ سلیم کو محروم کرکے اس کے بیٹے خسرو کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ ان سے تنگ آکر آخر اکبر نے سلیم کو بلایا، راضی کیا اور اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اس واقعہ کے چند مہینوں بعد آگرہ میں سنہ ۱۶۰۵ء مطابق سنہ ۱۰۱۴ھ میں انتقال کیا۔ فوت اکبر شہ، تاریخ وفات ہے۔

جہانگیر | اکبر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلیم تخت پر بیٹھا اور جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اکبر نے مغل بادشاہوں کے عام قاعدہ اور رسم و رواج کے مطابق اُس کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ اُس کے اساتذہ میں مولانا میر کلاں ہروی جو اپنے وقت کے بڑے فاضل اور مشہور عالم تھے سب سے زیادہ نمایاں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جن لوگوں کے سپرد شہزادہ سلیم کی تربیت اور نگرانی تھی وہ مثلاً شہزادہ کے رضاعی باپ شیخ احمد، قطب الدین محمد خاں، عبدالرحیم خان خاناں جو علم و فضل اور شعر و ادب میں یگانۂ روزگار ہونے کے علاوہ عملی کمالات کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب بھی دربارِ اکبری کی نمایاں ترین شخصیتیں ہیں۔ اس حسنِ تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادہ فارسی، ترکی اور ہندی ان تینوں زبانوں کا اور شعر و ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ حسن پرستی اس کی فطرت میں تھی، شعر و ادب نے اس ذوق کو اور نکھار دیا۔ مصوری اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ آبشار اور حسین پھولوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا۔ [۱]

لیکن بہت زیادہ ناز و نعمت میں پرورش پانے اور والدین کا سب سے چہیتا ہونے کے باعث شہزادہ کیریکٹر کے اعتبار سے کوئی مضبوط انسان نہیں تھا وہ کانوں کا کچا، طبیعت کا بہت

History of. Jahangir. by. Beni Prasad. P 20-23 ۱

سادہ اور تلون پسند تھا۔ اسی بنا پر جب دینِ الٰہی اور حد سے زیادہ ہندو نوازی کے باعث اکبر کے خلاف محل شاہی میں اور دربار میں سازشیں ہونی شروع ہوئیں تو وہ بڑی آسانی سے ان کا شکار ہو گئے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر بیٹھا لیکن اکبر کو یقین تھا کہ شہزادہ کا یہ تاثر اور اس کا یہ عمل محض عارضی ہے ورنہ درحقیقت وہ ہندوستان کا ایک کامیاب فرمانروا ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اسی بنا پر اکبر نے شہزادہ کو الٰہ آباد سے بلا کر اپنا جانشین مقرر کیا اور اُسی کے مطابق ۱۶۰۵ء میں تقریباً ۳۵ سال کی عمر میں وہ تخت پر بیٹھا لیکن اب غالباً ذمہ داریوں کے احساس کی وجہ سے اس کے طور وطریق میں اچانک تبدیلی پیدا ہو گئی اس نے نئی اصلاحات اور انتظامی معاملات میں باپ کے نقش قدم پر ہی چلنا پسند کیا چنانچہ اس کا دورِ حکومت اندرونی امن وامان اور واقعی عدل و انصاف کے لیے اس حد تک مشہور ہوا کہ بعض افسانے تک اس سے منسوب کر دیے گئے ہیں البتہ جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ جہانگیر کا ابتدائی دورِ حکومت ایک حد تک دورِ اکبری سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہانگیر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی دعوتِ اصلاح کو برداشت نہ کر سکا اور آپ کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ لیکن آخر کار حضرت مجدد صاحبؒ کی کشش اور آپ کے عزم و اخلاص نے اپنا رنگ دکھایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیر نے آپ کو صرف قید و بند سے رہا ہی نہیں کیا بلکہ شہزادہ خرم کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ محل شاہی میں بلوایا حضرت مجدد صاحب نے موقع غنیمت جان کر پہلی ہی مجلس میں مطالباتِ ذیل پیش کر دیے۔

(۱) بادشاہ کے لیے تعظیمی سجدہ موقوف کیا جائے۔

(۲) گاؤکشی کی عام اجازت دی جائے۔

(۳) بادشاہ اور اعیان وامرا نماز باجماعت کی پابندی کریں۔

(۴) عہدۂ قضا اور احتسابِ شرعی کے محکموں کی تجدید کی جائے۔

(۵) تمام بدعات اور شرعی منکرات کو ختم کیا جائے۔

(۶) غیر شرعی قوانین یک قلم منسوخ کیے جائیں۔

(۷) شکستہ اور منہدم مساجد کی از سرِ نو تعمیر کرائی جائے۔

بادشاہ نے ان کو منظور کیا اور حکم شاہی نافذ ہوا کہ فوراً ان پر عمل کیا جائے۔ اس طرح تقریباً نصف صدی سے اسلام ہندوستان میں حیات و موت کی کشمکش سے دوچار ہو رہا تھا اب اس کو اس سے نجات ملی اور مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

حضرت مجدد صاحب کا ایک یہی کارنامہ نہیں ہے کہ سلطنت کے لادینی ہو جانے کی وجہ سے اسلامی نظامِ حیات اور اسلامی شعائر و ارکان کو جو شدید ترین نقصان پہنچ رہا تھا آپ نے اس کا کامیاب انسداد کیا بلکہ آپ نے یہ بھی کیا کہ ہمایوں کے دوبارہ ہندوستان کے تخت پر متمکن ہونے سے لے کر اب تک ایرانی معتقدات و خیالات کے جو غیر اسلامی اثرات عقائد و افکار میں سرایت کر چکے تھے اور دوسری جانب ہندوانہ تصوف سے لت پت ہو کر جو ایک نئی معجون تیار کر دی تھی حضرت مجدد نے اُن کی بھی اصلاح کی اور اس طرح کی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا [1] چنانچہ آپ کے مکتوبات میں ان تمام چیزوں کا ذکر ملتا ہے اور اُن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آپ کے تجدیدی کارنامے کس درجہ ہمہ گیر اور وسیع تھے۔

---

[1] حضرت مجدد صاحب کا نام نامی شیخ احمد تھا۔ لقب بدر الدین اور کنیت ابو البرکات، امام ربانی عرف، ۹۷۱ھ مطابق ۱۵۶۴ء کو بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ عبد الاحد تھا، جو حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ کے مرید اور خود ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ حضرت مجدد نے پہلے اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی۔ پھر سیالکوٹ جا کر مولانا کمال کشمیری سے معقولات کی اور مولانا یعقوب کشمیری سے حدیث کی کتابیں پڑھیں: سترہ برس کی عمر میں علومِ عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو کر درس دینا شروع کیا۔ علومِ ظاہری کے علاوہ آپ نے والد صاحب سے علومِ باطنیہ کا بھی باقاعدہ درس لیا اور ان سے خرقۂ خلافت چشتیہ (جو انہیں شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ سے ملا تھا) حاصل کر کے طریقت و سلوک میں ان کے جانشین ہوئے بعد میں ۱۰۰۸ھ میں حضرت خواجہ محمد باقی باللہؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ ۱۰۳۴ھ میں وفات پائی۔ سرہند میں آپ کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

جہانگیر کے عہد کا ایک بڑا اہم واقعہ جس کا ہندوستان کی تاریخِ مابعد سے بہت گہرا اور دوررس تعلق ہے یہ ہے کہ اسی عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد پڑی۔ اس کی مختصر روئداد یہ ہے کہ ۱۶۱۵ء میں انگلینڈ کے بادشاہ جیمس اول کی طرف سے سر تھامس راڈ حکومتِ افرنگ کی طرف سے دربارِ جہانگیری میں سفیر کی حیثیت سے ہندوستان آیا اور اس نے اس درجہ تقرب حاصل کرلیا کہ جب جہانگیر گجرات گیا ہے تو دوسرے بڑے بڑے اہلِ دربار کے ساتھ یہ بھی تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد انگلینڈ میں ۱۶۰۰ء میں پڑی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان تجارتی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور مضبوط کیا جائے۔ شروع شروع میں کمپنی کو پرتگالیوں کی وجہ سے جو تجارت میں انگریزوں کے حریف تھے بڑی دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ کئی مرتبہ نوبت جنگ کی بھی آئی۔ لیکن آخرکار انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور انہوں نے پرتگالیوں کو بری طرح شکست دے کر مار بھگایا، انگریزوں کی اس جیت سے ہندوستانیوں اور خود بادشاہ کی نظر میں ان کا وقار دوچند ہوگیا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جہانگیر نے اپنے ایک فرمان مورخہ ۱۱ جنوری ۱۶۱۳ء کے رو سے کمپنی کو اس کی اجازت دیدی کہ وہ سورت، احمد آباد اور کمبے میں اپنے لیے تجارتی مرکز بنائے۔ دو سال بعد پرتگالیوں نے پھر کوشش کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی ان کو شکستِ فاش ہوئی۔ اور اب وہ ہندوستان سے بالکل مایوس ہوگئے۔ انگریزوں اور پرتگالیوں کی ان لڑائیوں سے کمپنی کو تجارتی اعتبار سے کافی نقصان پہونچا تھا لیکن سر تھامس راڈ نے اپنی دانشمندی اور ہوشیاری سے جلد ہی کمپنی کو از سرِ نو منظم کرکے اسے مضبوط بنیادوں پر قائم کردیا اور دربار میں اپنے غیر معمولی اثر و رسوخ کے باعث وہ کمپنی کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا چنانچہ جہانگیر کی وفات سے پہلے ہی ان لوگوں کو مغل سلطنت کے تمام علاقوں میں تجارت کرنے کی آزادی مل گئی تھی غرض یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اس طرح ہندوستان میں پاؤں جمانا ہی بعد میں انگریزوں کے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پیش خیمہ بنا۔

انتقال | ۱۶۲۷ء میں صحت کی خرابی کے باعث جہانگیر نے نورجہاں، آصف خاں، شہریار اور داور بخش کے ہمراہ کشمیر کا سفر کیا لیکن دمہ کا عارضہ اس جنت ارضی میں پہونچ کر بھی افاقہ پذیر نہیں ہوا۔ علاوہ بریں شہریار بھی یہاں داء الثعلب میں گرفتار ہو گیا۔ اس بنا پر جہانگیر نے اطبار کے مشورہ کے مطابق لاہور کا ارادہ کیا اثنائے سفر میں ایک مقام پر باوجود علالت اور کمزوری کے شکار کھیل رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک سپاہی بدقسمتی سے ایک پہاڑ کی چوٹی پر سے گرا اور مر گیا۔ بادشاہ پر اس واقعہ کا بہت شدید اثر ہوا جس سے اس کا مرض اور بڑھ گیا۔ آخر ۲۷ صفر المظفر ۱۰۳۷ھ مطابق اکتوبر ۱۶۲۷ء کو بوقت صبح وفات پائی اور لاہور میں رسم تدفین انجام دی گئی۔ جہانگیر کی کل مدت عمر ۵۸ سال اور سلطنت کی مدت ۲۲ سال ہے۔

شاہجہاں | جہانگیر کی وفات کے وقت شہزادہ خرم جو بعد میں شاہجہاں کے لقب سے بادشاہ ہوا، ایک باغی کی حیثیت سے دکن میں تھا اب باپ کے انتقال کی خبر سنتے ہی وہ اور مہابت خاں دونوں فوراً آگرہ روانہ ہوئے ادھر شہزادہ شہریار نورجہاں کی تائید سے حوصلہ یاب ہو کر اس کوشش میں تھا کہ تخت پر قابض ہو جائے۔ لیکن خوش قسمتی سے دربار میں آصف خاں وزیر اعظم شہزادہ خرم کا زبردست حامی تھا اور کیوں نہ ہوتا آخر ممتاز محل، شہزادہ خرم کی عزیز ترین بیوی آصف خاں کی ہی تو بیٹی تھی۔ چنانچہ شہزادہ خرم کے دارالسلطنت پہونچنے سے قبل ہی آصف خاں نے ایک لشکر جمع کر کے شہریار پر حملہ کیا اور اسے گرفتار کر لیا شہزادہ خرم کے راستے میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی وہ آگرہ پہونچتے ہی تخت پر بیٹھا اور شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے حکومت کرنے لگا۔ تخت نشینی کے بعد پہلا کارنامہ یہ کیا کہ شہریار اور اپنے دو بھتیجوں کو احتیاط کے خیال سے قتل کرا دیا۔ شاہجہاں کی مدت حکومت ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک یعنی تقریباً ۳۱ سال ہے۔ اس مدت میں سلطنت

خوب پھلی اور پھولی۔ دکن کی جو ریاستیں سرکش ہوگئی تھیں وہ بھی آخر کار مطیع و فرماں بردار ہو کر باج گزار ہوگئیں اور عہد شاہجہانی کے مشہور وزیر سعد اللہ خاں کی دور اندیشی اور راست بینی اور اکبر کی مالی اصلاحات کو نافذ کرنے کے باعث ملک اقتصادی اعتبار سے بھی بڑا خوش حال ہو گیا۔

شاہجہاں فنونِ لطیفہ کا بڑا لطیف ذوق رکھتا تھا اس کی جو عمارتیں دہلی اور آگرہ میں پائی جاتی ہیں وہ اس کے خاص مذاقِ تعمیر کی آئینہ دار ہیں ان عمارتوں کا اکبر اور جہانگیر کی عمارتوں سے موازنہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں اسلامی عقائد و افکار پر جو ہندوانہ اثرات غالب آ گئے تھے اس عہد کی اسلامی عمارتوں میں بھی وہ اثرات بین طور پر نظر آتے ہیں۔ پھر چونکہ جہانگیر کے دورِ آخر سے وہ اثرات زائل ہونا شروع ہو گئے تھے اس بنا پر شاہجہاں کی عمارتوں میں ان کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ شاہجہاں کا عہدِ حکومت داخلی اور خارجی امن و امان اور عام رفاہیت و خوش حالی کے لیے مشہور ہے۔ لیکن خود بادشاہ کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں صبر آزما مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ جس نے اس کی پرسکون زندگی کا لطف و آرام بالکل خاکستر کر دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے چار بیٹوں میں جن کے نام یہ ہیں داراشکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد ان میں باہم تختِ سلطنت حاصل کرنے کے لیے رقابت رہتی تھی۔ باپ کو اس کا علم ہوا تو اس نے پیش بندی کے طور پر داراشکوہ کو کابل اور ملتان کا گورنر مقرر کر دیا، شجاع کو بنگال بھیج دیا، اورنگ زیب کو دکن اور مراد کو گجرات کی حکومت تفویض کر دی۔ اس طرح چاروں کو الگ الگ صوبے دے کر فتنہ کا سدِّباب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس تدبیر کا اثر الٹا ہوا کیونکہ شہزادوں کو اس طرح اپنے منصوبے پھیلانے اور ان کے لیے فوجی طاقت و قوت فراہم کرنے کا موقع مل گیا۔

ان شہزادوں میں داراشکوہ سب سے بڑا تھا اور اخلاق و عادات اور رجحانات و افکار کے اعتبار سے اور بھائیوں سے الگ بھی تھا اس کا میلان ہندوانہ تصوف اور ہندو مذہب و کلچر کی طرف زیادہ تھا اس بنا پر دربار شاہی کے مسلمان اعیان و امرا اس کو بری نگاہ سے دیکھتے

شجاع ہوشیار اور فیاض تھا لیکن کثرتِ شراب نوشی نے اس کی صحت کو برباد کر دیا تھا۔ اورنگ زیب نہایت راسخ العقیدہ اور زبردست مسلمان تھا اور مسلمان امرا عام طور پر اس کو پسند کرتے تھے۔ اب رہا شہزادہ مراد تو وہ لیاقت و قابلیت میں سب بھائیوں سے کمتر تھا۔

۱۶۵۷ء میں شاہجہاں سخت بیمار ہوا اور ایک عام افواہ پھیل گئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کو سنتے ہی چاروں شہزادوں میں تخت حاصل کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ چنانچہ شجاع بنگال سے روانہ ہوا اور بہانہ یہ کیا کہ داراشکوہ نے (جو دارالسلطنت میں موجود تھا) بادشاہ کو زہر دے کر مارا ہے اس لیے وہ اس کا انتقام لینے جا رہا ہے۔ مراد گجرات میں تھا اس نے وہیں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ داراشکوہ نے یہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے فرزند سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کے زیرِ قیادت ایک لشکر شجاع سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ بنارس کے قریب جنگ ہوئی جس میں شجاع پسپا ہو کر بنگال لوٹ گیا۔ اورنگ زیب نے مراد کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا اس لیے یہ دونوں فوجیں اب شمال کی طرف روانہ ہوئیں۔ ادھر سے خود داراشکوہ ایک عظیم لشکر لیے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ سام گڑھ یا فتح گڑھ میں جنگ ہوئی۔ دارا شکست کھا کر بھاگا اور اب اورنگ زیب اور مراد دونوں دارالسلطنت کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ کے انتقال کی خبر غلط تھی وہ مرض سے صحت یاب ہو کر افاقہ پا رہا ہے۔ بادشاہت کا نظام اس مدت میں درہم برہم ہو چکا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اگر اس وقت سلطنت پر قبضہ نہیں کیا گیا تو بادشاہ کا جانشین یقیناً داراشکوہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عمر میں سب بھائیوں سے بڑا تھا اور اس کے علاوہ خود بادشاہ کی نظرِ التفات بھی سب سے زیادہ اسی کی طرف تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر داراشکوہ کو تخت پر قابض ہونے کا موقع مل جاتا تو عہدِ اکبری کی لادینیت دوبارہ زندہ ہو جاتی اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کا حشر کیا ہوتا۔ اس

بنا پر اورنگ زیب نے اس وقت اپنی موجودہ فوجی طاقت و قوت سے فائدہ اٹھا کر حکومت پر قبضہ کر لینا چاہا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ بادشاہ کو اسی کے محل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس طرح جون ۱۶۵۸ء میں شاہجہاں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ اس واقعہ کے آٹھ برس بعد تک بھی وہ زندہ رہا لیکن یہ کل مدت نظر بندی میں ہی گذری۔ غور کرو تاریخ بھی کس انداز سے اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اکبر اعظم کے خلاف اس کے بیٹے جہانگیر نے بغاوت کی۔ پھر خود جہانگیر کے خلاف اس کے فرزند شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے علمِ بغاوت بلند کیا اس کا خمیازہ خود شاہجہاں کو اس طرح بھگتنا پڑا کہ اس کے بیٹے عالمگیر نے اس کا تخت چھین کر اسے نظر بند کر دیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَارُ۔ اس کے بعد ایک بہانہ سے شہزادہ مراد کو گرفتار کر کے گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ شجاع نے جنگ کی لیکن ناکام ہو کر بنگال بھاگا اور وہاں سے بھی آخر کار فرار ہو کر شاہ اراکان کے پاس مدد لینے کے لیے گیا۔ لیکن وہاں اس کے پاس جو تھوڑی بہت دولت تھی وہ بھی لوٹ لی گئی۔ مجبور ہو کر پہاڑوں کی طرف بھاگا اور وہیں کہیں مر کھپ گیا۔ داراشکوہ نے بھی ایک فوج جمع کر کے اجمیر میں اورنگ زیب کی فوج سے جنگ کی لیکن شکستِ فاش کھا کر بھاگا اور آخر ایک افغان حاکم نے جس کے ہاں اس نے قدیم دوستی کی بنا پر پناہ لی تھی دھوکہ سے اس کو عالمگیر کے سپرد کر دیا۔ عالمگیر نے اس کو الحاد و زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ عالمگیر نے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کے ساتھ ہی یہ معاملہ نہیں کیا کہ کسی کو قتل کرایا اور کسی کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا بلکہ خود اس کا بیٹا سلطان محمود جس کی مدد سے ہی اورنگ زیب شاہجہاں کو زیر حراست لینے میں کامیاب ہوا تھا وہ بھی اپنے باپ کا نافرمان اور باغی ثابت ہوا اور وہ بھی اپنے چچا اور چچا زاد بھائیوں کے ساتھ اورنگ زیب کے حکم سے گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا گیا جہاں سے اس کو تادم آخر رہائی حاصل نہیں ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر از ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء

اس طرح اورنگ زیب نے ہر طرف سے مطمئن اور بے خوف ہو کر ۱۶۵۸ء میں اپنے شہنشاہِ ہند ہونے کا اعلان کر دیا لعد عالمگیر کا

لقب اختیار کیا۔ عالمگیر کا نام محی الدین محمد اورنگ زیب تھا ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء کو بمقام دوحد پیدا ہوا۔ جب کہ جہانگیر شاہجہاں، ممتاز محل وغیرہا کو ساتھ لیے ہوئے گجرات سے واپس لوٹ رہا تھا۔ اورنگ زیب کو اپنے مقامِ پیدائش سے اتنی محبت اور اس کا اس حد تک خیال تھا کہ اپنے فرزند محمد اعظم کو ایک خط میں لکھتا ہے "دوحد جو صوبہ گجرات میں واقع ہے مجھ گنہ گار کا مسقط الراس ہے تم اس کے رہنے والوں کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرنا"

(رقعات عالمگیری ص ۳)

شاہجہاں نے بزمانۂ شہزادگی اپنی باغیانہ کوششوں میں ناکام ہو کر جب باپ کی اطاعت قبول کر لی تو اسے اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو اس کے پاس بطور یرغمال رکھنا پڑا۔ چنانچہ یہ دونوں شہزادے جون ۱۶۲۶ء میں جہانگیر کے دربار میں بمقام لاہور پہنچے اور نور جہاں کی نگرانی میں رکھ دیے گئے۔ اتفاق سے تھوڑے دنوں بعد ہی یعنی ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کا انتقال ہو گیا اور اب شہزادہ خرم شاہجہاں کے لقب سے سریر آرائے سلطنت ہوا تو ان دونوں شہزادوں کو بھی نجات ملی اور یہ ماں باپ سے آکر مل گئے۔ سرجادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ یرغمال ہونے کے بعد دونوں شہزادوں کی والدین سے پہلی ملاقات آصف خاں کی نگرانی میں بمقام آگرہ ۲۶ فروری ۱۶۲۸ء میں ہوئی تو اس وقت کا نظارہ بڑا دلآویز تھا۔ ماں (ممتاز محل نے اپنے بچھڑے ہوئے بچوں کو فرطِ شوق و بیساختگی میں سینہ سے چمٹا لیا اور دیر تک پیار کرتی رہی۔

تعلیم اب اورنگ زیب کی عمر دس برس کی ہو چکی تھی شاہجہاں نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ سعد اللہ خاں جو عہد شاہجہانی کا نامور وزیر ہے۔ اور حکیم محمد ہاشم گیلانی جو اس زمانہ کے نامور فاضل اور بعد میں احمد آباد کے صدر الصدور بنا دیے گئے تھے اورنگ زیب کے اساتذہ میں ان دونوں بزرگوں کا نام خاص طور پر لائق ذکر ہے۔ اورنگ زیب فطرتاً نہایت ذہین اور ذکی تھا۔ اس نے ان فاضل روزگار اساتذہ کی نگرانی میں بہت جلد مختلف علوم و فنون میں اچھی دستگاہ پیدا کر لی، اورنگ زیب کے خطوط اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن و حدیث میں اس کی نظر وسیع

اور مطالعہ عمیق تھا چنانچہ جا بجا قرآن مجید کی آیات اور احادیث کے ٹکڑے نقل کرتا چلا جاتا ہے۔ سر جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے "اورنگ زیب عربی اور فارسی ایک فاضل اور محقق کی طرح بولتا اور لکھتا تھا"[۱]

علاوہ بریں وہ ہندی زبان سے بھی واقف تھا اور اس زبان کی مشہور مشہور کہاوتیں اپنی گفتگو میں نقل کرتا تھا بلخ اور قندھار میں قیام کرنے کے باعث چغتائی ترکی بھی سیکھ لی تھی اور اس میں گفتگو کر سکتا تھا۔ خطِ نسخ اس کا اس قدر عمدہ اور پاکیزہ تھا کہ ایک صاحبِ فن کاتب کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ زمانۂ شہزادگی میں اور اس کے بعد بھی اس نے اجر و ثواب حاصل کرنے کی نیت سے قرآنِ پاک کے کئی نسخے لکھے اور ان کو حرمین شریفین میں بطور نذرانہ بھیج دیا۔ دو ایک نسخے ہندستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مغل خاندان کی بعض خواتین کی طرح اورنگ زیب قرآن مجید کا بھی حافظ تھا۔

مطالعہ کا اسے فطری ذوق تھا۔ زیادہ تر قرآن مجید کی تفسیر، حدیث، فقہ اور صوفیائے کرام کے ملفوظات و مکتوبات کا مطالعہ کرتا تھا۔ عام طور پر اورنگ زیب کو شعر و ادب کے ذوق سے محروم خیال کیا جاتا ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اسے شیخ سعدی اور خواجہ حافظ شیرازی کا کلام بہت مرغوب تھا۔ اس کی تحریر نہایت جامع موثر اور پرمغز و مدلل ہوتی تھی اس دینی اور علمی ذوق نے اس کو فقرا اور خصوصاً علماء و فقہاء کی صحبت کا بہت گرویدہ بنا دیا تھا اور اس کا اثر یہ تھا کہ مزاج میں تقشف اور طبیعت میں فقیہانہ عبوست پیدا ہو گئی تھی اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اکبر کے دور کی لادینی کے جو بعض اثرات اب بھی باقی رہ گئے تھے عالمگیر کی تشدد پسندی نے ان کا بالکل خاتمہ کر دیا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس غیر معمولی تشدد کے باعث سلطنت کو بعض ناقابلِ تلافی نقصانات بھی پہونچے جن کا ہم آگے چل کر ذکر کریں گے۔

محمد ساقی مستعد خان کا بیان ہے "حضرت خلد مکان (عالمگیر) اپنی فطری سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی معاملات کے بے حد پابند تھے۔ حنفی المذہب سنی تھے۔ اسلامی فرائضِ خمسہ کی سخت پابندی کرتے تھے ہمیشہ باوضو رہتے اور کلمۂ طیبہ اور دیگر اوراد و وظائف کا ورد ہر وقت کرتے

رہتے تھے نماز باجماعت اول وقت میں ادا فرماتے اور تمام سنن و نوافل تک کو ادا کرتے تھے ایام بیض کے روزوں کے بڑے پابند تھے اور ہفتہ میں دو شنبہ پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے تھے۔ نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا فرماتے۔ مقدس شبہائے اسلامی میں رتجگا کر کے عبادت میں مشغول و مصروف رہتے نماز کی پابندی کے علاوہ زکوٰۃ شرعی ادا کرنے کا بھی ایسا ہی اہتمام ہوتا تھا۔ ذاتی اخراجات کے لیے جو چند مواضعات مخصوص کر لیے گئے تھے ان کی زکوٰۃ خود دیتے اور اولاد کو بھی خاص طور پر تاکید ہوتی تھی کہ زکوٰۃ پوری پابندی اور اہتمام کے ساتھ ادا کریں۔ ماہ صیام میں عبادت اور اوراد و وظائف میں اور زیادہ شدت ہو جاتی تھی۔ آخر عشرہ میں اعتکاف بھی کرتے تھے۔

عدل و انصاف عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ ہر روز دو یا تین مرتبہ منظر عام پر کھڑے ہو کر اپنی زیارت کراتے اور کسی رکاوٹ کے بغیر ہر دادخواہ کو اس کا موقع دیتے تھے کہ وہ اپنے واقعات بیان کرے۔ اس سلسلہ میں بعض دادخواہ لاعلمی یا بیوقوفی کی بنا پر کچھ ایسے الفاظ بھی بول جاتے تھے جو آداب شاہی کے بالکل منافی ہوتے تھے لیکن بادشاہ کو ان پر کچھ گرانی بھی نہیں ہوتی تھی۔ عالمگیر پر عام اعتراض ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ اس کا معاملہ بہت سخت اور ناروا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اس اعتراض کے نہایت معقول اور مدلل جواب دیے ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالمگیر ایک انسان تھا فرشتہ معصوم نہ تھا۔ بے شبہ اس سے بعض مواقع پر ناجائز تشدد اور ناروا سختی کے معاملات کا صدور بھی ہوا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عالمگیر کو کسی ہندو سے محض اس کے ہندو ہونے کی بنا پر پرخاش تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو ہندو مفسد، فتنہ پرداز اور شورش انگیز تھے عالمگیر نے ان کو قرار واقعی سزا دینے میں نرمی نہیں برتی ورنہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ عالمگیر کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فائز ہوتے تھے اور دربار شاہی کی طرف سے مندروں کے لیے جاگیریں تک وقف ہوتی تھیں۔

اصلاحات اورنگ زیب عالمگیر کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ملک کو سیاسی اعتبار سے

محفوظ و مامون رکھنے اور اس کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کی اخلاقی اور اجتماعی حالت کو بہتر بنانے کی بھی کوشش کی، عہدِ عالمگیری سے قبل عام لوگوں کی حالت یہ تھی کہ توہمات وخرافات میں گرفتار تھے، شراب نوشی عام تھی۔ قمار بازی اور خلاف شرع رسوم وآئین کا عام چرچا تھا عالمگیر نے ان سب چیزوں کا انسداد کیا، شراب نوشی بالکل ممنوع قرار دیدی گئی، قمار بازی کا سدباب کیا گیا۔ بازاری عورتوں کو حکم تھا کہ یا ملک چھوڑ دیں اور اگر رہیں تو نکاح کر کے رہیں ان احکام کی تعمیل کرانے کے لیے باقاعدہ محتسب مقرر تھے ۱۶۶۴ء میں اس نے ستی کی مذموم رسم کو ممنوع قرار دیا اور بچوں کو غلام یا خواجہ سرا کے طور پر فروخت کرنے کے خلاف احکام جاری کیے۔ تیر تہوار اور درباری جشن وغیرہ کے موقعوں پر جو حد سے زیادہ فضول خرچی ہوتی تھی اسے ترک کیا گیا۔ علاوہ بریں بہت سے ٹیکس جو شرعی طور پر ناجائز تھے ان کو موقوف کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں تقریباً اسی ٹیکس معاف کیے گئے۔ محمد ساقی خاں کا بیان ہے "محاصل راہ داری و کروڑ گیری کی جملہ رقم مبلغ تیس لاکھ روپے رعایا کے لیے معاف کی گئی۔

علماء کی قدر دانی | علما اور بزرگوں کی حد درجہ قدر دانی کرتا تھا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع اسلام کے اصولوں پر قائم کیا تھا اور اس ہی بنا پر تمام نامور علماء کو جمع کر کے فتاوی عالمگیری کے نام سے ایک ضخیم کتاب فقہ حنفی میں مرتب کرائی تاکہ اسلامی قوانین یکجا مرتب و منظم ہو جائیں اور ان کی روشنی میں محکمۂ قضا کو فیصلے کرنے میں سہولت ہو۔ صاحب مآثر عالمگیری کا بیان ہے "اس کتاب کی تیاری میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے" (مآثر عالمگیری اردو ترجمہ ص ۳۸۷)

شجاعت | جو لوگ عبادت اور اوراد و وظائف کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ میدان شجاعت و بہادری کے مرد نہیں ہوتے لیکن عالمگیر کی شخصیت جامع الصفات تھی، قدرت نے اس میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور اچھائیاں جمع کر دی تھیں۔ بایں ہمہ علم و فضل و زہد و ورع اس کی شجاعت اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ جب کہ بلخ میں عبد العزیز خاں کے بالمقابل وہ صف آرا تھا اور غنیم کی فوج نے مور و ملخ کی طرح ہر طرف سے اسے گھیر رکھا تھا، نماز کا وقت آگیا۔

عالمگیر نے نماز ادا کرنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے منع کیا لیکن اس نے بالکل پروانہ کی اور سواری سے نیچے اتر کر فرض و سنت اور نوافل کامل اطمینان کے ساتھ میدان جنگ میں ہی ادا کیے۔ عبدالعزیز خاں والیِ بخارا کو اس کا علم ہوا تو حیران رہ گیا اور بولا "ایسے شخص سے جنگ کرنا اپنے تئیں تعرِ ہلاکت میں ڈالنا ہے" (مآثر عالمگیری ص ۳۸۸)

عالمگیر کی حکومت کا زمانہ نصف صدی سے زیادہ ہے اس مدت میں اس نے وہ کارہائے نمایاں کر دکھائے جو مغلیہ خاندان کے کسی بادشاہ سے نہ ہو سکے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی مدتِ حکومت کا ایک بڑا حصہ لڑائیوں اور پریشانیوں میں ہی گذرا۔ مرہٹوں اور راجپوتوں نے بار بار بغاوت کی اورنگ زیب عالمگیر نے ہر مرتبہ ان کو کامیابی سے دبا دیا۔ جنوبی ہند کی لڑائیاں بہت عرصہ تک چلتی رہیں اور ان کی وجہ سے خزانۂ شاہی پر بڑا بار بھی پڑا۔ لیکن بہرحال اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ عالمگیر اب ایک ایسی وسیع سلطنت کا مالک تھا جس کا جنوبی سرا تنجور تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن یہ امر بڑا حیرت انگیز ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود عالمگیر کے دورِ آخر سے ہی مغل سلطنت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عالمگیر اپنے ارادوں میں اس درجہ مستحکم اور اپنی دھن کا ایسا پکا تھا کہ وہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر کام کرتا تھا۔ وہ کٹر قسم کا سُنی اور طبعًا متشدد تھا اس میں شک نہیں کہ اس کی ان صفات نے اسلامی شعائر و آداب کا مرتبہ بہت اونچا کر دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے زمانوں میں ملک میں جو رندکوشی اور عشرت پسندی و آزاد خیالی پیدا ہو چکی تھی اس کو اچانک زہد و تقشف اور خشک مزاجی میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ہندو عالمگیر کو اپنا شدید دشمن سمجھتے تھے اور دوسری جانب خود مسلمان بھی اس سے کھٹکتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ عالمگیر ایک خالص مُلّا ہو گیا ہے اور اس بنا پر وہ بادشاہت کرنے کا اہل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہے کہ اورنگ زیب سب سے زیادہ علما اور فقہا پر اعتماد کرتا تھا اور بدقسمتی سے اس وقت جو علما مسلمانوں کی زندگی میں زیادہ دخیل اور

باا ثر تھے وہ بالکل ظاہر پرست قسم کے علماء تھے انہیں اس کا بالکل احساس نہ تھا کہ اسلام جب عالمگیر مذہب ہے اور ہر قوم اور ہر ملک کے لیے یکساں طور پر پیام امن وراحت ہے تو اب حاکم ہونے کے باوجود مسلمانوں کا رویہ دوسری قوموں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے ؟ ملاطفت و نرمی کا یا درشتی اور سختی کا ؟ مآثر عالمگیری کا مصنف بڑے فخر سے لکھتا ہے "غیر مسلم افراد حتی الوسع عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز نہیں کیے جاتے تھے اور تمام ممالکِ محروسہ میں غیر اسلامی معابد اور پرستش گاہوں کا ایسا خاتمہ ہوا اور ان کی جگہ اس قدر کثرت سے مساجد تعمیر کرائی گئیں کہ ان کے شمار و اعداد کے قبول کرنے سے عقل حیران رہ جاتی ہے" پھر یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے "حضرت کے عہد میں غیر مسلم رعایا پر جزیہ مقرر کیا گیا اور یہ حضرت کا وہ مذہبی کارنامہ ہے جو آپ سے پہلے کسی اسلامی فرمانروا سے انجام کو نہیں پہونچا" (ص ۳۰۵) سچ تو یہ ہے کہ مآثر عالمگیری کا مصنف جس کارنامہ کو عالمگیر کے لیے قابل فخر قرار دیتا ہے وہی قابلِ استحسان نہیں ہے۔ کیونکہ کسی مسلمان فرمانروا کے لیے از روئے شرع یہ جائز نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کا پہلے سے بنا ہوا عبادت خانہ منہدم کرائے۔

عالمگیر جب خالص مذہبی جذبہ سے یہ سب کام کرتا تھا اور علماء و فقہاء سے ہر معاملہ میں مشورہ بھی لیتا تھا تو اب علما کا فرض تھا کہ ان معاملات میں وہ اسلام کی اصل تعلیمات کو سامنے لاتے اور عالمگیر کے فکر و عمل میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے لیکن اس عہد میں تعلیمی زبوں حالی کی وجہ سے جس قسم کے علما پیدا ہو رہے تھے اس کا اندازہ آپ کو اقتباسِ ذیل سے ہوگا ، برنیر لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد ایک مرتبہ اس کا ایک استاد عالم کسی منصب کی آرزو میں اس کے پاس آیا تو اورنگ زیب نے تخلیہ میں بلا کر اس کے سامنے ایک طویل تقریر کی اور کہا۔

"ملاجی ! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے اول درجہ کے امرا میں داخل کر لوں ؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا اگر آپ مجھے

کوئی کام کی تعلیم دیتے لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا۔ پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا اور اب شاہ انگلستان ہے۔ فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کی نسبت آپ نے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہانِ ہندوستان ان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں۔ ان ہی میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہوئے ہیں جو شاہانِ عظیم فاتحانِ جہاں اور بادشاہان عالم ہیں۔ آپ نے مجھے بتایا کہ ایران، کاشغر، تاتار، پیگو، سیام اور چین شاہ ہند کا نام سُن کر کانپتے ہیں۔ سبحان اللہ! آپ کے علم جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا؟ کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کرتے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے؟ یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں؟ ان کے رسم و رواج اور مذہب و حکومت کے طریقے کیسے ہیں؟ ان کی سیاسی پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی و تنزل کے اسباب بتاتے۔ ان واقعات، حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں خیر دنیا کی تاریخ سے تو پورے طور پر آگاہ کرنا در کنار، آپ نے مجھ کو میرے آبا و اجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔ آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لیے کونسے مضامین درکار ہیں۔ یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف و نحو کی بڑی مہارت ہونی چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کو سیکھنے کی خشک، بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔ آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے، یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے

دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار
سے کوئی تعلق نہیں۔ بے شک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دل پسند
لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیے۔ جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم و
فن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں
استعمال کر سکتا تھا جن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں
اور جن سے فلسفہ کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں۔
اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے
اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں پڑھاتے جن سے
روح کو عظمت حاصل ہوتی ہے یا وہ اصول بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے
مقابلہ میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کر سکتے ہیں
اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔ یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت
کے رموز سے واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے
نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندرِ اعظم پر ارسطو
کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا"

(منقول از رودِ کوثر مصنفہ جناب محمد اکرام صاحب آئی سی ایس۔ ص ۲۸۶-۲۸۸)

یہ اقتباس طویل ضرور ہو گیا ہے لیکن آپ کو اس کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ عالمگیر نے
اب سے ڈھائی سو برس پہلے اربابِ مدارس کی نسبت جو الفاظ اور اس زمانہ کے مروجہ نصابِ
تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے بارے میں جو تنقیدی کلمات کہے تھے وہ آج بھی کس طرح حرف بحرف صادق
آرہے ہیں۔ عالمگیر کی اس تقریر سے اس کی دقت شناسی اور حقیقت بینی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن افسوس
تو اسی بات کا ہے کہ یہ سب جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ اسی قسم کے علماء کا آلۂ کار بنا رہا اور اس کی وجہ
سے حکومت کو استحکام نصیب نہ ہو سکا۔

عالمگیر کی اس ذاتی کمزوری کے علاوہ مغل حکومت کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں اخلاقی اعتبار سے مسلمانوں کی سوسائٹی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی، بڑے بڑے اعیان و امرا کا حال یہ تھا کہ وہ آج زید کے ساتھ ہیں، کل ان کو عمرو کی طرف سے روپیہ زیادہ ملا تو اس کی طرف ہو گئے۔ مخلصانہ جاں نثاری، وفا شعاری، دیانت اور امانت کا نام و نشان نہ رہا تھا، حد یہ ہے کہ مغل شاہزادے اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ چنانچہ شاہزادہ کام بخش ایک جنگ کے موقع پر اپنے باپ کے خلاف سازش کر کے مرہٹوں سے ملنے والا ہی تھا کہ عالمگیری فوج کے ایک امیر ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتہ لگ گیا اور انہوں نے شہزادے کو گرفتار کر کے اورنگ زیب کے پاس بھیج دیا۔ اسی طرح ستارہ میں مرہٹوں نے شاہزادہ محمد اعظم کو رشوت دے کر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسد رسانی میں مخل نہیں ہوگا، چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرہ کے وقت دو ماہ کی رسد تھی چھ ماہ تک فتح نہیں ہو سکا عالمگیر کو ان تمام واقعات کا علم اور احساس تھا۔ چنانچہ اس نے متعدد خطوط میں امانت دار اور متدین لوگوں کے نہ ملنے کا افسوس کیا ہے۔ ایک جگہ رقمطراز ہے "آدم ہوشیار، امانت دار، خدا ترس، آبادان کار کمیاب۔

آنچہ بر جستیم وکم دیدیم وبسیار ست و نیست

نیست جز آدم دریں عالم کہ بسیار ست و نیست

ایک اور خط میں لکھتا ہے" حالا یک کس برائے دیوانی بنگالہ کہ بہ حلیۂ راستی وکاردانی آراستہ باشد می خواہم یافتہ نمی شود۔ از نایابی آدم کار آہ آہ۔" اور یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بڑے بڑے مخلص دوست کی طرف سے مطمئن اور فارغ البال نہیں ہوتا تھا۔ میر جملہ نے اورنگ زیب عالمگیر کی لائق قدر خدمات انجام دی تھیں لیکن اس کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کی وجہ سے عالمگیر کو کبھی اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوا چنانچہ شجاع کے بعد بنگال کی گورنری کے زمانہ میں میر جملہ کی وفات ہوئی تو عالمگیر نے بیٹے سے باپ کی تعزیت کرتے ہوئے کہا "تم اپنے شفیق باپ کا ماتم کر رہے ہو لیکن میں اپنے ایک دوست کو رو رہا ہوں جو طاقت ور بھی تھا اور خطرناک بھی۔"

آخرا کانوے سال کی عمر میں پچاس سال اور تقریباً تین ماہ حکومت کرنے کے بعد ۱۷۰۷ء
میں انتقال ہوا۔ اورنگ آباد (دکن) سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر مغلیہ سلطنت کے اس عظیم وجلیل
بادشاہ کی قبر ہر عامی وعالم کے لیے سرمایۂ عبرت ونصیحت ہے۔ دَوْحٌ دَرٌ رَیْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِیْمٍ
کے اعداد سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

عالمگیر کی وفات کے وقت ہندوستان کی حالت

کس قدر عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر جیسا ہمہ صفت موصوف بادشاہ تقریباً اکاون سال بکمال دبدبہ وحشمت
ہندوستان کے تخت پر متمکن رہ کر حکومت کرتا ہے لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو یہ
صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کی عمارت کو گھن لگ چکا ہے اور اب وہ زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکتی
چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے وقت ہندوستان کا حال یہ تھا کہ ملک میں انارکی اور
طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ مرہٹوں کی مرکزی طاقت کو اگرچہ توڑ دیا گیا تھا لیکن بقول محمد اکرام
صاحب کے "اب ہر مرہٹہ کاشت کار سپاہی تھا جو کبھی شیواجی کے کسی خورد سال جانشین کی زیر
قیادت اور کبھی کسی من چلی رانی کی متابعت میں مغلوں کے لیے عذاب جان بنا ہوا ہے" ہندو
مذہب کے احیا کا ایک عام چرچا ہے اور اس تحریک نے پنجاب میں راجپوتانہ اور جنوبی ہندستان
میں خاص طور پر بہت زور پکڑ لیا ہے ان سب شورشوں کے علاوہ انگریزوں اور فرانسیسیوں
کی دو اور طاقتیں تھیں جو ہندوستان کے مستقبل کا ایک دیرپا خاکہ تیار کر رہی تھیں۔ اورنگزیب
کے طویل عہد حکومت میں انگریز آہستہ آہستہ اپنی تجارت پھیلاتے رہے تھے یہاں تک کہ اس
کی وفات کے وقت تک انہوں نے ساحل ہند کی بہت سی فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا تھا، مدراس،
بمبئی اور کلکتہ میں قلعوں کی تعمیر کرائی جا چکی تھی اور ان کی وجہ سے یہ شہر بہت خوش حال ہوگئے تھے
اور ان پریزیڈنسیوں میں شہری حکومت بھی انگریزوں کی ہی قائم تھی چنانچہ یہ ٹیکس وصول کرتے
اور مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت شروع میں محض تاجرانہ تھی۔
لیکن اس کے دل میں جو روگ چھپا ہوا تھا وہ اب ظاہر ہو چلا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے اہم

ساحلی شہروں میں قلعے بنانا اور اپنی گورنمنٹ قائم کرنا یہ سب اس بدنیتی کا پردہ چاک کر رہے تھے دوسری جانب ۱۶۰۴ء سے فرانسیسی ہندوستان میں تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کی مسلسل کوششیں کر رہے تھے جن میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکے تھے آخر کار ۱۶۶۴ء میں ایک فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں ان کو کامیابی ہوئی اس کے دو سال بعد فرانسیسیوں نے بیجاپور کی اسٹیٹ سے اپنے لیے ایک وسیع قطعۂ زمین حاصل کر لیا جس پر انہوں نے پونڈیچری کا شہر آباد کیا۔

غرض یہ ہے اس وقت ہندوستان کی حالت یہ تھی۔ سات سمندر پار کی رہنے والی قومیں اس ملک پر آہستہ آہستہ اپنے قدم جماتی آ رہی تھیں اور دوسری جانب مسلمان اندرونی بدنظمیوں اور شدید اختلال و انتشار کی وجہ سے اس قابل نہ رہے تھے کہ اپنے آپ کو سنبھال سکیں وہ سب اقتدار کے بھوکے اور غرض کے بندے تھے۔

بہادر شاہ | عالمگیر نے نازک صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی مملکت اپنے تین بیٹوں میں اس امید پر بانٹ دی تھی کہ اب غالباً اس کے بعد ان میں کوئی نزاع نہیں ہوگا لیکن اس کی یہ امید نقش بر آب ثابت ہوئی۔ شہزادہ اعظم اور معظم دونوں دکن میں تھے کہ باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ دونوں بھائی تخت پر قبضہ کرنے کے لیے فوراً روانہ ہو گئے۔ ادھر جنوب میں سب سے چھوٹے بھائی کام بخش نے فوج اس خیال سے مرتب و منظم کر لی کہ بڑے بھائیوں میں سے جو کوئی تخت پر قبضہ کرلے گا وہ (کام بخش) اس کے خلاف جنگ کرے گا۔ خیر! اعظم اور معظم دونوں میں شدید جنگ ہوئی۔ اعظم مارا گیا اور اب معظم (۱۷۰۷ء میں) بہادر شاہ کے خطاب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ بہادر شاہ طبیعت کا نرم اور سچ مچ امن پسند بادشاہ تھا لیکن ابھی یہ تخت پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے برادر خورد کام بخش نے دکن میں اپنی خود مختار سلطنت کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کا مشہور سپہ سالار ذوالفقار خاں شاہی حکم کا انتظار کیے بغیر ہی دکن کی طرف روانہ ہوا اور کام بخش کو قید کر لیا۔ بہادر شاہ نے اپنی امن پسند طبیعت کی وجہ سے مرہٹوں اور راجپوتوں سے تو صلح کر لی تھی

لیکن مشرقی پنجاب میں سکھوں نے اپنے لیڈر بندہ کی زیر قیادت بڑا طوفان بدتمیزی مچا رکھا تھا۔ مسلمان عورتوں کی عصمت دری، مسجدوں میں آگ لگانا، مذہبی لوگوں کو زندہ آگ میں ڈال دینا ان میں سے کوئی ظلم وستم ایسا نہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں پر نہ کیا ہو۔ بہادر شاہ کو ان واقعات کا علم ہوا تو ۱۷۱۱ء میں خود ایک فوجِ گراں لے کر روانہ ہوا اور ایک شدید جنگ کے بعد ان کو پہاڑوں کی طرف بھگا دیا۔ سکھوں کے مقابلہ میں یہ شاندار کامیابی بہادر شاہ کی زندگی کا آخری کارنامہ تھا۔ کیونکہ اس کی عمر ۷۰ سال کی ہو چکی تھی ۱۷۱۲ء میں بمقام لاہور وفات پائی۔

بہادر شاہ کے دورِ حکومت میں (جو اگرچہ بہت مختصر ہے، بعض اہم واقعات رونما ہوئے) ۱۷۰۸ء میں بہادر شاہ نے سیواجی کے پوتے ساہو کو اس کی حکومت واپس کر دی اور اس مقصد کے لیے بمقام ستارہ اس کی تاج پوشی بھی کر دی گئی۔ لیکن اس کے چچا اور چچازاد بھائیوں نے مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب مرہٹوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ساہو کاروبارِ سلطنت کے لائق نہیں تمام مرہٹوں کی طاقت کمزور ہو گئی۔ خوش قسمتی سے ۱۷۱۳ء میں بالاجی بشوا ناتھ پیشوا یا وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر سرفراز ہوا یہ ذات کا برہمن مگر نہایت قابل ولائق اور ہوشیار وبیدار مغز تھا اس نے مرہٹوں کی بکھری ہوئی طاقت کا شیرازہ پھر جمع کیا۔ ساہو برائے نام بادشاہ تھا ورنہ اصلی اختیار واقتدار اسی کا تھا۔ بالاجی کو اپنی خدمات کا بڑا صلہ یہ ملا کہ پیشوا کا منصب یا وزارت عظمیٰ کو اس کے خاندان کے لیے موروثی قرار دے دیا گیا اور بادشاہ اس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ غرض یہ ہے کہ بہادر شاہ کے انتقال کے وقت جب کہ سلطنت مغلیہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی۔ مرہٹوں کی طاقت ابھر رہی اور منظم ہو رہی تھی،

ان حالات میں بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ بادشاہ ہوا لیکن یہ امور سلطنت کو انجام دینے کا اہل نہ تھا۔ ذوالفقار خاں حکومت کے سیاہ سپید کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ یہ اگرچہ فوجی اور سپاہی کی حیثیت سے ایک کامیاب جنرل تھا لیکن انتظام کی صلاحیت نہ تھی اس بنا پر اس کے عہد میں ملک میں رشوت ستانی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کی گرم بازاری ہو گئی۔ آخر

ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ سید حسین علی گورنر بہار اور سید عبداللہ گورنر الہ آباد ان دونوں سید بھائیوں نے آپس میں ساز باز کر کے بہادر شاہ کے پوتے فرخ سیر کو مدعی سلطنت کی حیثیت سے جہاندار شاہ کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا اور پھر دونوں بھائی فوج لے کر روانہ ہوئے ۱۷۱۳ء میں آگرہ کے قریب جنگ ہوئی جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں دونوں قید کر کے قتل کر دیے گئے اور فرخ سیر فوراً بادشاہ ہو گیا۔

فرخ سیر نے ۵ سال بادشاہت کی لیکن در اصل وہ صرف نام کا بادشاہ تھا۔ اصل طاقت سیدوں کے ہاتھ میں تھی۔ سید حسین علی کو دکن کا گورنر مقرر کر دیا گیا لیکن اس کے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد ہی مرہٹوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ حسین علی کو مجبوراً ذلیلانہ معاہدہ کرنا پڑا جس میں دکن کی مغل گورنمنٹ کو ساہو کا باج گذار قرار دیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ مرہٹوں کے سامنے مغل بادشاہت کی ایک ایسی ذلت تھا جس کی نظیر سلطنت کی پہلی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس زمانہ میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ ۱۷۱۶ء میں کلکتہ کے انگریزوں نے گورنر بنگال کے خلاف اس شکایت کا اظہار کرنے کے لیے کہ وہ محصول اور ٹیکسوں کی رقم مانگنے میں بڑی زیادتی کرتا ہے ایک وفد فرخ سیر کے پاس بھیجا۔ اسی وفد میں ہملٹن نامی ایک سول سرجن بھی تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ بادشاہ اس زمانہ میں بیمار تھا۔ دربار کے طبیب اور حکیم علاج کر چکے تھے۔ مگر اب تک افاقہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب بادشاہ نے ہملٹن سے علاج کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ ہملٹن کے علاج سے جلد ہی صحت یاب ہو گیا۔ اب بادشاہ نے خوش ہو کر پوچھا "میں کیا انعام دوں؟" ہملٹن نے شخصی مفاد پر قومی مفاد کو مقدم رکھتے ہوئے کہا "میرا انعام صرف یہ ہے کہ آپ بنگال کے انگریزوں کو خاص خاص چنگی کے محصولوں اور ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دے دیجیے اور کلکتہ میں انگریزوں کی آبادی کے پڑوس میں جو بعض گاؤں ہیں" ان کو بخش دیجیے۔ فرخ سیر نے اس درخواست کو قبول کر لیا اور ۱۷۱۷ء میں اس مضمون کا ایک پروانۂ شاہی بھی لکھ دیا گیا۔ یہ واقعہ بظاہر معمولی سا ہے لیکن تاریخ ہند میں اس کو ایک خاص اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اسی واقعہ کے باعث انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے

اور آخر کار ایک روز اس ملک پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔

تقریباً اس زمانہ میں (۱۷۱۹ء) سید حسین علی گورنر دکن نے ایک معاہدہ کے بعد دس ہزار مرہٹوں کے ایک لشکر کو لے کر دہلی پر حملہ کر دیا مرہٹہ فوج کی کمان بالاجی ہی کر رہا تھا۔ راستہ میں چن قلیچ خاں جو ایک بڑا سیاسی اور مشہور جنرل تھا وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا۔ غریب بادشاہ ان دو لشکروں کا کیا مقابلہ کرتا۔ تھوڑی ہی مقاومت کے بعد شکست ہو گئی اور فرخ سیر گرفتار کر کے سپردِ تیغ کر دیا گیا یہ پہلا موقع تھا جب کہ مرہٹوں کو براہِ راست دہلی کے معاملات میں دخل دینے کا اور اپنی آنکھوں سے سلطنت کی شکستہ حالی اور ابتری دیکھنے کا موقع ملا۔ فرخ سیر کو قتل کر دینے کے بعد سیدوں نے اپنی مرضی کا ایک بادشاہ چن لیا تین ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ایک اور شخص کو بادشاہ بنا دیا۔ مگر سال کے اندر ہی اندر وہ بھی مر گیا[1]۔ آخر کار ۱۷۱۹ء میں سیدوں نے بہادر شاہ کے ایک اور پوتے روشن اختر کو محمد شاہ کے نام سے تخت پر بٹھایا۔

محمد شاہ لیکن اب سیدوں کا کوکب اقبال گردش میں آ گیا تھا۔ چن قلیچ خاں اور اس کے رفیقِ کار سعادت خاں کی سرپرستی میں ان کے خلاف ایک پارٹی ابھری جس کو در پردہ خود بادشاہ کی حمایت حاصل تھی اور اس نے سید حسین علی کو قتل کر کے اور اس کے بھائی عبداللہ کو آگرہ کے قریب شکستِ فاش دے کر سادات کا اثر بالکل فنا کر دیا۔ اب بادشاہ نے اس طرف سے مطمئن ہو کر چن قلیچ خاں کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کر دیا اور اب وہ آصف جاہ اور نظام الملک کے لقب سے زیادہ معروف ہو گیا۔ سعادت خاں کو اس کی خدمات کے عوض میں صوبۂ اودھ کا گورنر بنا دیا گیا تھا مگر اس نے بادشاہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اب صوبہ آزاد ریاست بن گیا۔ ایک سو تیس برس تک یہ ریاست قائم رہی۔ اس واقعہ کے دو سال بعد آصف جاہ نے وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ سے استعفا دے کر دکن میں ایک خود مختار آزاد سلطنت قائم کی جس کا پایۂ تخت حیدر آباد تھا

[1] فرخ سیر کے بعد سے محمد شاہ تک ایک سال کے ہی اندر جو دو بادشاہ ہوئے ان کے نام (۱) شمس الدین رفیع الدرجات اور (۲) رفیع الدولہ ہیں۔

یہ ریاست آج تک قائم ہے اور اس ریاست کا ہر والی نظام کہلاتا ہے۔ سنہ ۱۷۲۰ء میں بالاجی کا انتقال ہوگیا اب اس کا بیٹا باجی راؤ باپ کا جانشین ہوا۔ اس کی وجہ سے مرہٹوں کی سیاسی طاقت پہلے سے دوچند بلکہ چار چند ہوگئی اور انہوں نے سنہ ۱۷۳۶ء میں دہلی پر حملہ کر دیا اس وقت دلی سلطنت کی بے بسی اور مرہٹوں کی چیرہ دستی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے۔ "مرہٹوں نے دلی پر یکایک حملہ کرکے باطمینان تمام اس کو لوٹا۔ دولت جمع کی اور جب رات قریب ہوئی توخواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے پاس چلے گئے صبح بدھ کے دن جو عرفہ کا دن تھا پھر دہلی پر آپڑے اور آبادی اور مینا بازار کی دکانوں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا ہو رمال و اسباب سب لوٹ لیا۔ پھر یہاں سے پلٹنے کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کی مشہور بستیوں قصبہ ریواڑی اور شودی گئے اور ان کو خوب جی بھر کر لوٹا اور برباد کیا۔

نادر شاہ کا حملہ اسی زمانہ میں نادر شاہ نے فارس کے تخت پر قابض ہو کر افغانستان بھی فتح کر لیا۔ اس نے محمد شاہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمان بادشاہ کے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہا ہے اور اس نے مرہٹوں کو چوتھ (ایک قسم کا ٹیکس) دے کر اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کر دیا ہے۔ اس بہانہ سے نادر شاہ درۂ خیبر سے نکل کر پنجاب کو پامال کرتا ہوا دلی پر آموجود ہوا نادر شاہ کہتا تھا کہ اگر مجھے بہت سا روپیہ مل جائے گا تو شہر نہ اُجاڑوں گا مگر رات کے وقت دہلی والوں نے چند ایک فوجی سپاہیوں کو قتل کر ڈالا۔ نادر شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے غصہ مین تمام شہر کو لوٹ لینے اور جو سامنے آئے اس کو قتل کر دینے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ صبح سے شام تک کشت و خون اور آتش زدگی کا بازار گرم رہا۔ آخر جب محمد شاہ نے آکر نادر شاہ کے قدموں پر اپنی ٹوپی ڈالدی اور درخواست کی کہ قتل عام موقوف کیا جائے تو نادر شاہ نے قتل عام رکوا دیا دوسرے دن نادر شاہ نے دلی کی اس کل دولت کو سمیٹا جو بابر کے زمانہ سے شاہان مغلیہ جمع کرتے آئے تھے۔ چنانچہ شاہجہانی تخت طاؤس، شاہی تاج، بیگمات کے مرصع زیور، عمدہ ترین ہاتھی، گھوڑے، توپیں، بیش قیمت اطلس و کمخواب۔ بڑھیا سے بڑھیا ململیں۔ شاہی خزانے اور دہلی اور اودھ کے شرفا کا اندوختہ

مال ومنال یہ سب چیزیں اپنے ساتھ لے گیا۔ ع

کر دیا سفاک نے میدان صاف

یہ واقعہ ۱۷۳۹ء کا ہے اس وقت سلطنت اپنے زوال کے انتہا کو پہونچ گئی تھی۔ دکن۔ مالوہ، گجرات کل راجپوتانہ اور پنجاب دہلی کی مرکزیت کو ماننے سے صاف انکار کر چکے تھے۔ روہیلکھنڈ کے علاقہ پر روہیلوں نے قبضہ جما لیا تھا، سکھ، راجپوت اور جاٹ یہ قومیں دہلی پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرم و تیز تر تھیں۔ اور ادھر جنوب کی جانب سے مرہٹوں کا سیلاب تھا کہ رہ رہ کر امنڈ تا آتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد بنگال، بہار، اڑیسہ اور پنجاب کے بعض باقی علاقے بھی دہلی کی مرکزیت اور اس کی خود مختار شہنشاہیت کے جوئے سے آزاد ہوگئے۔ بقول شخصے اس وقت "حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم" بالکل صحیح طور پر صادق آتا تھا۔ انہی حالات میں احمد شاہ ابدالی نے جو پنجاب پر اپنا اقتدار قائم کر چکا تھا ستمبر ۱۷۵۶ء میں دہلی پر اس زور کا حملہ کیا کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے بعد اس نے متھرا کا رخ کیا اور وہاں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اس کے بعد وہ ایک وبا پھیل جانے کے باعث فوراً واپس چلا گیا۔

جنگ پانی پت | ایک طرف مسلمانوں کی مرکزیت اس درجہ تباہ ہو چکی تھی کہ ہر گورنر اپنے صوبہ کا بادشاہ بن بیٹھا تھا اور دوسری جانب مرہٹوں کو اپنی طاقت کے روز بروز زیادہ ہونے سے اس کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج یا ہندو شہنشاہیت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائینگے اور وہ اپنی زبانوں سے علانیہ اپنے ان ارادوں کا اظہار کرتے بھی تھے۔ مسلمانوں کے کانوں تک یہ خبریں پہنچیں تو انہیں اب کچھ ہوش آیا اور آخر روہیلہ سردار اور نواب اودھ اور افغان ان تینوں نے مرہٹوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کے لیے ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا اور ۱۷۶۱ء کے شروع مہینے میں مسلمان اور مرہٹے دونوں نے پانی پت کے مشہور تاریخی میدان میں قسمت آزمائی کی، مرہٹے اس وقت سوار اور پیادہ سب ملا کر دو لاکھ ستر ہزار سے زیادہ کی تعداد میں تھے۔ حالانکہ مسلمان سب مل جل کر بھی نوے ہزار سے کم تھے۔ اب جنگ ہوئی تو شروع میں مرہٹوں نے اس زور کا

حملہ کیا کہ مسلمانوں کا سنبھلنا مشکل نظر آنے لگا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کی فوج نے ذرا سنبھل کر خود اس زور کا حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کا تمام شیرازہ منتشر ہوگیا۔ ان کے بعض نامی گرامی سردار مثلاً وسواس راؤ مارے گئے اور جو بچ رہے تھے وہ جان بچا کر بھاگ نکلے۔ اب مرہٹہ فوج کیا کر سکتی تھی بھاگ نکلی ان میں سے جو لوگ افغان فوج کے قبضہ میں آگئے انہیں بری طرح قتل کر دیا گیا۔ اس طرح جنگ پانی پت نے ہمیشہ کے لیے مرہٹوں کا حوصلہ توڑ دیا۔ اور ہندو راج قائم کرنے کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ احمد شاہ ابدالی کو مورخین ایک عام غارت گر کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنگ پانی پت میں اس کا مرہٹوں کی اجتماعی طاقت اور مسلمانوں کے خلاف ان کی مختلف حکومتوں کی آپس میں دھڑے بندی کو ختم کر دینا اس کا ایک عظیم الشان اسلامی کارنامہ ہے۔ ابدالی کی اس جنگ کو کسی ذاتی غرض و مقصد پر محمول کرنا مشکل ہے کیونکہ اول تو وہ نجیب الدولہ، شجاع الدولہ، دوندے خاں اور رحمت خاں کے بلانے پر یہاں مرہٹوں سے جنگ کرنے آیا تھا اور پھر اگرچہ جنگ میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان فتح کا سہرا ابدالی کے ہی سر ہے لیکن اس نے فتحیابی کے بعد ہی سلطنت کو شاہ عالم کے نام وزارت شجاع الدولہ کے نام اور امیر الامرائی نجیب الدولہ کے نام مقرر کر کے قندھار کا رخ کیا اور ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ احمد شاہ ابدالی کا یہ عمل اس کی دلیل ہے کہ اس کی نیت بری نہیں تھی ورنہ وہ اگر اس وقت چاہتا تو دہلی کے تخت پر قابض ہو کر پھر افاغنہ کی حکومت قائم کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کے لیے یہ موقع تھا کہ اب اگر وہ چاہتے تو اپنے آپ کو سنبھال سکتے تھے۔ لیکن قدرت کا منشا کچھ اور ہی تھا۔ ادھر آپس کی لڑائیوں اور اندرونی فتنوں میں لگی ہوئی تھی کہ ہندوستان کے شمال مشرق اور جنوب مشرق کے ساحلی کناروں سے انگریز بڑھنے شروع ہوئے۔

سراج الدولہ | اس کی مجمل روئداد یہ ہے کہ ۱۷۵۶ء میں جب علی وردی خاں نواب بنگال کا انتقال مرشد آباد میں ہوگیا تو اس کی وصیت کے مطابق مرحوم کا پوتا سراج الدولہ ۲۵ سال کی عمر میں اس کا جانشین ہوا۔ سراج الدولہ کو انگریز مورخین تو بہت برا کہتے ہیں لیکن جیسا کہ واقعاتِ مابعد نے ثابت

کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سراج الدولہ نہایت بیدار مغز اور ہوشیار نواب تھا اس نے یہ محسوس کر لیا کہ انگریز تجارت کے لیے ہندستان میں آئے تھے لیکن اب وہ آہستہ آہستہ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرتے جا رہے ہیں اور اگر صورتِ حال یہ ہی رہی تو ایک وقت آسکتا ہے جب کہ انگریز پورے ملک پر ہی قابض ہو جائیں اس بنا پر اس نے انگریزوں کی مطلق العنانی کو روکنا چاہا۔ انگریز اسے کب برداشت کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ہوئی شروع میں انگریز بری طرح پامال و پسپا ہوئے لیکن اب انتقام لینے کے لیے انگریزوں کی طرف سے باقاعدہ تیاریاں ہوئیں لارڈ کلایو کے ماتحت ایک فوج ساز و سامان کے ساتھ ہندستان روانہ کی گئی۔ کلایو کے ساتھ شاہی بحری دستہ بھی تھا جس کی کمان امیر البحر واٹسن کر رہا تھا یہ فوج دسمبر میں کلکتہ پہونچی اور یہاں اترتے ہی اپنی تمام نوآبادیات واپس لے لیں۔ سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ یہ جنگ اس درجہ لرزہ خیز تھی کہ جو قیامت کا نمونہ سراج الدولہ کی فوج میں قائم ہو گیا تھا اسے دیکھ کر لوگوں کے دل قابو سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ آخر کار صلح ہو گئی لیکن انگریز کب چین سے بیٹھنے والے تھے انہوں نے سراج الدولہ کے خلاف بعض نامور امرائے دربار جن میں میر جعفر قائد افواج خاص طور پر قابل ذکر ہے ان کو نواب کے خلاف سازش کرنے پر اکسا دیا اور امی چند نامی ایک شخص کی وساطت سے انگریزوں اور ان غدار امیروں میں معاملات طے ہونے لگے۔ امی چند نے کسی بات پر ناراض ہو کر سازش کا پورا ماجرا نواب سے بیان کر دیا اب نواب کو مجبور ہو کر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔ پلاسی کے میدان میں دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو لارڈ کلایو کی کمان میں انگریزی فوجوں نے حملہ کرنے میں پہل کی۔ سراج الدولہ کی طرف سے جو فرانسیسی دستے شریک جنگ تھے انہوں نے اس حملہ کا جواب اس زور سے دیا کہ آدھے گھنٹہ کے اندر اندر میدانِ جنگ کا نقشہ بدل گیا لیکن بدقسمتی سے اس وقت بڑے زور کی بارش ہوئی جس سے تمام گولہ بارود سیل گیا نواب نے یہ خیال کر کے کہ انگریزی فوج کا حال بھی یہی ہوگا اپنی فوج کو حکم دیا کہ انگریزی فوجوں میں گھس جائے۔ ان لوگوں نے کچھ میگزین بارش کے اثر سے محفوظ کر رکھا تھا اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ جب نواب کی فوج انگریزی

فوجوں کی زد میں آئی تو انہوں نے اولوں کی طرح گولہ باری شروع کر دی۔ سیر المتاخرین کے الفاظ "تفنگ چوں تگرگ" ہیں۔ اس بے پناہ گولہ باری سے نواب کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ اسی حالت میں میر جعفر نے دوستوں کے لباس میں آکر نواب کو بھاگ جانے اور جان سلامت لیجانے کا مشورہ دیا۔ نواب کو اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر بھی نہیں آتا تھا۔ آخر ہوا یہ کہ نواب کی فوج بھی بھاگ نکلی اور اس فتح نے بنگال کا اور اس کے واسطہ سے گویا پورے ہندستان کی قسمت کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں کر دیا۔ اب انگریزوں نے میر جعفر کو اس کی نمک حرامی کا انعام یہ دیا کہ سراج الدولہ کی جگہ اس کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب بنا دیا۔ اس کے بعد میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ عبرت کے لیے یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جب سراج الدولہ کے پاس میر جعفر کا فرستادہ محمدی بیگ اس کو قتل کرنے کے لیے پہونچا ہے تو نواب نے کہا

آیا راضی نہ شوند کہ در گوشہ افتادہ زندگی کنم " یعنی کیا میر جعفر اس پر رضامند نہیں ہے کہ میں ایک گوشہ میں پڑا ہوا زندگی بسر کر دوں" لیکن اس نابکار نے نفی میں سر ہلایا اور فوڑا ہی نواب پر چند وار کیے جن کی تاب نہ لاکر نواب زمین پر گر پڑا اور اب صرف یہ ایک آواز اس کے منہ سے سنائی دی کہ

بس ست کہ کار من تمام شد و انتقام	بس کرو اب میرا کام تمام ہو گیا اور
بانجام رسید	انتقام اپنے انجام کو پہونچ گیا۔

لیکن بدبخت میر جعفر کی انتقام کی پیاس پھر بھی نہیں بجھی اور اس نے مقتول نواب کی لاش کو ایک ہاتھی کے ہودج پر سوار کرا کر تمام شہر مرشد آباد میں گشت کرایا۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

دیوانی | کچھ دنوں کے بعد لارڈ کلایو نے بمقام الہ آباد تینوں صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام وزیر شجاع الدولہ اور بادشاہ شاہ عالم سے چاہی دونوں نے اس کو مجبوڑا قبول کر لیا اور کلایو کی خواہش کے ہی مطابق اسناد کے فرمان لکھے گئے۔ سخت افسوس اور

حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے بڑے صوبوں کی کل مال گذاری چوبیس لاکھ مقرر ہوئی اور چالیس ہزار سالانہ ناظم بنگال کے اخراجات کے لیے طے پائے۔

محمد شاہ کے بعد دولت مغلیہ کے خاتمے تک احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) عالمگیر ثانی (۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) اکبر ثانی (۱۸۰۶ء تا ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ ثانی ظفر (۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۷ء) پانچ بادشاہ ہوئے۔ مگر یہ صرف برائے نام بادشاہ ورنہ دراصل ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار و پنشن خوار تھے۔ تمام معاملات و امور حکومت کمپنی کے مقرر کیے ہوئے نمائندوں کی وساطت اور ان کے مشورہ سے طے پاتے تھے۔ شاہ عالم کی نسبت تو مشہور تھا ہی کہ "حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم" مگر اور شاہانِ دہلی تو دراصل لال قلعہ سے باہر کی کسی اور چیز پر کوئی اقتدار و اختیار نہیں رکھتے تھے بہادر شاہ ظفر اور کمپنی کے ڈائرکٹروں میں جو خط و کتابت ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے بادشاہ قلعہ کی مرمت تک کے لیے کمپنی کا دست نگر اور محتاج تھا اور اس کو یہ بھی اختیار نہیں تھا کہ قلعہ کے ملازم مرد اور عورتوں کے ساتھ جو معاملہ چاہے کر سکے۔

یہ صورتِ حال برابر ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں اور ہندستانیوں میں جو بہادر شاہ ظفر کے حامی تھے ایک جنگ ہوئی جس کو انگریز مورخین غدر (MATiNG.) کے نام سے موسوم کرتے ہیں مگر دراصل اس کو انگریزوں کے سیاسی اقتدار سے آزاد ہونے کی ایک آخری کوشش کہنا چاہیے۔ مختلف وجوہ و اسباب سے یہ کوشش ناکام رہی۔ بہادر شاہ ظفر کا خاندان بادِ صرصر کے سامنے اوراقِ گل کی طرح پریشان اور خانماں برباد ہوگیا اور شہزادے جو ہاتھ آگئے انہیں قتل کر دیا گیا۔ خود بہادر شاہ پر مقدمہ چلا اور رنگون میں نظر بند کیا گیا اور اب انگریز باقاعدہ طور پر ہندستان کے حاکم اور فرماں روا ہو گئے۔

دولتِ مغلیہ کے زوال و اختتام کی یہ عبرت انگیز داستان سن کر قدرتی طور پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں (۱) ایک یہ کہ اورنگ زیب عالمگیر المتوفی ۱۷۰۷ء کے بعد سے سلطنت پر جو

زوال آنا شروع ہوا تو کیا وہ یوں ہی بڑھتا اور ترقی کرتا رہا اور ڈیڑھ سو سال (۱۸۵۷ء تک اس
زیادہ کی مدت میں مسلمانوں نے کبھی اپنی حالت کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔ (۲) دوسرا سوال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سلطنت پر سیاسی زوال اس تیزی سے طاری تھا اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی
اور اخلاقی حالت بھی حد درجہ ابتر اور ناگفتہ بہ ہوگئی تھی تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ حکومت و سلطنت
سے بالکل محروم ہو جانے کے بعد بھی ہندستان سے اسلام رخصت نہیں ہوا۔ ذیل میں ہم انہیں
دو سوالوں کا مختصر جواب دیں گے اور اسی پر یہ باب ختم ہو جائے گا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور آپ کا خاندان

جواب یہ ہے کہ قدرت کو چونکہ سرزمینِ ہند میں اسلام اور مسلمانوں
کی بقا منظور تھی اس لیے جس طرح دورِ اکبری میں حضرت مجدد
الفِ ثانی پیدا ہو گئے اور انہوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو تھام لیا اسی طرح اورنگزیب
عالمگیر کی وفات سے چار سال پہلے یعنی ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء کو حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ رونق
افزائے عالم ہوئے اور آپ نے بھی وہی کام کیا جو حضرت مجدد صاحب نے اپنے عہد میں کیا تھا۔
حضرت شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحبؒ بڑے پایہ کے عالم، صوفی اور بزرگ تھے۔ انہوں
نے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب پندرہ سال کی عمر میں ہی تمام
مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل و تدریس سے فارغ ہو گئے اور اسی سال آپ نے والد ماجد کے
ہاتھ پر بیعت کی۔ دو سال بعد والد ماجد کا انتقال ہو گیا تو شاہ صاحب نے ۱۷ برس کی عمر میں مسند
ارشاد و ہدایت خود سنبھالی اور کم و بیش بارہ برس تک والد مرحوم کے مدرسہ میں علوم دینیہ و عقلیہ
کا درس دیتے رہے اس کے بعد عرب تشریف لے گئے۔ دو مرتبہ حج سے مشرف ہوئے۔ اور ساتھ
ہی یہاں کے دورانِ قیام میں شیخ ابوطاہر بن ابراہیم مدنی ایسے جلیل المرتبت محدث سے حدیث
کی سند لی۔ جس زمانہ میں آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے ہندستان میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا۔
چنانچہ آپ کے بعض بہی خواہوں نے لکھا کہ آپ عرب میں ہی قیام پذیر ہو جائیں اور ہندستان لوٹنے
کا ارادہ نہ کریں۔ لیکن آپ نے غالباً ہندستان میں آکر امت کی اصلاح و تجدید کا کام کرنے کا

عزم کسی ہاتفِ غیبی کے ایما پر کر لیا تھا کہ آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور ۱۱۴۵ھ کے شروع میں روانہ ہو کر ۱۴ر رجب المرجب ۱۱۴۵ھ کو ٹھیک جمعہ کے دن دہلی پہونچ گئے۔

دہلی واپس آکر آپ نے اب درس وتدریس پر توجہ کم کی۔ صرف ایک حدیث کا درس دیدیا کرتے تھے اس کے علاوہ اپنا باقی وقت تصنیف وتالیف اور وعظ وارشاد میں بسر کرتے تھے حضرت شاہ صاحب کے قلب ودماغ پر حکومت وسلطنت کے زوال اور مسلمانوں کی عام دینی واخلاقی او معاشی ومعاشرتی زبوں حالی کا کیا اثر تھا اس کا اندازہ حضرت شاہ صاحب کی مشہور کتاب التفہیمات الالٰہیہ سے ہو سکتا ہے جس میں آپ نے برملا اور علی الاعلان امراء واعیان مملکت سے لے کر علماء ومشائخ، فقہاء زہاد، تاجر، کاریگر تک ہر اک طبقہ کی انتہائی شرمناک کمزوریاں گنائی ہیں اور اس سلسلہ میں بالکل صاف صاف فرمایا ہے "کہ میں آیا ہی ہوں ہر نظام رائج کو توڑ پھوڑ دینے کے لیے" اس سے اور شاہ صاحب کی دوسری عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے حرمین شریفین سے واپس ہونے کے بعد غیر معمولی انہماک کے ساتھ تصنیف وتالیف کا پروگرام امتِ مرحومہ کی موجودہ حالت کے پیشِ نظر خاص تجدید واصلاح کی غرض سے شروع کیا تھا۔

اس سلسلہ میں آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے آپ نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا اس سے غالبًا آپ کا مقصد یہ تھا کہ عوام خود بخود قرآن مجید کے معانی ومطالب سے آشنا ہو کر اپنے لیے نورِ باطن کا سامان کر سکیں اور علماء کے محتاج نہ رہیں۔ زمانہ ساز علماء کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ تو عصر کی نماز کے وقت ایک مشتعل مجمع نے حضرت شاہ صاحب کو مسجد فتحپوری دہلی میں گھیر لیا اور قتل کرنا چاہا۔ لیکن اصلاح امت کی نیت سے آپ جس کام کو اہم سمجھتے تھے ان شدید مخالفتوں کی بالکل پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ نے اس کو بہرحال انجام تک پہنچایا

لہ حضرت شاہ صاحب نے قیام مکہ معظمہ کے زمانہ میں ایک خواب بھی دیکھا تھا جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خود خوشخبری سنائی تھی کہ "تمہارے متعلق ارادہ ہو چکا ہے کہ امتِ مرحومہ کے جتھوں میں سے کسی جتھے کی تنظیم تمہارے ذریعہ کی جائے۔

حضرت شاہ صاحب کی یہ سعی اللہ کے نزدیک اتنی مقبول ہوئی کہ پھر اور زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے اور آج دنیا کی کوئی قابلِ ذکر زبان ایسی نہیں ہے کہ جس میں قرآن مجید کا ایک آدھ ترجمہ موجود نہ ہو۔ اس کا عظیم الشان فائدہ یہ ہوا کہ گھر گھر قرآن مجید کے معانی و مطالب کا چرچا ہو گیا عام مرد، عورت، بوڑھے اور جوان تک ان سے آشنا ہو گئے اور انہیں اس کا یقینِ کامل ہو گیا کہ قرآن صرف بے سوچے سمجھے پڑھ لینے اور پھر ایک خوبصورت جزدان میں لپیٹ کر رکھ دینے اور اس طرح اس کے ذریعہ برکت و ثواب حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ قرآن اس لیے ہے کہ اسے سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا جائے اور پھر اس کو زندگی کا حقیقی رہنما بنا کر اس کے احکام و مسائل پر عمل بھی کیا جائے۔

ترجمۂ قرآن کے علاوہ حدیث، اصولِ حدیث و تفسیر، علم الکلام، رموز و اسرار، تصوف، مکاشفات و الہامات، ان میں سے کوئی موضوع اور علم و فن ایسا نہیں ہے جس پر آپ نے بے حد مفید، پر از معلومات اور محققانہ کتاب نہ لکھی ہو لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبولیت حجۃ اللہ البالغہ کو ہوئی اور یہ کتاب اس کی مستحق بھی تھی، اس کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کیوں کر ایک عالمگیر مذہب، ہر قوم اور ہر ملک کے لیے ہے اور وہ کس طرح انسان کے تمام امور معاش و معاد کی فلاح و بہبود اور اس کی نجات و کامرانی کا ضامن ہے اس موضوع پر حضرت شاہ صاحب نے جس انداز اور جس وسعت نظر و تدقیق کے ساتھ کلام کیا ہے وہ صرف آپ کا حصہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا میں ایک اہم اسلامی انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے تو حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات اور آپ کے ہی ارشادات کی بنیاد پر کام کرنے سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۱۷۶ھ مطابق ۱۷۶۲ء میں بمقام دہلی آپ کی وفات ہوئی دہلی میں سنٹرل جیل کی پشت پر مہندیوں کا خطہ بہت مشہور ہے۔ یہ خطہ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے خاندان والا شان کا مرقد ہونے کی وجہ سے جنت البقیع کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ وفات

"او بود امام اعظم دین" ہے رحمۃ اللہ رحمۃ کثیرۃ و انزل علیہ برکات خطیرۃ

حضرت شاہ صاحب کا خاندان

حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادوں نے جن میں سے ہر ایک آسمان علم و عمل کا آفتاب و ماہتاب تھا باپ کی جانشینی کا حق ادا کر دیا آپ کے

بڑے فرزند ارجمند کا نام شاہ عبد العزیز تھا ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں وفات پائی سترہ برس کی عمر میں تمام علوم ظاہر و باطن سے فارغ ہو کر درس دینا شروع کیا اور ساٹھ سال تک یہ مشغلہ برابر جاری رہا۔ آپ کا حدیث کا فیض ہندستان کے گوشہ گوشہ میں پہونچا آپ صفات و کمالات گوناگوں کے جامع ہونے کی حیثیت سے تذکرۂ علماء ہند کے مصنف کے بقول اللہ کی ایک نشانی (آیۃ من آیات اللہ) تھے۔

شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے چھوٹے شاہ رفیع الدین صاحب تھے جو ۱۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کے علم و فضل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ عبد العزیز صاحب کبیر سن اور ضعف و نقاہت کے باعث تعلیم و تدریس کے لائق نہ رہے تو آپ نے اپنے یہ سب کام چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب کو ہی سپرد کر دیے۔ تصنیفات میں آپ کا قرآن مجید کا اردو ترجمہ زیادہ مشہور ہے۔

تیسرے صاحب زادے کا نام شاہ عبد القادر تھا ۱۱۶۷ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ آپ بھی علوم دینیہ میں بڑا کمال رکھتے تھے مگر گوشہ نشینی مرغوب تھی اس لیے ساری عمر اکبر آبادی مسجد کے حجرہ میں بسر کر دی اور تصنیف و تالیف کی طرف بھی کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ البتہ قرآن مجید کا ایک با محاورہ اردو ترجمہ موضح القرآن کے نام سے آپ کی عظیم الشان یادگار ہے۔

چوتھے صاحبزادہ کا نام شاہ عبد الغنی ہے یہ بھی بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ لیکن آپ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے پدر بزرگوار تھے جو باعتبار علم و فضل، تقویٰ و طہارت ان عظیم المرتبت بزرگوں میں سے تھے جو صدیوں میں کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ یہ صرف شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان تقدس نشان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ سلطنت کے شدید ترین زوال اور پھر اس کے اختتام کے باوجود ہندستان سے اسلام فنا نہیں ہوا۔ اندلس سے مسلمانوں کی حکومت گئی تو ساتھ ان کا مذہب بھی رخصت ہو گیا۔ بہت کچھ مارے گئے

اور جو بچ رہے تھے انہوں نے طوعاً و کرہاً عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ لیکن یہاں ہندستان کا حال یہ ہے کہ انگریزوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ چاہا کہ وہ ہندستان کو اپنا ہم مذہب بنالے اور اس مقصد کے لیے بصرف زرکثیر مذہبی کتابوں کی اشاعت کی۔ مشنری لوگوں کے ذریعہ بڑے زور شور سے عیسائیت کی تبلیغ کرائی۔ مذہبی مباحثوں اور مناظروں کا بازار ایک مدت تک یہاں بہت گرم رہا لیکن با ایں ہمہ یہاں کے مسلمان اپنے دین پر قائم رہے اور اندلس کی طرح ان میں ارتداد کا فتنہ عام نہیں ہوا حق یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کی اولاد و احفاد کی ہی ہمہ گیر کوششوں کا نتیجہ ہے۔

حضرت سید احمد صاحب شہید مسلمانوں کے اس دورِ انحطاط میں حضرت شاہ صاحب کا صرف یہ ہی کارنامہ نہ تھا کہ آپ نے وعظ و ارشاد تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے ذریعہ عقائد و اعمال کی اصلاح کی بلکہ آپ نے تلوار کے ذریعہ ہندستان میں خلافتِ راشدہ کے طرز کی حکومت قائم کرنے کے لیے بھی جد و جہد کی۔ اگرچہ اس جد و جہد میں آپ بلا واسطہ شریک نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد میں حضرت سید احمد صاحب شہید کی تحریک اور آپ کا جہاد اور میدان بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کرنے کے بعد بھی پوربی بنگال اور سرحد میں اس تحریک کے نام کو برقرار رکھنے کے لیے مجاہدین کی ایک جماعت کا باقی رہنا اور اسلامی سطوت و سیادت کے احیاء کے لیے کام کرتے رہنا یہ سب اس فضا کا نتیجہ تھا جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے پیدا کر دی تھی۔ پھر یہ معلوم ہے کہ حضرت سید احمد صاحب شہید، حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر رحمہما اللہ ان دونوں بزرگوں کے تربیت یافتہ تھے اور خاص طور پر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے ساتھ اکبرآبادی مسجد میں ہر وقت رہا ہی کرتے تھے۔ علاوہ بریں تمام معاملاتِ جہاد و غزا میں حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ راست مولانا محمد اسمٰعیل شہید تھے جن کی نسبت ابھی گذر چکا ہے کہ شاہ عبدالغنی صاحب کے لائق صد ہزار فخر فرزند اور اس رشتہ سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے پوتے تھے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت شاہ شہید نے اپنے چچا حضرت شاہ

عبدالعزیز صاحب سے خاص طور پر استفادہ کیا تھا اور چچا نے بھی بھتیجہ کی ہونہاری اور صلاحیت وقابلیت کو دیکھ کر کندن بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا. پس اس تمام سلسلہ کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق یہ صاف نظر آتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دراصل اسلامی انقلاب کی ایک عظیم الشان تحریک کے بانی و موسس تھے اور اگرچہ حالات کے نامساعدت کے باعث اس ملک میں اسلامی حکومت قائم نہ ہوسکی تاہم اس کا یہ اثر ضرور ہے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اس ملک میں زندہ ہیں ان کی مذہبی حالت بھی نسبت دوسرے ممالک اسلامیہ کے بہتر ہے۔ دینی اور مذہبی علوم وفنون کا یہاں چرچا ہے۔ شہر شہر بلکہ موضع بموضع اسلامی مدارس قائم ہیں. وعظ وارشاد کی محفلوں میں مسلمان بڑے شوق سے سنتے ہیں اور جہاں تک عام اخوت اسلامی کے احساس کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندستان کے مسلمان اس معاملہ میں ممالک اسلامیہ کے برادران اسلام سے کہیں آگے سبقت لے گئے ہیں۔

تبصرہ

حال اور ماضی کا موازنہ

گذشتہ اوراق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے انحطاط وتنزل کی داستان خلافتِ راشدہ کے اختتام کے بعد سے ہی شروع ہو جاتی ہے لیکن یہ سمجھنا ایک شدید غلطی ہو گی کہ ہمارے آج اور کل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ہمارا کل آج سے کہیں زیادہ بہتر تھا اور ہمارا عہدِ ماضی خواہ متعدد اسباب ووجوہ کے ماتحت کیسا ہی تنزل پذیر ہو، بہرحال ہمارے حال سے بدرجہا امید آفریں اور حوصلہ افزا تھا اس کے متعدد اسباب ہیں جنہیں ذیل میں مختصراً بیان کر دینا ضروری ہے تاکہ ہم کو اپنی موجودہ پستی کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکے۔

گذشتہ ایامِ زوال میں سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اندرونی اور بیرونی طور پر خواہ حالت کیسی ہی خراب وخستہ ہو مسلمانوں کی اپنی حکومت وسلطنت تھی۔ اس بنا پر اول تو جو فاسق وفاجر بادشاہ ہوتے تھے وہ بھی حُرمات وشعائر اللہ کی توہین کی جرأت نہیں کر سکتے تھے اور چونکہ علماء حق کا گروہ ہر دور میں موجود رہا ہے اس لیے وہ موقع ومحل کے مناسب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کو ادا کرنے سے غافل نہیں رہتے تھے اور اس طرح کسی نہ کسی حد تک صورتِ حالات کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ خلیفہ ذاتی طور پر کیسا ہی مستبد ہوتا علماءِ حق کے سامنے اسے بھی جھکنا پڑتا تھا۔ یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ بعض خاص خاص مواقع پر علماء کے

اس اثر نے حکومتوں میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔

علماء حق کی مساعیِ اصلاح

اس نوع کے واقعات تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں ان میں سے چند واقعات کا ذکر بہ طور نمونہ بے محل نہ ہوگا۔ مشہور اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو ولی عہد بنادے۔ لیکن اس زمانہ کے مشہور تابعی امام حضرت رجاء بن حیوہ کے مشورہ کے مطابق اس نے اپنی اس رائے سے رجوع کر کے حضرت عمر بن عبد العزیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور اپنی زندگی میں ہی ان کے لیے بیعت لے لی جس سے پھر ایک مرتبہ خلافتِ راشدہ کا منظر لوگوں کو نظر آگیا۔

حجاج کے نام اور اس کی سفاکی و بے رحمی سے کون واقف نہیں ایک مرتبہ اس کے سامنے امام حسینؓ کا ذکر آیا تو بولا "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریات میں داخل نہیں تھے"۔ اس مجلس میں اتفاق سے مشہور تابعی عالم یحییٰ بن یعمرؒ موجود تھے انہوں نے فرمایا "تو جھوٹ بولتا ہے" حجاج نے کہا "اس کو یا تو قرآن سے ثابت کرو ورنہ گردن اڑادوں گا"۔ اب حضرت یحییٰ بن یعمر نے آیت وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ الآیہ پڑھی اور فرمایا کہ "جب اس آیت کے بموجب حضرت عیسیٰؑ ماں کے رشتہ سے حضرت آدمؑ کی ذریت میں داخل ہیں تو امام حسینؓ ماں کے توسط سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں کیوں داخل نہیں؟"۔ حجاج بلا کا شعلہ مزاج تھا مگر اس وقت یحییٰ بن یعمر کی حق گوئی کا اس پر ایسا اثر ہوا کہ بولا "سچ کہتے ہو میں اس آیت کو پڑھتا تھا مگر کبھی ذہن ادھر منتقل نہیں ہوا۔ بخدا یہ استنباط تو بہت ہی عجیب و غریب ہے۔

ان ہی کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ حجاج نے ان سے دریافت کیا "میں لحن یعنی اعراب میں غلطی تو نہیں کرتا؟" یحییٰ بن یعمر نے اس کا نہایت بلیغ جواب دیا۔ فرمایا "ترفع ما یخفض وتخفض ما یرفع" حجاج کے سوال کے مطابق اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ تھا کہ تم

کسرہ کی جگہ رفع اور رفع کی جگہ کسرہ پڑھ دیتے ہو۔ مگر اس کا دوسرا مطلب یہ بھی نکلتا تھا کہ تو بڑا بے انصاف اور ظالم ہے جو پستی کے مستحق کو بلندی دیتا ہے اور سربلندی کے مستحق کو ذلیل و خوار کرتا ہے" ابن خلکان کا بیان ہے کہ حجاج اس حق گوئی پر اس درجہ مسرور ہوا کہ یحیٰ بن یعمر کو خراسان کا قاضی مقرر کر دیا۔

امام اوزاعی شام کے امام تھے۔ ایک مرتبہ خلیفۂ عباسی سفاح کے چچا عبداللہ بن علی نے ان سے دریافت کیا" ہم نے بنو امیہ کی جو خونریزی کی ہے اس کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" امام اوزاعی نے پہلے تو ٹالنا چاہا مگر جب زیادہ اصرار ہوا تو انہوں نے صاف صاف فرمایا "بخدا! ان لوگوں کا خون تم پر حرام تھا" عبداللہ بن علی انتہا درجہ تندمزاج اور درشت خو تھا۔ اس جواب کو سُن کر غصہ کے مارے لال پیلا ہو گیا، بولا تم نے ایسا کیوں کر کہا"؟ امام عالی مقام نے جواب دیا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ حق بنیاد ہے "کسی مسلمان کا خون اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت نہ پیش آئے۔ یا تو شادی شدہ ہو کر زنا کرے، یا قاتل ہو اور یا مرتد ہو جائے" اب عبداللہ بن علی نے پوچھا "کیا ہماری حکومت دینی نہیں ہے؟" امام اوزاعی نے سوال کیا "یہ کیوں کر؟" عبداللہ نے کہا "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے لیے وصیت نہیں کی تھی؟" امام نے فرمایا "اگر وصیت کی ہوتی تو حضرت علیؓ کسی کو اپنی طرف سے حکم نہ بناتے" اس گفتگو کے بعد امام ہمام کو توقع کیا بلکہ یقین تھا کہ ان کی گردن اڑا دی جائے گی۔ لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ عبداللہ بن علی نے اگرچہ اس وقت بگڑ کر امام اوزاعی کو دربار سے نکلوا دیا مگر بعد میں ان کے پاس دنانیر کی ایک تھیلی بطور نذرانہ ارسال کی جس کو امام نے اسی وقت مستحقین میں تقسیم کر دیا۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید اور شہزادے امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں گئے اور خلیفہ نے کہا کہ حدیث کی قرات میں کروں گا، آپ سنیے مگر شرط یہ ہے کہ عام سامعین کو

اپنے حلقہ سے باہر کر دیجیے امام مالکؒ نے فرمایا" اگر خواص کی خاطر عوام کو محروم کر دیا جائیگا تو پھر خواص کو بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا" یہ جواب دے کر اپنے شاگرد کو حکم دیا کہ حدیث کی قرأت شروع کریں انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔

واقعات بے شمار ہیں، تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں جا بجا ان کا ذکر ہے کہاں تک انہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہی علماء حق تھے جو موقع بموقع امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کر کے خلفاء وقت کو ان کی بے اعتدالیوں اور غلطیوں پر متنبہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح استبدادی نظامِ حکومت کے مفاسد کو زیادہ وسیع ہونے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ عباسی خلیفہ ہادی نے وفات سے پہلے چاہا کہ اپنے بیٹے کو اپنا قائم مقام بنا کر اپنے بھائی ہارون رشید کو خلافت سے محروم کر دے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک مجلس طلب کی جس میں ہرثمہ ابن اعین بھی تشریف رکھتے تھے جب اصل معاملہ پیش ہوا تو سب حاضرین خلیفہ کا رجحانِ طبع دیکھ کر خاموش تھے۔ مگر ہرثمہ بن اعین نے کہا" اے خلیفہ تیرا یہ اقدام صحیح نہیں ہے کیونکہ تیرے باپ نے تجھے اور ہارون رشید دونوں ہی کو ولی عہد بنایا تھا۔ پھر اب اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو جو اس وقت اپنے بیٹے کے لیے بیعت لے رہا ہے وہ زیادہ قوی ثابت ہوگی بہ نسبت اس بیعت کے جو تیرے باپ نے ہارون کے لیے لی تھی۔ جو شخص پہلی بیعت کو توڑ سکتا ہے وہ دوسری بیعت کو بھی توڑ سکتا ہے"۔ حالانکہ معاملہ بیٹے کا تھا لیکن خلیفہ ہادی ہرثمہ کی حق گوئی سے بددل نہیں ہوا اور اس نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا" تم سب کا برا ہو تم نے مجھ کو دھوکہ میں رکھا۔ صرف میرے آقا (ہرثمہ) ہیں جنہوں نے میری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا" اب خیال فرمایئے ہرثمہ نے اس وقت غیر معمولی جرأت سے کام لے کر امت کو کتنے بڑے فتنہ سے بچا لیا۔

مامون رشید اور قاضی یحییٰ بن اکثم کے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ مامون نے فرمان لکھوایا کہ "حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ پر لعنت بھیجی جائے" لیکن قاضی صاحب کی بر وقت مداخلت سے مامون کو یہ فرمان واپس لینا پڑا۔ اسی طرح ایک دفعہ مامون پر شیعیت کا غلبہ ہوا تو اس نے نکاحِ متعہ کے جواز کا حکم دیدیا۔ قاضی صاحب کو اس کی خبر ہوئی۔ دوڑے ہوئے آئے اور مامون کو سمجھایا کہ قرآنی نص کے مطابق نکاحِ متعہ اور زنا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مامون نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور فوراً متعہ کی حرمت کا اعلان کرا دیا۔

صرف بنو امیہ اور بنو عباس کے درباروں کی ہی یہ خصوصیت نہیں ہے بلکہ جس جس ملک میں جب تک مسلمانوں کی حکومت رہی کم و بیش ایسے علماءِ حق کا وجود برابر رہا ہے جو حکومت کی بے اعتدالیوں کی پردہ دری کر کے امرِ حق کا اعلان کرتے رہتے تھے اور ملک کو فتنوں سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مصر کا مشہور فرماں روا رکن الدین بیبرس بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا۔ ایک مرتبہ اس نے جہاد کے لیے مسلمانوں سے مقررہ رقم کے علاوہ کچھ مزید رقم جمع کرنی چاہی۔ صحیح مسلم کے مشہور شارح علامہ نووی نے اس کی مخالفت کی اور سلطان سے کہا "مجھ کو معلوم ہے تو امیر بندقدار کا زرخرید غلام تھا اور ایک حبہ کا بھی مالک نہیں تھا۔ اب اللہ نے تجھ کو سلطنت دیدی ہے اور تو نے ہزاروں غلام خرید ڈالے ہیں جن کے تمام سامان طلائی ہیں۔ نیز تیرے محل میں سو کنیزیں ہیں جو زر و جواہر سے لدی ہوئی ہیں جب تک مجھ کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ سب قیمتی چیزیں تو نے جہاد کے اخراجات کے لیے اپنے غلاموں اور باندیوں سے لے لی ہیں اس وقت تک میں غریب مسلمانوں کے مال لے لینے کا فتویٰ تیرے حق میں نہیں لکھ سکتا۔" بیبرس علامہ کی اس حق گوئی سے ناراض ہو گیا اور ان کو شہر بدر کر دیا۔ بعد میں اس کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا تو اس نے یہ حکم منسوخ کر کے علامہ کو پھر دمشق میں آنے اور رہنے کی اجازت دیدی۔ مگر اقلیم علم کے سلطان۔ بے دیہیم و کلاہ کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ فرمایا "جب تک بیبرس موجود ہے میں نہیں آؤں گا" اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی بیبرس کی وفات

ہو گئی۔

عباسی خلیفہ مصر مستکفی باللہ کے عہد میں ذمی رعایا نے ایک درخواست دی کہ ذمی ہونے کی حیثیت سے ہم پر جو بندشیں لگی ہوئی ہیں وہ اٹھالی جائیں اور اس کے عوض ہم سات لاکھ دینار سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ وزیر اور خلیفہ دونوں کا رجحان تھا کہ اس درخواست کو قبول کریں۔ لیکن علامہ ابن تیمیہ نے اس میں مداخلت کر کے فرمایا "شریعت اسلام کے احکام کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں ہو سکتے" خلیفہ کو مجبوراً امام کے فتوے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا اور اس نے ذمیوں کی درخواست مسترد کر دی۔

سلطنت آل عثمان کے مشہور فرمانروا سلیم اول نے ایک مرتبہ اپنی سلطنت کے مفتی اعظم شیخ جمالی سے دریافت کیا "ملکوں کا فتح کرنا بہتر ہے یا قوموں کا مسلمان بنانا" شیخ نے کہا "قوموں کا مسلمان بنانا" سلطان نے یہ سن کر اعلان کرا دیا کہ میری مملکت میں جو شخص مسلمان نہیں ہوگا قتل کر دیا جائے گا۔" اب مفتی اعظم کو اس اعلان کی خبر ہوئی تو فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچے اور بتایا کہ آپ کا یہ حکم قرآن کے خلاف ہے، غیر مسلموں سے جزیہ لیکر ان کو مذہب کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔ مفتی اعظم شیخ جمالی کی اس تصریح کے بعد سلطان نے اپنا حکم واپس لے لیا اور مسلمان ایک عظیم گناہ سے بچ گئے۔

علامہ عزالدین بن عبدالسلام ساتویں صدی ہجری کے نامور علماء میں سے ہیں، ان کو جب تحقیق سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ممالیک بحریہ سلطان مصر کے زرخرید غلام ہیں اور آزاد کردہ نہیں ہیں تو انہوں نے اعلان عام کرا دیا کہ ان غلاموں کے تمام تصرفات خود مختارانہ ناجائز ہیں۔ آپ نے ان غلاموں کو حکم دیا کہ میں تم کو فروخت کروں گا۔ علامہ کے احباب نے بہت کہا کہ آپ کا یہ اقدام خطرہ سے خالی نہیں ہے مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار مصر کا نائب السلطنت جو غلام تھا چند مددگاروں کی جماعت کو ہمراہ لے کر علامہ کو قتل کرنے کے ارادہ سے روانہ ہوا، مکان پر پہنچ کر آواز دی، علامہ باہر آئے تو ان کی صورت دیکھتے ہی نائب سلطنت کانپ اٹھا اور رو کر بولا۔ مولانا آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا "میں تم لوگوں کو فروخت کروں گا کیونکہ تم بیت المال کی ملکیت ہو"۔ چنانچہ ایسا ہی کیا۔

سلطان سنجر امام غزالیؒ کے اشاروں پر چلتا تھا، شہاب الدین غوری امام فخر الدین رازیؒ کا بڑا معتقد تھا۔ حاجی الدبیر نے تاریخ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ میں ایک تفصیلی واقعہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ

امام رازی نے غوری کے بعض عقائدِ غیر صحیحہ کی اصلاح کی تھی۔ پھر صرف یہی نہیں کہ علمارِ حق کبھی کبھار خلفار کو ان کے اعمال و افعال پر ٹوکتے رہتے ہوں بلکہ انہوں نے مستقلاً کتابیں اور رسائل لکھے تاکہ خلفار اور سلاطین ان پر عمل پیرا ہوں جیسا کہ قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کے لیے کتاب الخراج لکھی۔ اسی طرح کا ایک دستور سیاسی ابن المقفع نے لکھا تھا۔ امام ابو عبید القاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ کی مشہور ضخیم کتاب "کتاب الاموال" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ اس کے پہلے باب میں ہی امام نے بادشاہ اور رعایا کے باہمی حقوق سے بحث کی ہے۔ امام مالکؒ کا بھی ایک رسالہ بشکل مکتوب مشہور و معروف ہے جو انہوں نے خلیفہ ہارون رشید کے نام لکھا تھا اور جس میں انہوں نے خلیفہ کو متعدد نصیحتیں کی ہیں۔

خلفار اور وزرار و امرار کی اصلاح کے علاوہ خارجی اثرات کے ماتحت ملک میں جو عقیدہ و عمل کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں علمارِ حق ان کا بھی مردانہ وار مقابلہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب بغداد میں فسق و فجور عام ہونے لگا تو خالد الدرویش نے اس کی روک تھام کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اسی طرح کی ایک جماعت سہل بن سلامۃ الانصاری نے بنار کھی تھی دونوں کا مقصد یہ تھا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ان تمام عناصر فاسدہ کا استیصال کیا جائے جو مسلمانوں میں بدعملی کے پیدا ہونے کا سبب ہو رہے ہیں۔ پھر حنابلہ نے فرقِ باطلہ کا مقابلہ جس اولو العزمی اور ہمت و عالی حوصلگی سے کیا ہے اربابِ خبر و نظر پر پوشیدہ نہیں۔ اس راہ میں ان علمار کو قید و بند کے مصائب سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ جیسا کہ امام مالک، امام احمد بن حنبل اور امام ابو حنیفہ وغیرہ ائمۂ کبار کے ساتھ ہوا۔ لیکن پھر بھی ان کی صدائے حق پست نہیں ہوتی تھی اور نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چونکہ حکومت بہرحال اسلامی تھی اس لیے جلد یا بدیر اس آواز کا اثر ہوتا تھا اور مفاسد کی اصلاح کسی نہ کسی شکل میں ہوجاتی تھی۔ مامون رشید طبعاً وسیع المشرب اور ضرورت سے زیادہ روادار تھا مگر زنادقہ کے وجود کو وہ بھی برداشت نہیں کرسکا اور مہدی نے اس گمراہ فرقہ کے ساتھ جبر و تشدد کا جو معاملہ کیا تھا وہی مامون نے بھی اس کے ساتھ کیا۔

صوفیائے کرام کا اصلاحِ امت میں حصہ

علمارِ ربانیین کے دوش بدوش صوفیارِ کرام کا بھی ایک گروہ تھا جو سلطنت و حکومت کے ہنگاموں سے الگ غیر مسلموں کو مسلمان اور مسلمانوں کو پختہ تر مسلمان بنانے میں نہایت خاموشی کے ساتھ مصروف تھا۔ یہ حضرات ایک طرف روحانی ریاضتوں اور باطنی اعمال و افعال کے ذریعہ مسلمانوں

کا تزکیۂ نفس کرتے تھے اور دوسری جانب ملک ملک کی خاک چھان کر اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچاتے تھے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندستان، افریقہ، چین اور جزائر شرق الہند جاوا، سماٹرا، ملایا، بورنیو، نیوگنی، سلیپیز اور فلپائن ان سب مقامات پر اسلام کی اشاعت بڑی حد تک صوفیاء کرام کی کوششوں کی ہی رہین منت ہے جو محض تبلیغ اسلام کے لیے تن تنہا یا اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت لے کر یہاں آئے تھے اور مختلف طریقوں سے لوگوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بناتے تھے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے راجپوتانہ میں۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی اور اس کے اطراف و اکناف میں۔ شیخ علی ہجویری نے پنجاب میں اسلام کا جو چراغ روشن کیا تھا اسی کا صدقہ ہے کہ اس تبکدۂ ہند میں آج مسلمانوں کی تعداد نو کروڑ سے زیادہ ہے۔ شمالی افریقہ میں جو اذان کی تکبیریں سنائی دیتی ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے قائم کرنے میں حضرت شیخ عبداللہ بن یس، محمد بن علی السنوسی اور جماعت فاطمیین کی کوششوں کو دخل نہیں ہے۔ سماٹرا، ملایا، اور جاوا میں جو توحید کی گونج ہے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ شیخ عبداللہ عارف، سید برہان الدین، شیخ عبداللہ الیمنی، مولانا ملک ابراہیم اور شیخ نورالدین ایسے نفوس قدسیہ کی مساعی حسنہ کا اثر جمیل ہے۔

حکومتِ اسلامی کی عام برکات

بہرحال یہ حقیقت نظر انداز نہ ہونی چاہیے کہ یہ سب کچھ برکات اس بات کی تھیں کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت و سلطنت تھی وہ خود صاحب اقتدار و اختیار تھے یہ حکومت بُری بھلی خواہ کیسی ہی ہو لیکن بہرحال تھی تو اپنی ہی۔ بادشاہ ذاتی طور پر کیسا ہی فاسق و فاجر ہو پھر بھی وہ مسلمان ہوتا تھا اور غیر مسلم قوموں کے مقابلہ میں اس کی حمیت دینی و غیرت مذہبی کی رگ میں جوش پیدا ہو ہی جاتا تھا۔ تلوار جب اپنے ہاتھ میں تھی تو اس سے جہاں بعض اوقات خود اپنوں کے گلے کٹتے تھے دشمن کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام بھی اسی سے نکلتا تھا۔

مسلمان بادشاہوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان میں جو بادشاہ متقی اور پرہیز گار ہوتے تھے مثلاً منصور، نورالدین، صلاح الدین، غیاث الدین، شمس الدین التمش اور اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ وہ تو خیر اسلامی شعائر و حدود کا احترام کرتے ہی تھے۔ ان کے علاوہ جو سلاطین عشرت پسند اور لذت کوش ہوتے تھے (باستثناء معدودے چند) وہ بھی اسلامی احکام کا احترام ملحوظ رکھنے میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ہارون جواری سے

جھرمٹ میں بیٹھ کر دادِ عیش وطرب دیتا تھا مگر ساتھ ہی ہر شب میں سورۂ یٰسین پڑھتا تھا جہانگیر خود دخترِ رز کی کاکلِ پیچاں کا اسیر تھا مگر مملکت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اس نابکار کو منہ لگا سکے۔ عدالتوں کے فیصلے قرآن و حدیث کی روشنی میں ہوتے تھے۔ مسجدیں آباد تھیں، جگہ جگہ اسلامی مدارس و مکاتب تھے جن میں اسلامی طریقہ پر بچوں کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ علماء اور مشائخ اطمینان سے دین کی خدمت کا کام کرتے تھے۔ سوسائٹی میں منہیات و محرمات کا چرچا عام نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمان آزادی کی . . . . . فضا میں سانس لیتے تھے کسی غیر کے غلام نہیں تھے۔ یہاں تک کہ انہیں شاید اس کا تصور بھی نہیں تھا کہ مسلمان غیر مسلم حکومت کا محکوم ہو کر رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ہر قسم کے معاملات کے ابواب ملتے ہیں لیکن اس کے متعلق کوئی مستقل باب نہیں ملتا کہ کروڑوں مسلمان بدقسمتی سے اگر کسی غیر قوم کے محکوم ہو جائیں تو کس طرح زندگی بسر کریں۔ علاوہ ازیں اس پر بھی غور کیجیے کہ قرامطہ اور باطنیہ ایسے عظیم فتنے اسلام میں پیدا ہوئے ان کا استیصال کس نے کیا؟ اس میں شبہ نہیں کہ علماء کرام نے تحریر اور تقریر سے ان کا مقابلہ کیا لیکن اگر اسلامی حکومتیں ان کی پشت پناہ نہ ہوتیں تو کیا یہ فتنے مٹ سکتے تھے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے جو ملکی فتوحات حاصل کیں ان سے ان کی نیت خواہ کچھ ہی ہو بہرحال اُن فتوحات کے چند نتائج لازمی طور پر ظاہر ہوئے۔ ایک یہ کہ مذہبِ اسلام کی موثر طریقہ پر اشاعت ہوئی۔ عربی زبان کو فروغ ہوا اور اسلامی تہذیب و معاشرت عالمگیر ہو گئی یہ سب کچھ اس بنا پر تھا کہ مسلمانوں کی اپنی حکومت تھی۔

خاتمہ | مسلمانوں کے عروج و زوال کی یہ جو مختصر داستان آپ نے سنی ہے اس سے یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جب تک مسلمان اسلام کے قوانین فطری پر عمل پیرا رہے، وہ برابر ترقی کرتے رہے۔ لیکن جب اُن میں اسلامی روح مضمحل ہونے لگی تو ان میں تنزل بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا، اس کی رفتار دفعی نہیں بلکہ تدریجی تھی۔ ہر گناہ کی ایک خاصیت ہوتی ہے جو جلد یا بدیر اس پر مرتب ہوتی ہے۔ ایک حکومت کا عظیم ترین گناہ یہ ہے کہ اس کے بادشاہ میں استبداد ہو رعایا کی پروا نہ کرتا ہو، ملک کی آمدنی کو اپنے عیش و آرام پر خرچ کرنا اپنا حق سمجھتا ہو اور اپنی ذاتی منفعت کو ملک کے عام مفاد پر بہرحال ترجیح دیتا ہو۔ جب کسی حکومت سے یہ گناہ سرزد ہوتا ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم تو اس کو اس گناہ میں جتنا جتنا انہماک بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ اپنی موت سے قریب تر آتی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ

ذاتی تعیش و آرام کی حد تک اگر فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے مگر ساتھ ہی وہ نظام مملکت سے غافل نہیں ہے اور رعایا کے معاملات میں عدل و انصاف کا سررشتہ اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، قدرت ایسے بادشاہ سے درگذر کر سکتی ہے اور تاریخ میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ لیکن ظالم و جابر اور خود غرض و مطلب پرست حکومت کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری تاریخ ہمارے اچھے اور برے اعمال کی آئینہ دار ہے مجھ کو اعتراف ہے کہ گذشتہ اوراق میں میں نے مسلمان حکومتوں پر تنقید کرنے میں احتیاط کے باوجود کسی قدر زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے لیکن اس کا مقصد دوسروں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع دینا نہیں ہے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ خدائے ارحم الراحمین تو ظالم ہے نہیں، اس بنا پر آج ہمارے اوپر جو ادبار مسلط ہے وہ یقیناً ہمارے گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی اُن تمام بدعملیوں کا جائزہ لیں جو ہم نے تاریخ کے عہد ماضی میں کی ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی مسلمان حکومت کا گناہ تنہا اس حکومت کا نہیں بلکہ پوری قوم کا گناہ ہے۔ اور اپنی ان بدعملیوں کا جائزہ لینے کے بعد بارگاہ ایزدی میں صدق دل سے توبہ کر کے آئندہ کے لیے عہد صمیم کریں کہ ہم پھر ان گناہوں کا ارتکاب کرنے نہیں جائیں گے۔ اس عہد و پیمان کے ساتھ اپنے تنزل کی ویرانیوں کو عروج و اقبال کی آبادیوں میں تبدیل کر دینے کے لیے سرفروشانہ طور پر اٹھیں۔

راہ عمل ہمارے لیے متعین ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لَنْ یَصْلُحَ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِہٖ اَوَّلُھَا۔ (اوکما قال) — اس امت کا آخر انہیں طریقوں سے اصلاح یاب ہوگا جن سے اس امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی۔